ابوطالب مومن قریش

(دوسرا ایڈیشن)

تحریر:

علامہ عبداللہ الخنیزی

ترجمہ:

علامہ سید ذیشان حیدر جوادی کراروی

ناشر

مکتبہ تعمیر ادب پیسہ اخبار لاہور

ہماری دیگر مطبوعات

قرآن مجید مترجمہ مولانا فرمان علی (ختم شد)
مفاتیح الجنان اردو
مستند تحفۃ العوام
بیعت رضوان (طبع ثانی) زیر طبع
شہداء ایمان
تبلیغی مجالس (طبع ثانی) زیر طبع
نص و اجتہاد (ضبط شدہ)
ترجمہ سر الشہادتین
توضیح المسائل (ختم شد)
احیاء المیت فی فضائل اہلبیتؑ
صحابیت کا صحیح تصور
عظمت انسان (مرثیہ)
عمدۃ المجالس
مستند نماز
مستند دعائیں
جناب سیدہؑ کی کہانی (منظوم)
جلاء العیون

بار اول ـــ اگست ۱۹۶۶ء
بار دوم ـــ دسمبر ۱۹۶۷ء
تعداد اشاعت ـــ پندرہ سو
طباعت ـــ نامی پریس۔ لاہور
قیمت قسم اول ـــ چھ روپے
" " دوم ـــ چار روپے

ترتیب

علامہ عبداللہ الخنیزی

(مؤلف)

عبداللہ : شیخ علی الحاج حسن بن مہدی بن کاظم بن علی بن عبداللہ الخنیزی تعلیف (سعودی عرب) کے قریہ القلقہ میں بماہ ربیع الاول ۱۳۵۵ھ متولد ہوئے۔ بہت کمسنی میں قرآن مجید اور عربی لکھنے پڑھنے، حساب اور دوسرے ابتدائی نصاب کی تکمیل کر لی اور اپنے والد گرامی سے تاریخ وادبی معلومات کا سب سے بڑا ذخیرہ حاصل کیا۔ ۱۳۶۱ھ میں فاضل موصوف نے قلم سنبھالا اور تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گئے۔ چنانچہ سعودی عرب، بحرین، عراق، لبنان اور مصر کے متعدد اخبارات اور رسائل میں آپ کے مضامین چھپنے لگے۔ ان مضامین میں سب سے پہلا مضمون العرفان ذیقعدہ ۱۳۶۸ھ میں چھپا بعدازاں لبنان کے العرفان، الادیب، الالواح، المحیط، المعارف۔ مصر کے الکتاب عراق کے الہاتف، الاضواء، دراسات اسلامیہ، بحرین کے صوت البحرین، سعودی عرب کے المدینۃ المنورہ، المنہل اور اخبار الظہران میں بے شمار تحقیقی و بلند پایہ مقالات شائع ہوئے جنھیں قبول خاص و عام کی سند حاصل ہوئی۔

علامہ ممدوح نے مختلف موضوعات پر خاصی کتابیں تصنیف و تالیف فرمائی ہیں جن میں "ابوطالب مومن قریش" کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ انھیں سب سے زیادہ مضمون نگاری اور انشاپردازی سے دلچسپی ہے اس کے بعد شعر سے۔ چنانچہ ایک دیوان زہرات کے نام سے مرتب ہو چکا ہے۔

تلخیص از اطلاعات مولف بشکریہ
جناب حسن الامین مؤلف اعیان الشیعہ
بیروت

(علامہ)
سید مرتضیٰ حسین
صدر الافاضل

علامہ حیدر جوادی کراروی

(مترجم)

نام السید ذیشان حیدر تخلص حیدر لقب جوادی (منسوب با امام جواد علیہ السلام) والد گرامی کا نام مولانا السید محمد جواد صاحب قبلہ (سابق پیشنماز جلالی ضلع علی گڑھ) مدرسہ امجدیہ میں دینیات، مدرسۂ ناظمیہ لکھنؤ سے درجۂ عالم، نجف اشرف سے استعداد تحقیق و تفہیم و اجتہاد، خطابت کا سلسلہ ۱۹۴۹ء سے جاری ہے تصنیف و تالیف میں برابر مصروف رہتے ہیں۔

قلمی خدمات: نظام اسلام ۵ جلدیں، فدک تاریخ کی روشنی میں، شہداء ایمان نص و اجتہاد، شیعی اجتہاد، قیاس، آج کا انسان اور اس کے اجتماعی مشکلات۔ ترجمۂ کتاب سلیم، اقتصادیات ۲ جلدیں۔ الکلام (عربی) الفقہ والاجتہاد (عربی) الامام الصادق تنقید من ویزداں۔ حی علی الصلوٰۃ، حی علی الفلاح، حی علی خیر العمل، قد قامت الصلوٰۃ، داستان ابن سبا، توحید خالق، شیعہ اور اصحاب، تحریف قرآن، عزائے مظلوم اور عقل و شرع، تحقیق اہلبیت۔ الامام الصادق و مذاہب اربعہ (زیر طبع)

ہماری استدعا پر موصوف کئی اہم کتابوں کی تالیف و تصنیف میں منہمک ہیں جو جلد از جلد منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوں گی۔

مکتبہ تعمیر ادب کو آپ کی سرپرستی پر فخر و ناز ہے۔

ہماری گزارش

خدا تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہماری زیر نظر پیشکش نے حیرت انگیز مقبولیت حاصل کی کہ چار پانچ ماہ کے قلیل عرصے میں اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا۔ الحمد للہ علیٰ احسانہ کاغذ کی نایابی و گرانی کی وجہ سے ہم اس کا دوسرا ایڈیشن خاصی مانگ کے باوجود بھی اس سے پہلے شائع نہیں کر سکے جس کا ہمیں بہر حال افسوس ہے۔

ستمبر ۱۹۶۴ء میں بسلسلہ زیارات عتبات عالیات ہمارا عراق جانا ہوا وہاں نجف اشرف میں دینی کتب کی تلاش کے دوران ہمارے رفقاء علام حجۃ الاسلام مولانا سید صادق علی شاہ صاحب تقدس مآب مولانا سید شمیم الحسن صاحب رضوی، علامہ طالب جوہری اور علامہ حیدر جوادی نے ابو طالب مومن قریش کی طرف متوجہ کرتے ہوئے انکشاف فرمایا کہ اس کتاب کی لاکھوں جلدیں مشرق وسطیٰ میں فروخت ہو چکی ہیں کیونکہ حضرت ابو طالب پر اس سے بہتر کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی نیز یہی وہ کتاب ہے جس کی تصنیف کے سلسلے میں اس کے مصنف کو پھانسی کا حکم ملا لیکن مشرق وسطیٰ سے ایک لاکھ احتجاجی تار پہنچنے پر اس سزا کو منسوخ کیا گیا۔ خوش نصیبی ملاحظہ ہو کہ اس کتاب کو عربی سے اردو میں منتقل کرنے کی ذمہ داری علامہ جوادی مدظلہ نے قبول فرمائی چنانچہ موصوف نے حیرت انگیز تعجیل سے کام لیتے ہوئے صرف پندرہ دن کی قلیل ترین مدت میں اس کتاب کا ایسا پیارا ترجمہ کر ڈالا جسے پسندیدگی کی سند حاصل ہوئی ہے جس کے لیے ہم ان کے ممنون ہیں خدا انہیں اجر جزیل عطا فرمائے!

نقش ثانی کو نقش اول سے بہتر پیش کرنے میں ہم نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا مکتبہ تعمیر ادب بفضل تعالیٰ اور تائید چہاردہ معصومین علیہم السلام سے ہمیشہ ایسا لٹریچر پیش کرنے کا اعزاز حاصل کرتا رہے گا جو صوری و معنوی ہر لحاظ سے بہتر ہو گا اللہ تعالیٰ ہمارا مددگار ہو حضرت ابو طالب کی سیرت و سوانح کے سلسلے میں یہ عظیم کتاب دنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتی آپ بھی مستفیض ہو جئے۔

——— ناشر

گفتارِ مترجم

کسی انسان کی سیرت پر ذمہ دارانہ قلم اٹھانا ایک ایسا سخت اور دشوار گزار مرحلہ ہے کہ جسکے طے کرنے میں مؤرخ کے پائے نگاہ میں لغزش پیدا ہو جاتی ہے قلم تھرانے لگتا ہے ہاتھوں میں رعشہ پڑ جاتا ہے خیالات بھٹکنے لگتے ہیں اور قوت ادراک و شعور اپنی پوری ہمت صرف کرنے کے بعد بھی ما عرفناک کی فریاد بلند کر دیتی ہے۔

کیوں؟ اس لیے کہ سیرت نگاری انسان کے تمام سوانح حیات اور اوضاع زندگانی پر ایک تفصیلی مطالعہ اور ایک دقیق نظر کی متقاضی ہے۔ اس اہم موضوع کیلئے انسان کے موروثی صفات، اس کے داخلی کیفیات، اس کے نفسیاتی رجحانات اور اس کے اجتماعی سماجی اور اقتصادی مشکلات سبھی پر نظر رکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

سیرت نگاری فقط ظاہری حلیہ کے بیان کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک مختصر فہرست ہوتی ہے جس سے کتابِ زندگانی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک چھوٹا سا آئینہ ہوتا ہے جسمیں ماضی و حال اور مستقبل بیک وقت دیکھے جاتے ہیں۔ ایک مختصر نقشہ ہوتا ہے جسمیں زندگی کا پورا عکس نظر آتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جب عام انسان کی سیرت نگاری اتنی اہم اور دشوار گزار چیز ہے تو پھر شیخ بطحا سید قریش حضرت ابوطالب کی زندگی پر قلم اٹھانا کس قدر مشکل مرحلہ ہوگا۔

مجھے داد دینا پڑتی ہے اپنے نوجوان برادر دینی جناب عبداللہ خنیزی کو جنھوں نے جوانی کے مادی تقاضوں کو پس پشت ڈال کر زندگی کا ایک اہم حصہ یعنی ایک سال کا زمانہ اس وادی کو طے کرنے میں صرف کر کے حضرت ابوطالب کے ایمان و عقیدہ، آپ کے جہاد

اور آپ کے خدمات مسلسل کا وہ ذخیرہ مہیا کر دیا ہے جسکو دیکھنے کے بعد کوئی انصاف پسند انسان بھی آپ کے ایمان وعقیدہ میں شک نہیں کر سکتا۔

یہ بات یوں تو پہلے بھی واضح تھی لیکن ایک ایسے جری القلم اور صحیح الکلمہ انسان کی ضرورت تھی جو علی ابصارھم غشاوۃ قسم کے لوگوں کی نگاہوں سے تعصب وجہالت کے پردے ہٹا کر ان کے لیے نور وصداقت کے جلووں کی نشان دہی کرتا۔ قدرت کی مشیت نے اس انسان کو موصوف کی شکل میں مجسم کیا اور اس طرح آپ کے سیال قلم اور عمیق افکار سے یہ خدمت انجام پائی۔

قانون سیرت نگاری کے تحت اگر حضرت ابوطالب کی پوری زندگی کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آپکی پوری زندگی میں کوئی لمحہ ایسا نہیں آیا جسے کفر سے سازگار یا اسلام سے کنارہ کش تصور کیا جا سکے۔ یہ ضرور ہے کہ ان لمحات کے صحیح تجزیہ کیلئے ایک ذہن رسا اور چشم بینا کی ضرورت ہے ورنہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی شے اپنے انتہائی ظہور کی بنا پر پردہ خفا میں چلی جاتی ہے۔ فلسفے کا ایک مسلم مسئلہ ہے کہ پوشیدگی اور مخفیت محض گمنامی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کا عامل بعض اوقات خود ظہور بھی ہوتا ہے۔

ہم دنیا کی جس شے کو بھی دیکھتے ہیں پہلے نور آفتاب نظر آتا ہے اس کے بعد اس کے وسیلے سے اس شے پر نظر پڑتی ہے جسے دیکھنا چاہتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم اس شے پر نظر جما لیتے ہیں اور نور آفتاب کی طرف متوجہ بھی نہیں ہوتے۔

اسی طرح ہمیں جس شے کا بھی علم ہوتا ہے اس کا وسیلہ وہ ذہنی تصویریں ہوتی ہیں کہ جو صفحۂ قلب پر منقش ہوتی ہیں لیکن اسکے باوجود ہم اپنے ہی نفس سے غافل ہو کر اس شے کی طرف توجہ مرکوز کر دیتے ہیں۔

اس سے زیادہ واضح مثال یہ ہے کہ آج کی بعض تحقیقات کی بنا پر دنیا میں رنگ کا

کوئی وجود نہیں ہے سُرخ و زرد و سیاہ و سفید یہ سب ان ہوائی تموجات کا نتیجہ ہیں جو اپنے پہلو میں نور کی شعاعیں لیے رہتے ہیں۔ مجھے اس سے بحث نہیں ہے کہ فلسفی اعتبار سے اس دعوے پر کوئی مکمل دلیل قائم ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اس لیے کہ مجھے تو صرف یہ بتانا ہے کہ فلسفہ جدید و قدیم دونوں اس ایک نقطہ پر متفق ہیں کہ اکثر چیزیں اپنے ظہور اور انکشافِ کامل کی بنا پر مخفی ہو جاتی ہیں۔

اسی بنیاد پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت ابوطالب کے ایمان کا نظروں سے پوشیدہ ہو جانا اس کے گمنام اور مخفی ہونے کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ اس کے کمال ظہور کا اثر ہے یہ اور بات ہے کہ آفتاب کی شعاعیں بھی چمگادڑ کی نظروں سے پوشیدہ ہی رہتی ہیں۔

ورنہ اس کا کیا سبب تھا کہ دنیا کو آپ کا مادی جہاد آپ کا سماجی مقابلہ اور آپ کے تربیتی خدمات تو نظر آتے لیکن ان کے پس منظر میں کام کرنے والا بنیادی عقیدہ نظر نہ آسکا۔

حضرت ابوطالب کی سیرت سے دلائلِ ایمان اور شواہدِ عقیدہ کے جمع کرنے کیلئے آپکی زندگی کو چار حصوں پر تقسیم کرنا پڑے گا، پہلے حصہ میں آپکے اضافی اوصاف پر نظر ہوگی اور دوسرے میں نفسیاتی رجحانات پر، تیسرے حصے میں آپ کے ذاتی خدمات بیان کیے جائینگے اور چوتھے میں آپ کے بارے میں عظماءِ امت کے اعتراف و ارشادات۔

اضافی اوصاف

آپ کا نسب شریف اس تسلسل کے ساتھ حضرت آدمؑ تک پہنچتا ہے:

ابوطالب بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان بن عاد بن عود بن ناحور بن یعور بن یعرب بن یشجب

بن ثابت بن اسمٰعیل بن ابراہیم بن تارخ بن ساروغ بن ارعو ابن فالغ بن عابر بن شالخ بن ارفخشد بن سام بن نوح بن لمک بن متوشلخ بن خنوخ بن بن برد بن مہلائیل بن لعوف بن انوش بن شیث بن آدمؑ۔

(مواہب الواہب)

آپ کے اسم گرامی کے بارے میں علماء میں قدرے اختلاف ہے صاحب عمدۃ المطالب احمد بن علی کا قول ہے کہ آپکا اسم شریف عبد مناف تھا، ابوبکر طرطوسی کی رائے ہے کہ اسم مبارک عمران تھا اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ خود ابوطالب ہی تھا۔

بعض علماء نے عبد مناف کو ترجیح دی ہے اس لیے کہ حضرت عبدالمطلب نے اپنی وصیت میں اسی نام سے یاد کیا ہے اور ابوطالب کو کنیت قرار دیا ہے رہ گیا عمران تو اس کے بارے میں روایت کو ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ (مواہب الواہب)

توارث صفات! "پدرم سلطان بود" اگرچہ انسان کو سلطان نہیں بنا سکتا لیکن یہ حقیقت بھی ناقابلِ انکار ہے کہ سلاطین کی اولاد کی ذہنیت عام ذہنیتوں سے مختلف ضرور ہوتی ہے۔ اب یہ اختلاف جائز حدود میں ہو یا ناجائز اس کے عوامل و حرکات اچھے ہوں یا بُرے لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انسان اپنے موروثی صفات کا ایک آئینہ ضرور ہوتا ہے

ہم اس قانونِ توارث کے تفصیلات کا تذکرہ اپنے موضوع سے خارج سمجھتے ہیں اس لیے اسے علماء نفس کے حوالے کیے دیتے ہیں، البتہ اتنا کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس قانون کا کسی حد تک تسلیم کرنا انتہائی ضروری اور وجدانی شئے ہے۔

انسان جن صفات کا حامل ہوتا ہے بچے میں ان کے آثار کا پایا جانا ایک فطری شئے ہے۔ ایک بخیل کے بچے میں بخل اور ایک کریم کے بچے میں کرم کا ہونا ضروری ہے۔ اور بات ہے کہ حالاتِ زمانہ اور اختلافِ معاشرہ کی بنا پر ان صفات کا مظاہرہ اپنی آبائی شکلوں میں نہ ہو سکے۔

بچہ ابتدائی تخلیق کے اعتبار سے ماں باپ کے اوصاف لے کر دنیا میں آتا ہے۔ پھر

معاشرہ اس پر اثر انداز ہوتا ہے، وہ اپنے داخلی کیفیات کی بنا پر سماج کا مقابلہ کرتا ہے اور نتیجہ میں یہ تصادم و تعارض ایک نتیجہ کی طرف منتہی ہوتی ہے جس کا حقیقی سرچشمہ وہی موروثی صفات ہوتے ہیں جن کو لیکر دنیا میں آیا تھا۔

اگر ایک بچہ کسی بخیل و لئیم انسان کے گھر پیدا ہو اور اسکی تربیت ایک ایسے عالم اور فیاض گھرانے میں ہو جائے جس کا شعار دولت کا لٹانا اور اموال کا تقسیم کرنا ہو تو یہ خارجی اثرات سے متاثر ہونیکے بعد اموال کی تقسیم میں بخل سے کام نہ لے گا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بخل اس کی سرشت سے نکل گیا، بلکہ ہو سکتا ہے کہ اس کا اظہار دولت علم کی تقسیم میں ظاہر ہو یا ثروت اخلاق کی فیاضی میں۔

یہی راز تھا کہ دین اسلام نے انسان کی تربیت کا انتظام اس کے شعوری دور سے نہیں کیا اس لیے کہ اس وقت وراثت اپنا اثر دکھا چکی ہے بلکہ اس کا مکمل اہتمام اس کے وجود میں آنے کے پہلے ہی سے شروع کر دیا۔ ادھر کسی انسان نے تولید نسل کا قصد کیا۔ ادھر اسلام نے اپنے احکام نافذ کر دیے۔ اچھی اور با اخلاق عورت کا انتخاب کرو، مال و جمال پر نظریں مت جماؤ۔ دودھ پلانے پر خاص توجہ دو، ناجائز و ناروا خیالات کی حامل عورت سے بچے کو محفوظ رکھو، اچھی آغوش میں تربیت کا انتظام کرو وغیرہ!

یہ سب کیا ہے؟ یہی تاکہ تربیت عالم وجود میں قدم رکھنے سے پہلے ہو تاکہ موروثی صفات اپنا غلط رنگ نہ جما سکیں۔ بنیادی اثرات نامناسب طریقے پر متاثر نہ کر سکیں ایسا نہ ہو کہ مصلح و مربی کی ساری تدبیریں صرف ان بنیادی جراثیم کی بنا پر بیکار اور بے سود ہو جائیں جو پہلے سے طینت میں اپنا گھر بنا چکے ہوں۔

توارث صفات کے اس اہم نظریے پر ایک عبوری نظر ڈالنے کے بعد ہمارا فریضہ ہے کہ ہم اس سلسلے میں حضرت ابو طالبؑ کے موقف کو واضح کر کے یہ بتائیں کہ اس نجیب الطرفین فرزند کو اپنے والدین سے کیا کیا ملا؟!

حضرت عبدالمطلب، عالمِ عربیت کا رئیس مطلق اور ابوطالب کا مربیٔ اوّل

کیا کہنا اس انسانِ کامل کا جسے تاریخ آج تک مفلسوں کی پناہ گاہ اور غریبوں کے ملجاء ماویٰ کے نام سے یاد کر رہی ہے جس نے حاجیوں کو سیراب کر کے "فیاض" اور اڑتے ہوئے پرندوں کو غذا دے کر "معطم الطیر" کا لقب لے لیا۔

ہمیں آپ کی مکمل تاریخ پیش کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ صرف ان خطوط کی نشاندہی کرنا ہے جو آپ کی زندگی میں بڑی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ یعنی آپ کا ایمان و اخلاص اور آپ کا جود و کرم۔

جود و کرم کا یہ عالم تھا کہ کبھی تڑپتے ہوئے دل اور سنولائے ہوئے چہرے دیکھے نہیں جاتے تھے۔ ادھر دھوپ کے مارے ہوئے قافلے اور میدان کی تپش سے جھلسے ہوئے چہرے سامنے آئے اور ادھر سیرابی کا انتظام شروع ہو گیا۔ کوئی مسافر پیاسا نہ رہ جائے کسی غربت زدہ کو احساسِ غربت نہ ہونے پائے، کوئی دور افتادہ اپنے کو لاوارث تصور نہ کر سکے (صرف اس لیے کہ آنے والے اللہ کے مہمان اور خانۂ خدا کے طواف کرنے والے ہیں۔

کوئی پوچھے کہ ان آنے والوں سے آپ کا کیا تعلق ہے ؟ یہ سارے انتظامات آپ کیوں کر رہے ہیں ؟ مکّہ والے اپنے شہر کی آبرو کا خیال کیوں نہیں کرتے ؟ عالمِ عربیّت کی حمیّت و غیرت کو کیا ہو گیا ہے ؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ اہتمام و انتظام یہ خاطر داری اور ضیافت ہی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اس انسان کے دل میں عشقِ الٰہی کے گہرے جذبات اور جود و کرم کے عمیق رجحانات ہیں۔ یہ نہ تو یہ چاہتا ہے کہ ریگزارِ حجاز کے تپش زدہ پیاسے رہیں اور نہ یہ برداشت کر سکتا ہے کہ خدائی مہمانی پر کوئی حرف آ سکے۔ اُسے نہ یہ گوارا ہے کہ اپنے موروثی جذبات گھٹ کر مر جائیں اور نہ یہ برداشت

ہے کہ دھوپ اور پیاس کی شدّت سے گھبرا کر لوگ طوافِ کعبہ چھوڑ دیں۔
دُنیا مجھے بتائے کہ جود و کرم اور احساس و شعور کے یہ گہرے رُجحانات ابوطالبؑ کی زندگی میں کس طرح ظاہر ہوئے۔ دُور جانے کی ضرورت نہیں تاریخ کے اوراق ہمارے سامنے ہیں۔ قلّتِ مال اور کثرتِ عیال نے پریشان کر رکھا ہے لیکن وراثتی صفات اس بات پر مجبور کر رہے ہیں کہ اللہ کے مہمان بھوکے پیاسے نہ رہ جائیں۔ لوگ گھبرا کر خانہ کعبہ کو ترک نہ کر دیں۔ اپنا گھر اجڑتا ہے تو اُجڑ جائے لیکن اللہ کا گھر آباد رہے۔ اپنے سر پر بار بڑھتا ہے تو بڑھ جائے لیکن اللہ کی مہمان داری پر حرف نہ آنے پائے۔
اللہ! کیا ان تصوّرات و جذبات کا انسان بھی کافر ہو سکتا ہے؟

ایمان و عقیدہ آپ کے ایمانِ کامل کا ثبوت آپ کا وہ مباہلہ ہے جو آپ نے ابرہہ سے اس وقت کیا جب وہ خانۂ خدا کو منہدم کرنے کے لیے اپنا عظیم الشان لشکر لے کر مکّہ آیا۔ آج دُنیا میں اسلام کے ٹھیکیدار بہت ہیں، جسے دیکھئے وہ ذمّہ دارِ شریعت جس پر نظر ڈالیے وہ وارثِ قرآن۔ لیکن انصاف سے بتائیے کہ اگر آج اسلام پر کوئی وقت پڑ جائے تو کیا کوئی ایسا مسلمان ہے جو حضرت عبدالمطلب کا جیسا مطمئن قلب اور پُر سکون نفس لیکر اُٹھ کھڑا ہو! یہاں تو مسلمانوں کا یہ عالم ہے کہ بات بات پر دشمن کو چیلنج کر دیتے ہیں اور جب بات پوری نہیں ہوتی تو مصلحتِ خدا پہ ٹال دیتے ہیں جس کے نتیجہ میں اسلام کی رسوائی اور شریعت کی بے عزتی ہوتی ہے لیکن کیا کہنا حضرت عبدالمطلب کی دُور رس نگاہوں کا کہ آپ نے ابرہہ سے اس وقت تک کوئی بات نہیں کی جب تک کہ مشیّتِ الٰہی کا اندازہ نہیں کر لیا یہی وجہ تھی کہ اُدھر زبان پر کلمات آئے اُدھر ابابیل کی فوجیں روانہ

ہوگئیں۔

یاد رکھئے مباہلہ ایک ایسا کام ہے جس کا اختیار سوائے ان اولیاء خدا کے کسی اور کو نہیں ہے جن کو اپنی طلب پر اعتمادِ کامل اور اللہ کی مشیت پر اطلاع تام حاصل ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ انسان اپنی خواہش سے کوئی بات کہہ دے اور اس کے نہ ہونے کی صورت میں اسلام بدنام ہو۔ اس لیے کہ اللہ نے ہر ایک کے دعوے کی تصدیق کی کوئی ضمانت نہیں لی ہے۔

حضرت عبدالمطلب کا یہی وہ طرز عمل تھا جس نے آپ کی وصایت کو مکمل طریقے سے واضح کر دیا۔ آپ انتہائی اطمینانِ قلب کے ساتھ ابرہہ کو چیلنج دیتے ہیں اور پھر جو کچھ فرماتے ہیں وہ چند لمحات میں نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے تاکہ دنیا دیکھ لے کہ دعا میں کتنی تاثیر ہوتی ہے اور ایمان کی لاج کس طرح رکھی جاتی ہے۔

ہمارے سابق بیان کو دیکھنے کے بعد یہ کہا جا سکتا تھا کہ اگر حضرت عبدالمطلب کی فیاضی کو یہ گوارا نہ تھا کہ خانۂ کعبہ کی مرجعیت میں کوئی فرق آسکے۔ تو پھر ابرہہ کے مقابلہ میں خانۂ کعبہ کی طرف سے دفاع کیوں نہیں کیا؟

لیکن اس کا کھلا ہوا جواب یہ ہے کہ اولاً تو مادی اعتبار سے حضرت عبدالمطلب کے پاس اتنی قوت نہ تھی کہ اس بے پناہ لشکر کا مقابلہ کرتے، دوسری بات یہ بھی ہے کہ اس مقابلہ سے بات ابرہہ اور عبدالمطلبؑ کی ہو کر رہ جاتی اور آپ کا منشا یہ تھا کہ ابرہہ کے سامنے الہٰی طاقتوں کا مظاہرہ ہو جائے، تاکہ اُسے یہ احساس پیدا ہو کہ اللہ اُسے اپنا گھر نہیں بنانا چاہتا جسے بندے زبردستی اس کی طرف منسوب کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد ابابیل جیسے مختصر پرندے کو ہاتھی جیسے گراں ڈیل جانور کے مقابلہ میں بھیج کر خالقِ کائنات نے سن و سال کے امتیاز کو اس طرح ختم کیا ہے جس کی نظیر تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابوطالبؑ نے اس اطمینان نفس سے اور سکون قلب سے کیا پایا ہے۔؟

لیکن اس کا جواب تو اسی وقت ظاہر ہو گیا تھا جب رسول اکرمؐ نے آپ کو اس بات کی اطلاع دی تھی کہ قریش نے ہمارے بائیکاٹ کے لیے جو دستاویز لکھی تھی اسے دیمک کھا گئی ہے اور حضرت ابوطالبؑ نے انتہائی سکونِ قلب کے ساتھ قریش کو چیلنج کر دیا تھا کہ اس دستاویز پر ایک نظر کر لو۔ اگر محمدؐ کا قول صحیح ہے تو ایمان لے آؤ ورنہ ہم محمدؐ کو تمھارے حوالہ کر دیں گے۔

کیا اس سے زیادہ اطمینانِ نفس کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ انسان آج اس کو دشمن کے حوالہ کرنے پر آمادہ ہے جس کو مدتوں اپنی آغوش میں پالا ہے جس کی خاطر اپنی دنیاوی ریاست و زعامت کھوئی ہے جس کی وجہ سے شعب کی تلخ کام زندگی گذارنا پڑی ہے اور جس کے تحفظ کیلئے اپنی اولاد کی قربانی تک پیش کرنے کا انتظام کیا گیا تھا!

فاطمہ بنت عمرو بن عایذ بن عبد بن عمران بن مخزوم

(مومن کامل حضرت عبدالمطلب کی زوجہ اور حضرت ابوطالب کی والدۂ گرامی)

مناظرانہ تعصب سے الگ ہو کر دیکھا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ آباء و اجداد نبی کو تمام اخلاقی اور مذہبی نقائص سے بری ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ ماں باپ کی برائی سے اولاد کی بدنامی ہوتی ہے جیسا کہ علامہ سیوطی نے آباء و اجداد رسول اکرمؐ کے ایمان کا فیصلہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ انھیں مسلمان تسلیم کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ ماں باپ کی بدنامی سے اولاد بدنام ہو جایا کرتی ہے۔

حقیقت امر بھی یہی ہے کہ اگر کسی پست طبقہ کے انسان کے یہاں کوئی باشرف بچہ پیدا ہو جائے تو اقدار و مفاہیم سے نابلد عوام اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ ان کا حساب

خاندانی عظمتوں سے ہوتا ہے۔ وہ اضافی کمالات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں! اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کا مقصد یہ ہے کہ تمام عالم کو کسی ایک شخص کے سامنے جھکا دے تو اس کا فریضہ یہ ہوگا کہ اسے ایسے باشرف گھرانہ میں پیدا کرے جس کی شرافت اس انسان کی عظمت کیلئے سازگار ہو۔

بھلا کون ایسا ہوگا جو عطر شمامۃ العنبر کو مٹی کے کوزہ میں بھردے گا کس کی عقل گوارا کریگی کہ صاف و شفاف چشموں کا پانی گندی نالیوں سے بہائے۔ اور جب عام دنیاوی انتظامات کے اصول اتنے دقیق ہیں تو نور نبوت کیلئے جس ظرف کا انتخاب کیا جائے گا کیا وہ شرک و نجاست سے ملوث و آلودہ ہو سکتا ہے۔ ہرگز نہیں!

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے رسول اکرمؐ سے خطاب کر کے اعلان کر دیا تقلبک فی الساجدین جس کی تفسیر امام رازی نے ان الفاظ میں نقل کی ہے کہ اس سے مراد اصلاب طاہرہ اور ارحام طیبہ میں منتقل ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ جناب ابراہیمؑ کی معروف دعا یہ تھی واجنبنی وبنی ان نعبد الاصنام (خدایا مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے محفوظ رکھنا) کیا یہ ممکن ہے کہ حضور اکرمؐ کو نسل ابراہیم سے خارج کر دیا جائے اور اولاد ابراہیمؑ میں ان کا شمار نہ ہو۔

خود رسول اکرمؐ کی متفق علیہ حدیث ہے لم یزل ینقلنی اللہ من اصلاب الطاہرین الی ارحام المطہرات حتی اخرجنی فی عالمکم ھذا لم یدنسنی بدنس الجاھلیۃ (اللہ نے ہمیشہ ہمیں پاک صلب سے پاک رحم کی طرف منتقل کیا ہے۔ ہم اس دنیا میں آنے تک کسی وقت بھی جاہلیت کی گندگیوں سے آلودہ نہیں ہوئے۔ حدیث شریف میں طاہر و مطہر کے الفاظ کا مفہوم پورے طور پر اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب ہم انھیں انما المشرکون نجس کے ساتھ ملا کر دیکھتے ہیں تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان حضرات

میں کفر و شرک کا احتمال بھی نہ تھا۔

روضۃ الواعظین میں جابر بن عبداللہ انصاری کے واسطے سے یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ رسول اکرمؐ نے اپنی اور حضرت علیؑ کی تخلیق کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ الفاظ ارشاد فرماتے ہیں فثم نقلنا من صلبہ (آدم) فی الاصلاب الطاھرات الی الارحام الطیبہ فلم نزل کذالک حتی اطلعنی اللہ تبارک و تعالیٰ من طھر طاھر وھو عبداللہ ابن عبد المطلب فاستودعنی خیر رحم وھی آمنہ۔

"اللہ نے ہمیں حضرت آدمؑ کے بعد بھی برابر ارحام طیبہ اور اصلاب طاہرہ کے ذریعہ منتقل کیا ہے۔ یہاں تک کہ حضرت عبداللہ کے پاک صلب اور حضرت آمنہ کے مقدس رحم سے ہمیں اس دنیا میں ظاہر فرمایا ہے۔"

اس کے علاوہ خود حضرت ابوطالب کی ولدیت سے استدلال ہو سکتا تھا اس لیے کہ حضرت ابوطالبؑ حضرت علیؑ کے والد گرامی ہیں اور حضرت علیؑ کا نور اقدس ہمیشہ پاک اصلاب و طیب ارحام میں رہا ہے لیکن تعصب آمیز نگاہوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم نے جناب عبداللہ کو واسطہ قرار دیکر حضرت فاطمہ کی عظمت و جلالت کا اظہار کیا۔

آیات و روایات کی روشنی میں جب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ انوار طیبہ کیلئے ارحام طیبہ کی ضرورت ہے تو اب حضرت فاطمہ مخزومیہ کے ایمان و اجلال کے بیان کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہی اس لیے کہ یہ مخدرہ حضرت عبداللہ کی مادر گرامی ہیں اور حضرت عبداللہ کے صلب میں نور اقدس نبوی ودیعت کیا گیا تھا۔

اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوگا کہ ایسی مقدس اور باعظمت ماں سے حضرت ابوطالب کو وراثت میں کیا ملے گا اس کا فیصلہ تو بابصیرت علماء نفس کر سکتے

ہیں ! یا علم النفس سے قطع نظر کر لینے کے بعد ہر انسان کا وجدان و ضمیر !

فاطمہ بنت اسد حضرت ابو طالبؑ کی زوجہ محترمہ حضرت علیؑ کی والدہ گرامی

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ابھی تک مسلمانوں میں کوئی ایسا فرقہ پیدا نہیں ہوا ہے جو آپ کے ایمان کو شک و انکار کی نظر سے دیکھتا ہو۔ آپ کی جلالت قدر کا یہ رعب ہے کہ اہل تاریخ و سیر آپ کا شمار سابق الاسلام مخدرات میں کرتے ہیں اور آپ کے اسلام کو دیگر خواتین پر مقدم قرار دیتے ہیں۔ (ابوالفرج ۔ فصول مہمہ ابن صباغ)

اس کے باوجود آپ زندگی بھر حضرت ابوطالبؑ کی زوجیت میں رہیں اور ان کے ساتھ بہترین سلوک کرتی رہیں۔

آپ کے ایمان و عقیدہ اور عظمت و جلالت کے بعض شواہد یہ ہیں :

۱: جس وقت جناب امیرؑ کی ولادت کا وقت قریب آیا اور آپ نے اپنی زحمت کا احساس کیا تو خانۂ خدا کے قریب تشریف لائیں ۔ شکم اقدس کو جدار کعبہ سے مس کیا اور دعا کے لیے ہاتھ بلند کر دیے ۔ اللھم انی مومنۃ بک (خدایا میں تجھ پر ایمان لا چکی ہوں) خدایا مجھے اس مولود کا واسطہ جو میرے شکم میں ہے میری مشکل آسان کر دے !

کیا کہنا اس ایمان کامل اور رب شناسی کا کہ بچہ بطن میں ہے اور اس کا واسطہ دے رہی ہیں ۔ اللہ پر ایمان کا صریح لفظوں میں اعلان ہو رہا ہے ۔ کیا اس کے بعد بھی کفر و شرک کا کوئی احتمال کیا جا سکتا ہے ؟ !

۲: آپ کے رحم مطہر میں اس علیؑ کا نور رہ چکا ہے جس کو رسالت مآبؐ نے اپنے نور کا شریک قرار دے کر اصلاب طاہرہ اور ارحام طیبہ سے

اپنا تخلیقی سفر بیان فرمایا ہے۔ رحمِ طیّب میں غیر از اسلام کوئی تصور نہیں ہو سکتا ہے۔

۳: جلالتِ قدر کا یہ عالم تھا کہ رسولِ اکرمؐ نے اپنے دستِ مبارک سے تجہیز و تکفین کی۔ خود قبر میں اترے، ایک خاص اہتمام کے ساتھ نماز جنازہ پڑھائی، اپنے پیراہن میں کفن دیا۔ خود ہی تلقین پڑھی تاکہ دُنیا دیکھ لے کہ یہ خاتون عام عورتوں کی طرح مسلمان نہیں ہے بلکہ اس کا اسلام و ایمان ایک خاص اہمیت کا مالک ہے اور اور اس کا عقیدہ ایک مخصوص اخلاص کا حامل ہے۔ (الفصول المہمہ)

یہ سب اس لیے تھا کہ ناواقف اور متعصب عناصر پر آپ کا اسلام پوری طرح واضح ہو جائے اور یہ سمجھ سکیں کہ آپ کا اسلام بھی آپ کے شوہر کے اسلام کی ایک واضح دلیل ہے اس لیے کہ اسلامی قانون کی بنا پر غیر مسلم کسی مسلمان عورت کا شوہر نہیں رہ سکتا۔ قرآن مجید نے بار بار مشرک و مسلمہ کے ازدواجی تعلقات سے ممانعت فرمائی ہے اب یہ احتمال نہیں دیا جا سکتا ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے حکمِ قرآن کو ٹال دیا ہو اور اس پر عمل درآمد نہ کیا ہو جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی نظر میں جس طرح فاطمہ بنتِ اسد مسلمان تھیں اسی طرح حضرت ابوطالبؑ بھی مومنِ کامل تھے۔

مسلمانوں کو اختیار ہے چاہے رسولِ اکرمؐ کے نظریات سے اتفاق کریں یا اختلاف!

امیر المومنین علیؑ۔ ابوطالب کے فرزندِ ارجمند

دُنیا حضرت علیؑ کو سابق الاسلام تسلیم کرے یا نہ کرے ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں۔ اس لیے کہ یہ بحث تو ان لوگوں کے بارے میں بھلی معلوم ہوتی ہے جن کا سابقہ کفر سے رہ چکا ہو، جن کی پیشانیاں بتوں کے سجدوں سے آشنا ہو چکی ہوں۔ جن کے دل اصنام کی بارگاہ میں جھک چکے ہوں۔ لیکن وہ انسان جو تاریخی مسلمات کی بنا پر کرم اللہ وجہہ صرف اس لیے

کہا جاتا ہے کہ اس نے کبھی بتوں کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ اس نے کسی آن بھی سنگ و خزف کو سجدہ نہیں کیا اس کے بارے میں یہ بحث فضول ہی معلوم ہوتی ہے۔

بہرحال یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت علیؑ کی زندگی کا کوئی لمحہ بھی عالمِ کفر میں نہیں گزرا۔ حالانکہ اگر بعض مسلمانوں کے زعم کے مطابق ہم حضرت علیؑ کو کافر تسلیم کر لیں تو ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ حضرت علیؑ کی ابتدائی زندگی محکومیت بالکفر میں گزری ہے اسلیے کہ باطنی طور پر فطرت اسلام پر پیدا ہونیوالا بچہ بھی ظاہری طور پر ماں باپ ہی کے احکام کے تابع ہوتا ہے۔

کیا دنیا کا کوئی عاقل یہ تصور کر سکتا ہے کہ ایک کافر کے بچہ کی ولادت کے لیے خانۂ حق کی دیوار شق ہو کر راستہ دیگی۔ وہ خانۂ کعبہ جس کی تعمیر کے اہتمام کے بعد خلیلِ حق کو دوبارہ اس کی تطہیر کا حکم ہوا تھا ایک ایسے انسان کا مولد بنے گا؟ میرے خیال میں ایسا تصور عظمتِ خلیلؑ پر زبردست حملہ اور عظمتِ کعبہ پر بہت بڑا بہتان ہے "کعبہ میں ولادت علیؑ" یہ حضرت ابوطالبؑ کے ایمان کی بہترین دلیل ہے اور شاید یہ بھی ایک مصلحت رہی ہو جس کی بنا پر آپ کی ولادت کیلئے مشیّت نے کعبہ کا انتخاب کیا تھا۔

صاحبِ مناقب نے یہاں تک نقل کیا ہے کہ ولادت کے بعد حضرت ابوطالبؑ نے بچہ کو گود میں لیکر بارگاہِ احدیت میں عرض کی:

یا رب یا ذا الغسق الدجی ... والقمر المبتلج المضی

بین لنا فی حکمک المقضی ... ما ذا تری فی اسم ھذا الصبی

(اے تاریک رات اور چمکتے چاند کے خالق و مالک اب تو ہی فیصلہ کر دے کہ اس بچہ کا کیا نام ہو) اس کے جواب میں یہ دو شعر نازل ہوئے۔ علی بن ہمام کی روایت کی بنا پر تختی پر لکھے ہوئے اور فضل بن شاذان کی روایت کی بنا پر زبانِ ہاتف پر۔

خصصتما بالولد الزکی ... والطاہر المنتجب الرضی

۴۰۷۸

فاسمہ من شامخ علی	علی اشتق اسمہ من العلی

"تمھیں ایک پاک وپاکیزہ منتخب اور پسندیدہ بچہ دیا گیا ہے اس کا نام بلند و بالا اور اسم الٰہی سے مشتق یعنی علی ہے "

اگرچہ یہ روایت شیعی طریق سے نقل ہوئی ہے لیکن چونکہ میرا موضوع سخن مناظرہ سے ہٹ کر تحقیق حق ہے اس لیے ہر اس روایت پر اعتماد کر سکتا ہوں جس کے اسناد صحیح اور راوی معتبر ہوں، خواہ ان کا تعلق کسی فرقہ سے کیوں نہ ہو۔

نفسیاتی رجحانات

وہ افراد جن کے پہلو میں دل اور دل میں جذبات ہوتے ہیں وہ حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ انسان کو اپنا عقیدہ بہت پیارا ہوتا ہے وہ اپنے مذہبی رجحانات یا نظریاتی میلانات کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیتا ہے۔ اس کی نظر میں یہ ایک ایسی بیش بہا دولت ہوتی ہے جس کا توازن کسی شے سے نہیں ہو سکتا۔

آج بھی دیکھ لیجئے بھائی بھائی، باپ بیٹے، عزیز عزیز یہ سب کیوں جھگڑ رہے ہیں۔ ان میں نزاع کی بنیاد کیا ہے؟ ان میں اختلاف کس نے پیدا کیا ہے؟ کیا اس کا سبب نظریے کے علاوہ کچھ اور بھی ہے؟ اس کا نظریہ یہ ہے اس کا وہ، اس کا عقیدہ ایسا ہے اس کا ویسا۔ حالت یہ ہے کہ ادھر نظریات کی بحث چھڑی ادھر قرابت کے رشتے ٹوٹ گئے۔ اب نہ کوئی باپ ہے نہ بیٹا، نہ بھائی ہے نہ بہن جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ عقیدہ دنیا کے ہر رشتہ پر بھاری ہے اس کی قوت عالم کی ہر ایٹمی قوت سے زیادہ مؤثر ہے۔ انسان اپنے عزیز قریب کے خلاف بات برداشت کر سکتا ہے لیکن اپنے عقیدہ کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کرتا!

نفسیاتی اعتبار سے ثابت ہو جانے کے بعد یہ بھی واضح ہو گیا کہ عالم تقیہ کا

ایمان عام ایمان و اسلام سے زیادہ قیمتی ہوگا اس لیے کہ کھلا ہوا اسلام اپنے مذہب سے دفع کرسکتا ہے وہ اپنے خلاف کوئی کلمہ نہیں سُنے گا۔ اسے کسی مخالف کی بات برداشت نہیں کرنا پڑے گی۔ لیکن تقیہ کے ایمان کو ان تمام مشکلات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ وہ اپنے خلاف باتیں سنے گا اور چپ رہیگا اپنے اصول پر حملہ دیکھے گا اور دفاع نہ کرسکے گا۔ جذبات گھٹے گھٹے رہیں گے اور کوئی کلمہ زبان پر نہ آسکے گا، اتنا سخت مرحلہ بھی جہاد اکبر کہا جائیگا اس لیے جہاد بالنفس اس کے علاوہ کوئی اور شے نہیں ہے۔ تلوار لیکر میدان میں آجانا، دشمن کے ایک ایک کلمہ پر داد شجاعت دیکر جان بحق تسلیم ہوجانا بہت آسان ہے اور دشمنوں کے طعنے سُن کر ان کی تعدیاں دیکھ کر، ان کی بے ادبیوں پر نظر رکھتے ہوئے خاموش رہ جانا بہت مشکل ہے۔

یہی وجہ تھی کہ قرآن نے مومنِ آلِ فرعون کی مدح کی۔ یہی راز تھا کہ اصحابِ کہف کے قصّے زینتِ کتابِ عزیز بنائے گئے اس لیے کہ ان لوگوں نے ضبطِ نفس کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے مذہب کو ظاہر نہیں کیا تاکہ اس طرح اپنے اصول کا تحفظ کریں یا حضرت موسیٰ کی جان بچائیں!

معلوم ہوتا ہے کہ جذبات پر قابو حاصل کرکے مصالح وقت کے پیشِ نظر حفاظتی کارروائی کیلئے اپنے دین کو پوشیدہ کردینے والے حضرات اس بات کے زیادہ حقدار ہیں کہ انھیں جنسِ گراں کی اُجرت عطا کی جائے۔ ان کے اس کنزِ مخفی کو اچھی قیمت سے خرید اجائے۔

پھر کیا کہنا اس تقیہ کا جس کا مذہب اپنی جان کا تحفظ یا اپنے مال و آبرو کا بچاؤ نہ ہو بلکہ اس کا تمام تر محرک ایک قانون کا تحفظ، ایک رسول کی حفاظت اور ایک لازوال مذہب کا باقی رکھنا ہو جس کے نتیجہ میں دینِ الٰہی زندہ درگور ہونے سے بچ جائے اور جس کے طفیل میں اسلام پر مہرِ دوام ثبت ہوجائے۔

حضرت ابوطالبؑ کی یہی وہ بیش بہا دولت تھی جس کی صحیح قیمت امام وقت نے لگائی اور یہ فرمایا کہ وہ دوہرے اجر کے حقدار ہیں۔ انھوں نے فقط اسلام ہی قبول نہیں کیا اسلام کے تحفظ اور رسولِ اسلامؐ کی بقا کی خاطر اپنے جذبات کی قربانی بھی دی ہے۔ لپنے ظاہری وقار و عظمت کو بھی کھویا ہے اپنی رات کی نیند اور دن کا چین بھی حرام کیا ہے۔

ارباب انصاف فیصلہ کریں کہ راحت و اطمینان کے ساتھ اعلانِ اسلام زیادہ قیمت رکھتا ہے یا بید ارضمیر اور زندہ دل کے گھٹے ہوئے جذبات، اسلام ظاہر کرکے اپنے جان و مال کا تحفظ زیادہ قیمت رکھتا ہے یا اس بیش بہا دولت کو خزانۂ دل میں چھپا کر رسول اسلامؐ کا تحفظ؟!

ذاتی خدمات

رسول اسلامؐ اور حضرت ابوطالب کی زندگی کا امتزاجی مطالعہ اس بات کا قوی شاہد ہے کہ ابوطالب کی طینت کا خمیر اسلام و عقیدہ کے آب حیات سے اٹھا تھا۔ یہ وہ انسان تھا جس نے اصل و نسل، حسب و نسب کسی اعتبار سے بھی کفر سے کوئی تعلق پیدا نہیں کیا۔

تبلیغ کے وہ ابتدائی لمحات جن میں ایک موید کی شدید ضرورت ہوتی ہے جب تحریک اٹھانے والا حسرت و یاس سے ایک ایک کا منہ تکتا ہے کسی محرک کا باقاعدہ ساتھ دیکھا اس کی تحریک کو کامیاب بنا دینا ان تمام ہمراہیوں سے کہیں زیادہ بہتر ہوتا ہے جو تحریک کی کامیابی کے بعد ظہور میں آتی ہیں۔

سچ فرمایا تھا امام محمد باقرؑ نے کہ اگر ساری دنیا کا ایمان ایک پلہ میں ہو اور ابوطالبؑ کا ایمان دوسرے پلہ میں تو ان کا پلہ بھاری رہے گا۔ اس لئے کہ وہ اسلامی بنیادوں کے مضبوط کرنیوالے اور اسلام کو دنیا سے روشناس کرانیوالے ہیں۔

دنیا جانتی ہے کہ ابوسفیان بھی مسلمان تھا اور حضرت ابوبکر بھی لیکن حضرت ابوبکر کے اسلام کو ترجیح حاصل ہے صرف اس لیے کہ انھوں نے غربت کے دور میں اسلام کو سندِ قبولیت عطا کی تھی اور ابوسفیان نے اس کی بڑھتی ہوئی شوکت کو دیکھنے کے بعد!

لوگ کہتے ہیں کہ حضرت عمر کے اسلام کی وقعت بھی اسی لیے زیادہ ہے کہ ان کے اسلام سے مذہبی دبدبہ میں اضافہ ہوگیا تھا۔ اس ہیبت سے نہ جانے کس کس کے دل ہلنے لگے تھے۔ اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ عالم غربت و کس مپرسی کا اسلام حالتِ شوکت و جلالت کے اسلام سے کہیں زیادہ وقعت و اہمیت رکھتا ہے لیکن یہ یاد رہے کہ یہ تمام عزت کے اسلام صرف زبانی اقرار کے حدود تک محدود تھے۔ ان کی تاریخ میں اسلام یا رسول اسلامؐ کی نصرت کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ اور ابوطالب کے اسلام کا تعلق زبان سے نہیں تھا بلکہ اس کی پشت پر عمل ہی عمل تھا اور خدمت ہی خدمت!

اگر یہ نہ ہوتا تو اسلام کی صف خالی اور اس کی بساط الٹی ہوئی نظر آتی۔ اگر یہ نہ ہوتا تو رسول اسلامؐ خاک و خون میں غلطاں اور ان کی تحریک زندہ درگور دکھائی دیتی۔ اگر یہ نہ ہوتا تو الٰہی مقصد نامکمل اور انسانی کمال ناتمام ہو کر رہ جاتا۔

اس اسلام کا قیاس ان اقراروں پر نہیں ہو سکتا جن میں خوف و رجا، حرص و طمع، اندیشۂ ماضی اور فکر فردا کے احتمالات پائے جاتے ہوں۔ سچ کہا تھا ابن ابی الحدید معتزلی نے "اگر ابوطالبؑ کے خدمات نہ ہوتے تو اسلام کا کوئی رکن بھی قائم نہ ہو سکتا۔"

آپ ان خدمات کا تجزیہ کریں تو آپ کو ہر ہر قدم پر عقیدہ کی تجلیاں اور ایمان کی ضو فشانیاں نظر آئیں گی۔ وہ پہلا دن جب حضرت عبداللہ کے بعد ایک رہا سہا محافظ (عبدالمطلب) دارِ دنیا سے گزر رہا تھا اور چلتے چلتے یہ وصیت کرتا جا رہا تھا کہ کاش میں اس بچہ کے اعلانِ تبلیغ تک زندہ رہتا تو اس کے ہاتھ پر بیعت کرتا۔ خبردار جو میری اولاد میں رہ جائے اس کا یہی فریضہ ہے۔"

کتنا حسین موقع تھا ایک مختلف العقیدہ انسان کیلئے کہ اس کم سنی اور کس مپرسی کے عالم میں اس بچّہ کا کام تمام کردیتا، نہ بانس رہتا نہ بانسری، نہ محرک رہتا نہ تحریک، نہ صاحب عقیدہ و نظام رہتا نہ نظام و عقیدہ ۔۔ لیکن ہمیں تو یہ کچھ نظر نہیں آتا۔

اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ ابوطالب کو محمد عربی کی نبوت کا علم نہ ہو سکا تھا تو بحیرا راہب کے بیان کے بعد تو یہ حقیقت واضح ہو گئی تھی، اب کیا شبہ کی گنجائش رہ گئی تھی؟ اب کیا خطرہ تھا؟ اب تو وطن سے بھی دُور تھے، وہیں خاتمہ کر دیا ہوتا۔ عقیدہ تو قرابت سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے اور اس نبوت کا تو مطلب ہی عالم کفر و شرک کی کھلی ہوئی مخالفت تھا۔

فرض کیجئے کہ اب بھی علم نہیں ہو سکا تو کیا اس وقت بھی علم نہ ہوا تھا جب مکہ کے کوچے نعرۂ توحید سے گونج رہے تھے جب ہر آن کان میں قولوا لا الہ الا اللہ تفلحوا کی آوازیں آرہی تھیں۔ یقیناً معلوم ہوا۔ تو کیا یہ بھی فرض کرلیا جائے کہ حضرت ابوطالبؑ میں مقابلے کی تاب و تواں نہ تھی۔ یا یہ مان لیا جائے کہ ان کے پاس اس تحریک کو دبانے کی صلاحیت نہ تھی۔ یا یہ تسلیم کرلیا جائے کہ گود کے پلے ہوئے بچّے کو بھی ختم کر دینا ممکن نہ تھا۔

یقیناً یہ سب کچھ ممکن تھا۔ پھر ابوطالبؑ نے ایسا کیوں نہیں کیا۔ حقیقتاً یہی وہ تاریخی تجزیہ ہے جو ہر مورخ کے ذہن میں ابوطالبؑ کے ان نفسیاتی عوامل اور عقائدی محرکات کا تصور قائم کر سکتا ہے جو انھیں اس حیرت انگیز موقف پر مجبور کر رہے تھے اور جن کی بنا پر وہ رسول اسلامؐ کی مسلسل کمک کر رہے تھے۔ میں نے مانا کہ رسولؐ کی ذاتی حفاظت اس رشتہ کی بنا پر تھی جو انھیں اپنے بھائی سے حاصل تھا۔ وہ اس سلسلے میں اس قرابت کی پاسداری کر رہے تھے جس کا تصور ایک چچا کے دل میں اپنے یتیم بھتیجے کے لیے ہوتا ہے لیکن کیا اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ اس کے دین کی بھی ترویج کی جائے۔ اس کے مشن کو بھی کامیاب بنایا جائے؟ کیا قانون کا تقاضا یہ نہ تھا کہ قرابت کا لحاظ کرتے ہوئے بچّے کو سمجھا بجھا کر خاموش کر دیتے۔

اور اگر وہ سکوت اختیار نہ کرتا تو وہی کچھ اقدام کرتے جو عقیدہ و رشتے کے اصادم کے وقت کیا جاتا ہے۔

یقیناً قاعدہ یہی تھا لیکن یہاں تو معاملہ بالکل برعکس تھا۔ خاموش ہونا کیسا مزید بولنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ روک دینا کیسا مزید تبلیغ پر آمادہ کر رہے ہیں (طبری ج ۶ ص ۶۴)

اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابوطالبؑ اس تحریک سے پوری طرح متفق تھے جسے رسول اسلامؐ چلا رہے تھے۔ انھیں اس عقیدہ سے پوری ہمدردی تھی۔ جو رسول اکرمؐ کے دل میں کروٹیں لے رہا تھا۔ انھیں دینِ الٰہی سے اسی طرح محبت تھی جس طرح ایک راسخ العقیدہ مسلمان کو ہوتی ہے۔

بات اسی حد پر ختم نہیں ہوتی بلکہ تاریخ ایک قدم اور آگے بڑھ جاتی ہے۔ اسلامی تحریک کی روز افزوں ترقی اور بڑھتی ہوئی کامیابی کو دیکھ کر کفارِ قریش حضرت ابوطالبؑ کے پاس آکر یہ شکایت کرتے ہیں کہ اپنے بھتیجے کو اس تبلیغ سے روک دیجئے۔ حضرت نے اس مطالبے کو بہ احسن وجوہ ٹال دیا لیکن جب ادھر سے اصرار بڑھا تو آپ نے اپنے موقف کی نزاکت کا خیال کرتے ہوئے بھتیجے تک یہ پیغام پہنچا دیا۔ فرمایا بیٹا! ان بنی عمک ھولاء زعموا انک تو ذیھم (یہ تمہارے رشتہ دار خیال کرتے ہیں کہ تم انھیں اذیت دیتے ہو)

بس اگر بفرضِ محال یہ تسلیم بھی کر لوں کہ حضرت ابوطالبؑ کچھ زیادہ حساس آدمی نہ تھے ان کے دل میں اپنے مذہب کا درد نہ تھا۔ انھیں ذاتی طور پر اپنے دین سے کوئی خاص ہمدردی نہ تھی تو یہ بہر صورت قابلِ تسلیم نہیں ہے کہ کفار کے اس شدید اصرار و تاکید کے بعد بھی ان میں احساس نہیں پیدا ہوا۔ اور انھیں اپنے دین کا درد نہیں ہوا۔

تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ان میں اپنے مذہب سے ہمدردی پیدا ہو گئی تھی تو یہ اندازِ بیان کیا تھا؟ کیا انھیں سلیقہ گفتگو اور اندازِ تخاطب سے بھی واقفیت نہیں تھی چاہیے تو یہ تھا کہ صاف صاف کہتے بیٹا! یہ سچ کہتے ہیں تم انھیں اذیت دیتے ہو ان کے خداؤں کو برا بھلا

کہتے ہو۔ ان کے مذہب کو انسانیت سوز اور توہینِ بشریت قرار دیتے ہو تمھیں ان حرکتوں سے باز آجانا چاہیئے ورنہ میں تمھیں ان کے حوالے کر دوں گا۔

لیکن یہاں تو معاملہ بالکل برعکس ہے۔ جب آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اگر داہنے ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیا جائے تو تبلیغ کو ترک نہیں کروں گا حضرت ابوطالبؑ نے صریح لہجے میں کہہ دیا قریش والو! واللہ ماکذب ابن اخي قط۔ خدا کی قسم میرے بھتیجے نے غلط بات کہی ہی نہیں۔ (اسنی المطالب)

اگر کوئی ناقد بصیر اس کلمہ کی لفظیاتی تحلیل کرتا تو اسے معلوم ہوتا کہ حضرت ابوطالبؑ ایمان و عقیدہ کے ساتھ ساتھ اندازِ تخاطب پر کتنی قدرتِ کاملہ رکھتے تھے۔ رسول اکرمؐ سے بات نقل کی تو یہ کہہ کر کہ ان لوگوں کا خیال ہے اور ان لوگوں سے گفتگو کی تو یہ کہہ کر کہ میرا بھتیجا غلط گو نہیں ہے۔

مقصد یہ تھا کہ میرا اسلام نہ آج کے کفار و مشرکین پر ظاہر ہونے پائے اور نہ کل کے آنیوالے مسلمانوں سے پوشیدہ رہ جائے۔ اس لئے آپ نے ایک ایسا امتزاجی قدم اٹھایا جس سے رسولِ اسلامؐ کا دل بڑھ گیا ہمت بندھ گئی اور آپ نے یہ سمجھ لیا کہ یہ اندازِ کلام میری حمایت و نصرت کی طرف ایک کھلا ہوا اشارہ ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ قوتِ قلب کا سہارا لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور اعلان کر دیا زمین و آسمان کے نظام میں تبدیلی ہو جائے لیکن تبلیغ حق میں تبدیلی ناممکن ہے۔ اللہ رے قوتِ تدبیرِ ابوطالب! آج کے ایک توریہ آمیز اقدام سے اسلام کی لاج رکھ لی۔ اور کفار کو حقیقت سے آشنا بھی نہیں ہونے دیا۔ کیا اتنا حکیمانہ موثر اقدام ابوطالب کے علاوہ کوئی اور بھی کر سکتا ہے؟ اس مقام پر قریش سے گفتگو کرنے میں "خدا کی قسم" بھی خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ ایک کافر اپنے ہم مذہب کے سامنے لات و عزیٰ کی قسم کھاتا ہے یا خدا ئے برحق کی؟!

میرا موضوعِ کلام چونکہ ایمانِ ابوطالب کے ایجابی پہلو پر بحث کرنا ہے اس کے مناظرانہ پہلوؤں

کو چھیڑنا مقصود نہیں ہے اس لیے میں بعض ادلہ و براہین سے قطع نظر کیے لیتا ہوں ورنہ مجھے یہ کہنے کا حق ضرور حاصل تھا کہ شعب کی زندگی اور اس کی سختیاں برداشت کر کے نصرت رسولؐ کرنیوالا مسلمان نہ ہوگا تو کیا وہ مسلمان ہوں گے جنھوں نے آل رسولؐ کے حق غصب کیے، ان پر ظلم و ستم روا رکھا۔ مخدرات عصمت کو گرفتار کر کے کوفہ و شام کے بازاروں اور درباروں میں تشہیر کیا۔ کفار قریش کے مقابلے میں اتنی جرأت مندی کے ساتھ نبوت کی تصدیق کر کے ان کے خیالِ خام کو زعمِ ناقص کا مرتبہ دینے والا مسلمان نہ ہوگا تو کیا وہ معظمہ مسلمان ہوں گی جو ایک وقت میں جھلا کر رسول اسلامؐ ہی سے کہہ بیٹھتی ہیں کہ آپکو یہ کیسے خیال ہوگیا کہ آپ نبیؐ خدا ہیں؟

حقیقت امر یہ ہے کہ ان تمام بنیادی اقدامات اور اساسی خدمات کو رشتہ اور قرابت پر محمول کر دینا ایک ایسا جہالت خیز اور حیرت انگیز اقدام ہے جسے تاریخ و نفسیات، ضمیر و وجدان کے مذہب میں قابلِ معافی تصور نہیں کیا جا سکتا۔

ابوطالب جیسا عمیق الفکر اور سلیم النظر انسان کسی وقت بھی ضمیر و وجدان، مذہب و دیانت کے خلاف ایسے اقدامات نہیں کر سکتا تھا جیسے اقدامات آپ کی پوری زندگی کے نمایاں پہلوؤں کی جگہ لئے ہوئے ہیں۔

آپ کے بارے میں بیانات!

در حقیقت زیر نظر کتاب ہی وہ واحد کتاب ہے جس نے ترتیب و تنظیم ہمہ گیری و جامعیت کے اعتبار سے وہ انفرادی شان حاصل کرلی ہے جو اس موضوع پر تالیف شدہ کتابوں میں نظر نہیں آئی۔ طرفین کے بیانات کو جمع کر کے ان پر صحیح علمی تنقید کرنا مصنف کا ایک عظیم شاہکار ہے۔

میری نظر سے اب تک کوئی ایسی کتاب نہیں گزری جس نے اس انداز تحریر اور اس سلیقہ ترتیب سے ان بیانات کو جمع کیا ہو۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سابق کے علماء نے

سلیقہ سے کام نہیں لیا بلکہ اس کی تمام تر ذمہ داری تاریخ کے سر ہے۔ تاریخ اس قدر تیزی کے ساتھ آگے بڑھتی جا رہی ہے کہ کل کی باتیں آج قدیم معلوم ہو رہی ہیں، کل کا سلیقہ آج کہنہ نظر آرہا ہے۔

یقیناً یہ تمام تالیفات اپنے اپنے وقت کا شاہکار رہی ہونگی لیکن آج دنیا تالیف کے جس سلیقے سے آشنا ہو رہی ہے وہ ان تالیفات میں بڑی حد تک مفقود نظر آتا ہے اور زیر نظر کتاب میں نمایاں۔

یہی وہ سلیقۂ تحریر ہے جس کی داد "علامہ بولیس سلامہ" ادیب بیروت نے ان الفاظ میں دی ہے "اگر مؤلف نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا ہوتا تو وہ وکلاء کی صف اول میں ہوتے اس لیے کہ طریقۂ استدلال اور سلیقۂ استنتاج میں ان کی ایک انفرادی حیثیت ہے۔ جو ان کی کامیابی کی ضامن ہے۔

میرا دل چاہتا ہے کہ اس مقام پہ دو ایک باتوں کا اضافہ کر دوں جو مؤلف کے قلم سے رہ گئی ہیں اور ان سے اسلام ابوطالب پر اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے۔

پہلی بات جناب ابراہیمؑ کی وہ دعا ہے جس میں آپ نے بارگاہ الٰہی میں عرض کی تھی۔ ومن ذریتنا امۃ مسلمۃ لک (خدایا ہماری ذریت میں سے امت مسلمہ قرار دے ظاہر ہے کہ امت کا اطلاق ایک دو فرد پر مجاز ہوتا ہے حقیقت کیلئے کم سے کم تین فردوں کا ہونا ضروری ہے حالانکہ حضرت عبداللہ کے یہاں ولادت سے پہلے اور حضرت حمزہ کے دنیا میں آنے کے قبل امت مسلمہ کے مصادیق میں حضرت عبدالمطلب اور حضرت عبداللہ کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ لہٰذا اب اگر حضرت ابراہیم کی دعا کو بالشاہ مستجاب تسلیم کرنا ہے تو حضرت ابوطالب کو اسی امت مسلمہ کا ایک فرد تسلیم کرنا پڑے گا ورنہ دعائے خلیل بے ثمر اور طلب ابراہیمی بے اجابت رہ جائیگی۔

دوسری بات جناب ابوطالبؑ کا وہ خطبہ ہے جو آپ نے جناب فاطمہ بنت اسد

عقد کرتے وقت پڑھا تھا جس سے ایمانِ کامل اور عقیدہ راسخہ کی شعاعیں پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی ہیں۔ صاحب مواہب الواہب نے آپ کے اس تاریخی یادگار خطبہ کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

الحمد للہ رب العٰلمین رب العرش العظیم والمقام الکریم والمشعر والحطیم الذی اصطفانا اعلاماً وسادۃً وعرفاءَ خلصاء وقادۃً (تمام تعریفیں اس معبود برحق کیلئے ہیں جو تمام کائنات، عرش عظیم، مقام کریم اور مشعر و حطیم کا مالک ہے اسی نے ہمیں منتخب کر کے عَلَمِ شرافت، صاحب سیادت و معرفت اور اہل زعامت و ریاست قرار دیا ہے)

دُنیا غور کرے کہ اعتراف ربوبیت و توحید سے بُت پرستی کی نفی اور اسلام کا اعتراف کس قدر نمایاں طور پر نظر آرہا ہے۔ مجھے تو حضرت ابوطالب کی عظمت کی کوئی انتہا نہیں معلوم ہوتی جب میں آپ کے اس خطبہ کا آغاز الحمد للہ رب العٰلمین سے دیکھتا ہوں۔ اور یہ دیکھتا ہوں کہ اس خطبے کے وقت تک قرآنِ کریم نازل نہیں ہوا تھا اور اس کا افتتاح اسی فقرہ سے ہوا ہے جس سے خالق کائنات نے اپنے کلام کا آغاز کیا ہے۔

تیسری بات ادیب بیروت بولیس سلامہ کا وہ فقرہ جو انھوں نے اسی کتاب کی تقریظ میں تحریر کیا ہے آپ فرماتے ہیں ان الیتیم استظل فی کنف عمہ صبیاً و یافعاً فلما برزت شمس الیتیم مشی العم فی نورھا (پہلے یتیم عبداللہ نے بچپن اور جوانی کی منزلیں اپنے چچا کے سایہ میں گذاریں اور بعد میں جب نورِ رسالت جگمگا اٹھا تو خود چچا بھتیجے کے سایہ میں چلنے لگا۔)

کیا کہنا اس نشوونما کا کہ نبی کی تربیت کے ساتھ اپنی روحانی منزلیں بھی طے ہو رہی ہیں۔

میرا مقصد اس طولانی تمہید سے اظہارِ فضل و کمال یا کوئی دوسرا مطلب نہ تھا میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ آپ کتاب کے مطالعہ سے پہلے ہی اس کے انداز بیان سے آشنا ہو جائیں

اور آپ کے سامنے بعض وہ حقائق بھی آجائیں جو اصل کتاب میں درج نہیں ہو سکے۔

اب آپ سے التماس ہے کہ کتاب کا مطالعہ کرتے وقت حسب ذیل نکات پر ضرور توجہ رکھیں:

۱: یہ کتاب چونکہ عربی جیسی وسیع زبان کا ترجمہ ہے اس لیے اس کے بیان میں وہ شگفتگی پیدا نہیں ہو سکی جس کی توقع ہر مطالعہ کرنے والے کو ہوتی ہے۔

۲: چونکہ کتاب میں اکثر بیانات دوسرے لوگوں کے ہیں جو نظریاتی یا مذہبی اعتبار سے ہمارے مخالف ہیں اس لیے ان کے جسارت آمیز کلمات کو مؤلف یا مترجم کی رائے پر محمول نہ فرمائیں بلکہ ہر ایسے کلمہ کے ساتھ ایک معاذ اللہ یا استغفر اللہ ضرور کہہ لیا کریں۔

۳: چونکہ ارکان مکتبہ لتعمیر ادب کی تعجیل، اپنی عادت اور ماہِ رمضان کی برکت کی وجہ سے یہ ترجمہ اوّل ماہ رمضان سے لے کر نیمہ رمضان کے اندر تمام کیا گیا ہے اس لیے اگر اس میں ادبی یا غیر ادبی اغلاط نظر آجائیں تو مجھے براہ راست مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں اس کا تدارک کر دیا جائے یا پھر کسی دوسرے ذریعہ سے ناظرین کرام کو متوجہ کر دیا جائے۔

اتنی سمع خراشی کے بعد میں آپ سے دوسری ملاقات تک کے لیے رخصت چاہتا ہوں

آپ کا مخلص اور آستانہ علی ابن ابیطالب کا مجاور

حیدر جوادی کراروی

النجف الاشرف

۱۰ شوال سنہ ۱۳۸۴ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وقال رجل مومن من آل فرعون یکتم ایمانہ أتقتلون رجلا ان یقول ربی اللہ وقد جاءکم بالبینات من ربکم

آل فرعون کا وہ بندۂ مومن جو اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا۔ قوم سے مخاطب ہوکر کہنے لگا کیا تم کسی شخص کو صرف اس لیے قتل کرنا چاہتے ہو کہ وہ اللہ کو اپنا پروردگار کہتا ہے جبکہ وہ اللہ کی طرف سے تمھارے پاس دلائل بھی لایا ہے۔

وجاء من اقصی المدینۃ رجل یسعی قال یٰقوم اتبعوا المرسلین اتبعوا من لا یسئلکم اجرا وھم مھتدون ومالی لا اعبد الذی فطرنی والیہ ترجعون ہ

آخر شہر سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور اس نے کہا اے قوم والو رسولوں کا اتباع کرو۔ یہ تم سے کسی اجرت کے طالب نہیں ہیں اور ہدایت یافتہ ہیں۔ آخر ہم اپنے خالق کی عبادت کیوں نہ کریں جب کہ تم سب اسی کی بارگاہ میں پلٹ کر جاؤ گے۔

ألم یجدک یتیما فآوی ووجدک ضالا فھدی ووجدک عائلا فاغنیٰ

اے رسول! کیا تمھیں پروردگار نے یتیم دیکھ کر پناہ نہیں دی۔ کیا تمھیں گم گشتہ پاکر متعارف نہیں کرایا۔ کیا تمھیں عزت کے عالم میں مستغنی نہیں بنایا۔

آستانۂ تاریخ و تقدیس
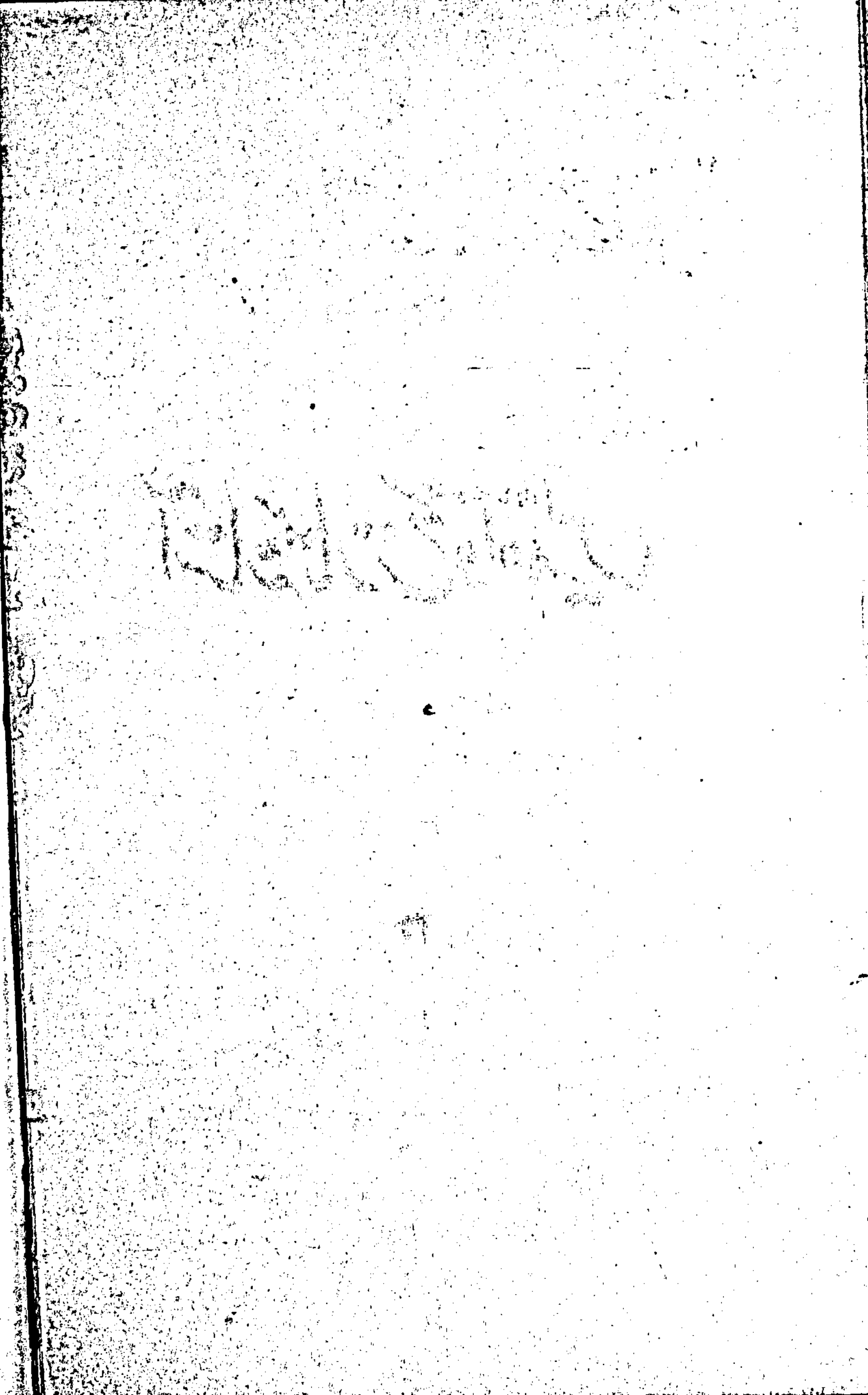
آستانۂ تاریخ و تقدیس

اس وقت میرے سامنے ایک ایسے انسان کی سیرت ہے جس کی زندگی کے ساتھ ہوا و ہوس کھیلتے رہے اور کرایہ کے قلم صراطِ مستقیم سے منحرف ہو کر حقیقت پر گہرا پردہ ڈالتے ہوئے ان کا ساتھ دیتے رہے ہیں۔ یہی طرزِ عمل ان قلموں کا ہر اس واضح حقیقت کے ساتھ رہتا ہے جو ان کے خواہشات و جذبات پر پابندی لگانا چاہتی ہے۔

یہ وہ انسان تھا جس نے تاریخ میں اپنی سیرت کے خطوط سنہری حرفوں سے کھینچے ہیں اور اسی لیے یہ انسان مجاہدین کی صفِ اوّل اور انصارِ دین و پیغمبرانِ انسانیت کے طبقۂ اولیٰ میں شمار ہوتا ہے۔

یہ وہ انسان ہے جس نے دینِ محکم کی اس وقت نصرت کی جب تمام قلوب جور و جفا پر آمادہ تھے جب تمام آنکھوں کی تند نگاہی سے حسد و عداوت کے شرار نکل رہے تھے۔ جب قدم قدم پر طغیان و عصیان اور ایسے انقلاب کے اندیشے تھے جو اس شعلۂ حقانیت کو خاموش کر دینے کے کوشاں تھے۔

لیکن ادھر اہلِ لوزِ دینِ جدید" کی طرف ہاتھ بڑھے اور ادھر یہ انسان پوری قوت کے ساتھ تحدی کر کے کھڑا ہو گیا اور ان تمام ہاتھوں کو پلٹا دیا جنھیں اپنی کامیابی کا پورا اطمینان تھا۔ چنانچہ اس نصرت کا لازمی نتیجہ تھا کہ حسد و کینہ کا رخ اس ناصرِ اوّل ہی کی طرف مڑ جائے جیسا کہ مثل مشہور ہے "گھوڑے کا غصہ لگام پر اترتا ہے"۔

یہ وہ انسان ہے جس نے شجرِ اسلام کو اس وقت سینچا اور بچایا جب تند ہوائیں چل رہی تھیں اور وہ ایک نرم و نازک بچہ کے مانند تھا چنانچہ وہ بڑا قوی ہوا اس کی شاخیں پھیلیں۔

اور دشمن اس وقت تک اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے جب تک کہ چشمۂ فیض ابلتا رہا اور یہ مخلص محافظ زندہ رہا۔

یہ وہ انسان ہے جس کی اسلام میں ایک حیثیت ہے جس نے آثار جمیلہ اور افعال باقیہ چھوڑے ہیں لیکن افسوس کہ ابنائے خواہشات ان آثار سے نظر موڑ کر اس انسان پر ظلم کرنے کیلئے آمادہ ہو گئے اور جوہر حق و رونق فضیلت کو بدنام کرنے کیلئے خرافات وضع کرنے لگے

خلافت راشدہ کا زمانہ ان آثار و احسانات کو اپنے دل پر ثبت کر کے گزر گیا اور اب اس ملوکیت اور ظالم سلطنت کا دور آ گیا جس کا پہلا فریضہ حضرت علیؑ کی تنقیص تھا اس لیے کہ اس کی بنیاد ہی حق علیؑ کے غصب پر تھی۔ چنانچہ انھیں وسائل تنقیص و تحقیر میں سے ایک بات یہ بھی کہ آپ کے والد محترم کی شان میں جسارت کی جائے۔
اب کیا تھا گھٹیا ضمیر کچے دل جو زمانہ ایک نئے رنگ کے عادی تھے جنھیں نہ فضیلت کی قدر و قیمت معلوم تھی۔ اور نہ رذالت کی حد و تعریف باقاعدہ کرایہ پر چلنے لگے۔
اس تجارت میں ذمہ داریاں بکتی تھیں، عہد و پیمان ٹوٹتے تھے، حق کو باطل اور باطل کو حق بتایا جاتا تھا۔ دین خدا کو معمولی رقم یعنی چند ذلیل دینار، کھوٹے درہم اور غصبی مال پر بیچا جاتا تھا تاکہ اپنے پست مقصد کو حاصل کیا جائے اور ذلیل دل کو راضی کر کے حکومت وقت کو خوش کیا جائے۔
یہی وجہ تھی کہ حکومت نے تمام وسائل انہدام کا رخ اسی بنیاد فضائل کی طرف موڑ دیا اور اپنے خیال میں یہ طے کر لیا کہ وہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو جائیگی۔
ظاہر ہے کہ ایسی تجارت صرف سیاہ رات کی تاریکیوں میں ہو سکتی تھی اس لیے کہ چمگادڑ کی تمامتر دوڑ دوش اور پرواز رات کی تاریکی ہی میں ہوتی ہے جب نور کی شعاعیں نہیں ہوتی ہیں۔ اس کی خواہش بھی یہی ہوتی ہے کہ یہ رات طولانی ہوتی جائے تاکہ پروانہ

کی فضا میں ہمارا کوئی شریک ہو سکے۔

حکومتِ وقت نے بھی اپنی سیہ کاریوں کے تحفظ کے لیے ایسے اسباب مہیا کرنے شروع کر دیے جس سے جہالت و ضلالت کی تاریکی باقی رہ جائے۔

(۲)

خواہشات اٹھے اور انھوں نے تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ ارادہ یہ تھا کہ حالات کو بالکل منقلب کر دیا جائے۔ چنانچہ ضمیروں کو مسخر کیا گیا اور حسب خاطر حدیثیں وضع ہونے لگیں۔ وہ لوگ جن کے دل میں اسلام نے جڑ نہیں پکڑی تھی، جنھیں جاہلیت سے پوری طرح نجات نہ ملی تھی۔ دین کو منہدم و تباہ و برباد کرنے پر آمادہ ہو گئے اور وضع احادیث ایک کامیاب سرمایہ کا کام دینے لگی۔

اس بلیک مارکیٹ کے تین رکن تھے ۱: فضائلِ علیؑ کا مخفی کرنا ۲: حضرت کے خلاف احادیث وضع کر کے آپ کی شان کی آیتوں کو دوسروں کی طرف اور دوسروں کی مذمت کی آیات کو آپ کی طرف موڑ دینا ۳: دیگر صحابہ کی شان میں روایتیں گھڑنا۔

اس بازار کے تاجر اوّل معاویہ نے دیکھا کہ یہی تجارت اس کی سلطنت کی خشت اوّل ہے چنانچہ اس نے مختلف طریقوں سے کوشش کر کے اپنی بات کو کامیاب بنا دیا۔ متزلزل عقائد، زبانی اور بے جان دین، تڑپتے ہوئے خواہشات، مچلتے ہوئے اغراض، چمکتے ہوئے سونے کے سکے سب مل کر اس سیہ کاری میں شریک ہو گئے۔

اربابِ غرض، اصحابِ ہوا و ہوس نے اس طریقے کو اپنی پیاس بجھانے کا بہترین وسیلہ تصور کر لیا۔ معاویہ نے موقع غنیمت دیکھ کر اس نرم و نازک زندگی پر ایک بھاری بھر کم بوجھ لاد دیا اسطرح کہ سب اس کے امر کی اطاعت کرنے لگے بلکہ بغیر امر بھی جویائے تقرب ہو گئے۔

معاویہ نے اپنے عمّال کو یہ فرمان بھیجا کہ جو شخص بھی ابوتراب اور اہل بیت کے

۱؎ شرح نہج البلاغہ ج ۳ - ص۱۵

فضائل بیان کرے گا میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ اب کیا تھا خلباء ہر منبر سے آمادہ طعن ہوگئے۔ اہلبیت سے برارت اور ان کی مذمت شعار بن گئی۔ کم از کم ستر ہزار اسلامی منبروں سے حضرت پر لعنت شروع ہوگئی۔ (معاذ اللہ)

عوام تو خطیبوں ہی پر اعتماد کرتے ہیں اور انہی کی باتوں کی تصدیق کرتے ہیں۔

آپ اندازہ کریں ستر ہزار منبروں کی مجلسوں میں کتنے افراد ہوں گے! پھر ان افراد کے زیر نگرانی کتنے اطفال و خواتین کے گروہ ہونگے جو سب کے سب اسی خطیب پر اعتماد کریں گے اور اسی کی بات پر عمل کریں گے۔

معاویہ نے دوبارہ حکم دیا "شیعانِ علیؑ و اہلبیتؑ کی شہادت قبول نہ کرو۔"

کیوں؟ تاکہ شیعہ تنگ دل ہو جائیں۔ ان کی عزت گھٹ جائے اور وہ شدائد اعدا اور آلامِ زمانہ کے ہدف بن جائیں۔ اس کے بعد اسی کے مقابلے میں عثمان و شیعانِ عثمان کے فضائل میں روایت بیان کرنے کیلئے انعامات و عطایا مقرر کرائے اور فرمان جاری کر دیا کہ اب[۲] عثمان کی شان میں روایتیں زیادہ ہوگئی ہیں۔ تمام شہروں اور دیہاتوں تک ان کی رسائی ہوگئی ہے۔ لہذا اس حکم کے بعد سے لوگوں کو صحابہ اور خلفاء کی شان میں روایتیں وضع کرنے کی دعوت دو۔ اگر ابو تراب کی فضیلت میں کوئی روایت نظر آجائے تو اس کی جوڑ پر صحابہ کی شان میں بھی تیار کرو۔ یہی بات مجھے پسند اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ اسی بات سے ابو تراب کی دلیل باطل ہوگی اور عثمان کے فضائل و مناقب مضبوط ہوں گے۔

ادھر کسی مقام پر خط پہنچا اور ادھر خیالات گردش کرنے لگے۔ روایتیں تیار ہونے لگیں۔ احادیث کی افراط ہوتے لگی کچھ صحابہ کی فضیلت میں تو کچھ علیؑ کی منقصت میں (دراں تمام اعمال کا آخری اور واقعی مقصد تھا)

---

۱ شرح نہج البلاغہ ج ۳ ص ۱۵ ۲ شرح نہج البلاغہ ج ۳ ص ۱۵

ہمیں ضرورت نہیں ہے کہ ہم ان روایات کی قدر و قیمت ظاہر کریں جو فضائل صحابہ میں وضع کی گئی ہیں۔ اور جن میں غلو جہالت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یا ان روایات کی حقیقت کا اعلان کریں جو حضرت علیؑ کی مخالفت میں وضع کی گئی ہیں اور جن میں بغض و عداوت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اس لیے میدانِ تنقید میں ان کی قدر و قیمت سب کو معلوم ہو چکی ہے۔ اس میدان میں ایسی روایتیں کیونکر ٹھہر سکتی ہیں جو ناجائز طور پر پیدا ہوئی ہیں یا جن کی بنیاد حق نمک کی دیوار پر ہے۔ ادھر ذرا سا پانی پہنچے گا ادھر ساری عمارت منہدم ہو جائیگی۔

اس کے باوجود سرکارِ حکومت اور معاویہ کا شوقِ تجارت وہ تھا جس نے اس بازار کو اس قدر رواج دے دیا کہ اب کسی متاع میں خسارہ کا اندیشہ نہ رہا اور کسی سرمایہ بے بناہ منفعت کے علاوہ کوئی اور احتمال ہی نہ رہا۔ اب یہ حدیثیں منبروں سے بیان اور مدرسوں میں پڑھائی جانے لگیں۔ اور بچوں کو اس طرح حفظ کرائی جانے لگیں جس طرح قرآن حفظ کرایا جاتا ہے۔ یا اس سے بھی کچھ زیادہ پُرزور طریقے پر۔

یہی وہ اسباب تھے جن کی بنا پر روایتیں عام ہوئیں، چار طرف ان کا رواج ہوا مختلف مقامات پر اُن کی شہرت ہوئی۔ دوسری طرف اس غیر محدود منفعت نے اثر دکھلایا جس سے صاحبِ کارخانہ اور درآمد برآمد کرنے والے سب ہی مفید ہوتے تھے یعنی روایت وضع کرنے والا بھی مستفید تھا۔ اور اس کا تعلیم دینے والا بھی اور اکھیں کے ساتھ تعلیم لینے والے بھی[1]!

اب تاجرِ اول معاویہ نے ایک نیا حکم جاری کیا۔

"دیکھو[2] جس کے متعلق شہادت و بیّنہ قائم ہو جائے کہ علیؑ و اہل بیتؑ کا دوست ہے اس کا نام رجسٹر سے کاٹ دو اور اس کا عطیہ و رزق بند کر دو۔"

---

[1] یہی سلسلہ آج تک جاری ہے۔ [2] شرح نہج البلاغہ

یہی چیلنج اور اقتصادی مار نہیں بلکہ ایک خط اور بھی جاتا ہے۔

"جو شخص محبتِ اہلبیت میں متہم بھی ہو جائے اس پر بھی سختیاں کرو اور اس کا گھر منہدم کرو"

اب محاصرہ اور بھی سخت تر ہو گیا۔ اب ایک ذرہ برابر محبت اہلبیتؑ والے انسان کی سزا یہ قرار پائی کہ اسے برائی اور سختی کا ہدف ونشانہ بنایا جائے۔ اس کا نام رجسٹر سے کاٹ دیا جائے، اس کا وظیفہ بند کر دیا جائے، اسے شہری حقوق نہ دیے جائیں، اس کی فکر وعقل ورائے پر پابندی لگا دی جائے۔ اور ان تمام باتوں کے علاوہ اُسے ذلیل وخوار اور اتنا خوف زدہ بنا دیا جائے کہ وہ ہر آن اپنے لیے عذاب، مصیبت یا انہدام خانہ کا منتظر رہے۔

معاویہ نے انھیں جفا کار اور عدل سوز احکام پر اکتفا نہیں کی بلکہ انکی تطبیق کی فکر بھی شروع کر دی چنانچہ عراق میں اپنے خود ساختہ بھائی زیاد کو والی بنا دیا تاکہ شیعوں پر مصائب کی شدت ہو جائے، اس لیے کہ زیاد ان لوگوں سے واقف، ان کے مکانات سے باخبر اور وہ اپنی گمراہی سے پہلے ان لوگوں سے قریب رہ چکا ہے[1]۔

---

[1] مجھے یہ تصور بھی نہ تھا کہ آج بیسویں صدی میں جبکہ اُس تاریک ماضی کے اثرات ختم ہو چکے ہیں ضمیر فروشی اور حق پوشی کے بازار سرد پڑ چکے ہیں کوئی ایسا شخص بھی پیدا ہوگا جس کی فطرت میں اُس ماضیٔ قدیم کے اثرات موجود ہوں گے اور اسے بھی معاشرہ کی فضا مسموم بنانے سے دلچسپی ہوگی۔ یقیناً مجھے یہ تصور نہ تھا لیکن افسوس "حسن سندوبی" کی ایک عبارت "البیان والتبیین" کی شرح میں زیاد کے حالات پر نظر پڑ گئی۔ فرماتے ہیں "زیاد کا علیؑ سے اعراض کر کے معاویہ سے مل جانا کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کی بنا پر اس کی عقل یا فضیلت پر حرف لایا جائے اس لیے کہ معاویہ نے اسے اپنا بھائی بنایا تھا اور رشتہ کی بات ہی اور ہوتی ہے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

معاویہ نے اس متاع کی خرید وفروخت میں بڑی ذہانت سے کام لیا اور کوئی ایسا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا جس میں اس کا کوئی ذاتی فائدہ ہو۔ رشوت، تقسیم مال ومنصب تو معمولی قیمتیں تھیں جن سے معاویہ اس بلیک مارکیٹ کے ضمیروں کو حمایت آسانی کے ساتھ ایک بڑی تعداد میں خرید رہا تھا۔ اس کے لیے یہ بات انتہائی آسان تھی کہ روزانہ ایک ضمیر خریدے، ایک ذمہ داری بیچے اور ایک باایمان کے ایمان کو تباہ وبرباد کرے۔

چونکہ ان تمام باتوں کا مقصد صرف ایک تھا اور وہ یہ کہ حضرت علیؑ کے منصب پر قابض ہونے کے لیے انھیں بدنام کیا جائے اس کے لیے ہر ممکن وسیلہ اختیار کیا جائے معاویہ سے قطعی بعید نہیں تھا کہ وہ ان اہل شام کے درمیان کہ جنھیں اونٹ اور اونٹنی کا فرق معلوم نہیں تھا یہ مشہور کردے کہ علیؑ تارک الصلوٰۃ ہیں۔ انھیں نے حضرت عثمان کو قتل کرایا ہے۔ لہٰذا اب سب کا فریضہ ہے کہ ان سے قصاص لیں"

معاویہ کو اس طغیان وسرکشی سے روکنے والی کوئی طاقت نہ تھی۔ نہ دین نہ اخلاق اور نہ انسانیت۔ چنانچہ اس نے اپنے کو مطلق العنان اور آزاد محض فرض کر کے اپنا کام شروع کر دیا، منکرات کی ایجاد اس تفنن سے شروع کی کہ کوئی مانع نہیں۔ خرافات و مہملات میں ڈوب گیا۔ کوئی روکنے والا نہیں، کذب وافترا کی انتہا کر دی کوئی منع کرنے والا نہیں

(بقیہ حاشیہ گزشتہ) کاش میرے پاس اس مہمل کلمہ کی تنقید کی گنجائش ہوتی تو میں بتاتا کہ اس میں کس قدر گمراہی، ضلالت، کذب، افترا اور اسلام کشی کے جراثیم پائے جاتے ہیں اور مرحوم نے ایک کلمہ سے اسلام کی مسلم تعلیم "بچہ صاحب فراش کا ہوتا ہے" کی مخالفت کی پھر ولد الزنا کو زانی سے ملحق کیا۔ اور امام وقت کی بغاوت کو معصیت شمار کرنے سے انکار کر دیا۔

بلکہ ایسے افعال واعمال کو عقل وفضیلت کے ارتقا کی دلیل قرار دیدیا۔ افسوس!

کس قدر فرق ہے سندوبی کے اس مہمل بیان میں اور جاحظ کی اس تنقید میں جس میں معاویہ کے اس فعل قبیح کو باحث کفر قرار دیا گیا ہے۔

باطل پر مخز و مباہات کا سلسلہ جاری کر دیا کسی کو غصہ بھی نہ آیا۔ سچ ہے :

اذا رزق الفتی وجہا وقاحا　　تقلب فی الامور کما یشاء

"جب انسان کی آنکھوں کا پانی مر جائے تو جو چاہے کرے سب ٹھیک ہے!"

میرے حیرت و استعجاب کی اس وقت کوئی حیثیت باقی نہ رہی جب میں نے اسی شرح کے ج ۲ ص ۱۸۳ پر سات سطروں کا وہ بیان دیکھا جس میں فاضل سندوبی نے متواتر احادیث مسلم الثبوت روایات اور صحاح مسلمہ میں مذکور اخبار کی مخالفت کرتے ہوئے فرقۂ اباضیہ کی موافقت فرمائی ہے۔ رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ خوارج دین سے اس طرح خارج ہوں گے جس طرح کمان سے تیر نکلتا ہے اور فاضل موصوف انھیں "افضل اہل قبلہ"، دشمن بدعت اور ان تمام اتہامات و افترائات سے بری قرار دیتے ہیں جنھیں بعض مسلمانوں نے ان کی طرف منسوب کیے ہیں۔

یہی نہیں بلکہ فرماتے ہیں "سابقاً میں بھی اس فرقہ کے دشمنوں کے بیانات سے فریب کھا گیا تھا اور اسی لیے بعض اتہامات جلد اول میں درج بھی کر دیے ہیں لیکن بعد میں یہ انکشاف ہوا کہ یہ لوگ تو بہترین مسلمان اور ہر مسئلے میں کتاب و سنت کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔ آپ جاحظ کی مذمت سے متاثر نہ ہوں اس لیے کہ سابقاً یہ فرقہ معتزلہ کا مخالف تھا اس لیے جاحظ نے یہ باتیں نقل کر دی ہیں۔ خدا تمام مسلمانوں سے خوش رہے جناب فاضل دین سے تیر کے مانند نکل جانیوالوں سے اس قدر خوش ہیں خدا جانے ان روایات کے بارے میں آنجناب کی کیا رائے ہے آخر یہ کیونکر ممکن ہے کہ اللہ تمام مسلمانوں سے خوش ہو جائے جبکہ ان کے درمیان وہ خوارج بھی داخل ہو گئے ہیں جو دین سے خارج ہیں۔ انھیں تو عام مسلمان علاوہ چند خارجی الفکر افراد کے اسی نظر سے دیکھتے ہیں جس نظر سے رسول اکرمؐ نے دیکھا ہے۔ ان کی نماز دل کو تماشا اور ان کی تلاوت

قرآن کو بفلقہ لسان تصور کرتے ہیں جیسا کہ آنحضرت نے فرمایا ہے۔ درحقیقت یہ خوارج اُن منافقین کی بڑی تصویریں ہیں جو اپنے اعمال سے رسولِ اسلام کو فریب دینے کی فکر میں تھے۔ یا اُن منافقین کی مکمل تصویریں ہیں جو سادہ لوح عوام کو دھوکے دیا کرتے تھے جیسا کہ ہمارے فاضل سندوبی کو دیدیا۔

ہمارا خیال ہے کہ یہ حضرت کچھ خارجی المسلک ہیں اس لیے کہ اس شرح میں جہاں بھی خوارج کا ذکر آتا ہے پورے حاشیہ میں مدح وثنا کے دفتر کھول دیتے ہیں، تعریف و توصیف کے پل باندھ دیتے ہیں۔ اور جب کسی شیعہ کا ذکر آتا ہے تو یا اعراض کر جاتے ہیں یا پھر نہایت درجہ اختصار سے کام لیتے ہیں، علاوہ ان بعض افراد کے جن کی شخصیت نے طولِ کلام پر خود ہی مجبور کر دیا ہو۔

یہ زیاد کی ہمدردی، خوارج کی محبت اور شیعوں سے عداوت ان تمام باتوں کا سرچشمہ صرف ایک ہے اور وہ ہے علیؑ[1] دشمنی اور یہ اسی تخمِ عداوت و بغاوت کا ثمر ہے جسے اپنے عہدِ حکومت میں معاویہ نے بویا تھا تاکہ امیر المومنینؑ کو اسلامی سلطنت سے الگ کر دے!

سمرہ بن جندب کو جو روایات کا ایک بڑا تاجر تھا معاویہ نے بلا کر ایک لاکھ درہم دیے

---

[1] شاید اس مقام پر یہ بات مناسب ہو کہ ہم آپ کے سامنے سمرہ کی ایک مختصر داستان پیش کر دیں۔

"مسند احمد بن حنبل ج ۱ ص ۲۵ میں ابن عباس سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر سے ذکر کیا گیا یا ان تک خبر پہنچی کہ سمرہ نے شراب بیچی ہے تو انھوں نے فرمایا کہ خدا سمرہ کا بُرا کرے پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ اللہ نے یہودیوں پر چربی حرام کی تھی لیکن انھوں نے اس کی بھی خرید و فروخت کی۔"

سمرہ کی تاریخ میں ایسے دردناک جرائم بھی ہیں جن سے سنگدل پتھروں کی آنکھوں سے آنسو نکل آئیں بصرہ میں زیاد نے اسے عامل بنا دیا تو اس نے آٹھ ہزار افراد کو تہ تیغ کر دیا کیا کہنا نائب اور منوب عنہ کا)

(بقیہ برصفحہ آئندہ)

کہ اس آیت شریفہ کو علیؑ کی شان میں نازل کر دے۔

"ومن الناس من یعجبک قولہ فی الحیات الدنیا ویشھد اللہ علی ما فی قلبہ وھو الد الخصام واذا تولی سعی فی الارض لیفسد فیھا ویھلک الحرث والنسل واللہ لایحب الفساد"۔¹

(بعض افراد ایسے ہیں جو رسولؐ سے باتیں ملاتے ہیں، خدا کو اپنا گواہ قرار دیتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ گزشتہ) اس تضاد کو دیکھیے اور حکام جور کی خونریزی کا اندازہ کیجیے جب ایک وقتی حاکم ۸ ہزار خون بہا سکتا ہے اور وہ بھی اس دیدہ دلیری کے ساتھ کہ جب زیاد نے محاسبہ کیا "کیا تو نے کسی بیگناہ کو قتل کیا ہے" تو جواب دیدیا کہ میں اتنے ہی اور قتل کر سکتا ہوں۔! گویا امت کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں ہے۔ اب تو یہ عالم ہے کہ سمرہ کی سواری گزرے اور راستہ میں جسے چاہے بیگناہ قتل کر دے۔ چنانچہ ایک مرتبہ اس کی سواری گزر رہی تھی کہ لشکر کے صف اول کے کسی آدمی نے ایک شخص کو زخمی کر دیا۔ وہ خون میں لوٹ رہا تھا کہ سمرہ قریب سے گزرا اس نے بغیر کسی درد و رنج کے اعلان کر دیا کہ جب ہماری سواری تیار ہو جائے تو ہمارے نیزوں سے بچو۔

سمرہ اس بیحیائی اور رذالت نفس کے بعد ان افراد میں کا ایک ہے جن کی نفسیات کا گہرا مطالعہ معاویہ نے کیا تھا اور یہ طے کر لیا تھا کہ یہ لوگ اس کی خواہش کو پورا کر سکتے ہیں اور اس کے ہوا و ہوس میں اس کے ہم سفر بن سکتے ہیں۔

چنانچہ خود سمرہ کہتا ہے کہ "اگر معاویہ کی طرح میں اللہ کی اطاعت کرتا تو کبھی مجھ پر عذاب نہ ہو سکتا" لیکن اس نے معصیت خدا کے ذریعہ معاویہ کی اطاعت کی تو اب عذاب الٰہی کا اندازہ کیجیے۔

ہم نے اس مقام پر نہایت ہی اختصار سے کام لیا ہے ورنہ اگر آپ سمرہ کے حالات زندگی کا جائزہ لینا چاہیں تو طبری ج ۴ ص ۱۷۶۔ کامل ج ۳ ص ۲۲۹، غدیر ج ۱۱ ص ۲۹-۳۰ کا مکمل مطالعہ کریں۔

¹ بقرہ ۲۰۴-۲۰۵

حالانکہ بڑے دشمن ہیں۔ ان کا مقصد تباہی و بربادی ہے اور یہ اللہ کو پسند نہیں ہے۔"

اور اس آیت مبارکہ کو ابن ملجم کی شان میں روایت کر دے:

ومن الناس من یشری نفسہ ابتغاء مرضات اللہ۔

"کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو رضائے الہی کی خاطر اپنے نفس کو بیچ ڈالتے ہیں۔"[1]

سمرہ نے خیال کیا کہ یہ معمولی رقم تو ایک آیت کی تحریف کیلئے بھی کافی نہیں ہے چہ جائیکہ دو دو آیتیں۔ چنانچہ اس نے بھاؤ تاؤ شروع کر دیا یہاں تک کہ دو آیتوں کا معاملہ ۴ لاکھ درہم پر طے ہو گیا۔ اور سمرہ نے یہ بیان دے دیا۔[2]

معاویہ کا مقصد یہ تھا کہ وہ ایک جماعت کو کرایہ پر لے لے جو حضرت علیؑ کی تنقیص کیلئے روایتیں وضع کرے۔ چنانچہ اس نے صحابہ اور تابعین کے ایک گروہ کا انتخاب کیا جو زمانہ کی نظر میں مقدس و محترم تھا۔ تاکہ اسی کو اپنی کمزور بنیادوں کا ستون قرار دے۔[3]

۱۔ سورۂ بقرہ ۲۰۷ ۲۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ص ۳۶۱۔ الغدیر ج ۱۱ ص ۱۰۲، ۱۳۰۔

۳۔ مجھے بار بار حیرت ہوتی ہے ایسے افراد کو دیکھ کر جو تمام صحابہ کی تقدیس و تنزیہ پر اس طرح مصر ہیں کہ کسی کے خلاف کچھ سننے کو تیار نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لوگ اپنے اس تصور کو قرآن و سنت کے ان فرامین کے ساتھ کس طرح جمع کرتے ہیں جنمیں عہد رسولؐ میں نفاق کے پھیل جانے کا تذکرہ ہے کم از کم آیۂ انقلاب، ذکر منافقین مدینہ، ذکر اعراب، سورۂ منافقون اور صحاح معتبرہ میں حدیث حوض کا تذکرہ تو موجود ہی ہے بلکہ اگر یہ سب نہ بھی ہوتا تو بھی ہم تمام کی تقدیس کیلئے تیار نہ تھے۔ ان کی جماعت میں معاویہ جیسے افراد بھی شامل ہیں جن کا مقصد ہی دین کی رسی کی گرہیں کھول دینا ہے چہ جائیکہ وہ صریح آیات و اخبار جو ان کے حالات کو واضح کر کے اُن سے ڈراتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان فرامین کا تعلق تمام صحابہ سے نہیں ہے اس لیے کہ انکے درمیان عدالت و حقانیت کی مثالیں اور تقدیس، اجلال کے مستحق بھی ہیں لیکن اسے کیا کیا جائے کہ یہی عمومی تقدیس اس سرد جنگ کا سنگ بنیاد تھی جو امام متقین اور بقول رسول اکرمؐ منافقین و مومنین کے درمیان حد فاصل علیؑ کے خلاف لڑی جا رہی تھیں۔

وہ گروہ جس نے معاویہ کے ساتھ یہ دُنیا کا مفید اور آخرت کا نقصان دہ معاملہ کیا اس میں ابوہریرہ، عمرو بن العاص، مغیرہ بن شعبہ[1] اور عروہ بن زبیر جیسے افراد تھے۔ چنانچہ ان لوگوں نے ایسی روایتیں وضع کرنا شروع کر دیں جن سے حضرت علیؑ کی توہین ہو اُن سے برأت کی جائے اور اس کے صلے میں معاویہ سے ایسے انعامات حاصل ہوں جو ابن ابی الحدید کی زبان میں قابلِ رغبت حد تک وافر و وافی ہوں۔

زہری کے بیان کے مطابق عروہ بن زبیر نے حضرت عائشہ سے یہ روایت نقل کی کہ آپ نے رسولِ اکرمؐ کے پاس بیٹھ کر علیؑ و عباس کو آتے ہوئے دیکھا تو آنحضرتؐ نے فرمایا اے عائشہ یہ دونوں ہمارے دین و ملت کے علاوہ دوسرے دین پر مرینگے۔

پھر دوسری روایت یہ وضع کی کہ حضرتؐ نے عائشہ سے فرمایا کہ اگر تم دو اہلِ جہنم کو دیکھنا چاہتی ہو تو ان دونوں کو دیکھو۔ آپ فرماتی ہیں کہ میں نے نظر اٹھائی تو دیکھا کہ علیؑ و عباس ہیں[2]۔

عمرو بن العاص نے متعدد روایتیں وضع کیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ ابوطالب کی اولاد میرے دوستوں میں نہیں ہے میرے دوستوں میں صرف خدا ہے اور صالح مومنین[3]۔

---

۱ شرح نہج البلاغہ ج ۱ ص ۳۵۸ مغیرہ کی شخصیت کے بارے میں ہماری کتاب نص و اجتہاد کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جسمیں ان کے اس شہرۂ آفاق کارنامہ کا ذکر کیا گیا ہے جسمیں حضرت عمر نے پوری پوری ہمدردی سے کام لیکر حد جاری ہونے سے بچا لیا تھا۔ یہ کتاب ادارہ مرکز حسینی جنت محل حسن منزل الہ آباد سے مل سکتی ہے۔

۲ شرح حدیدی ج ۱ ص ۳۵۸ ۳ شرح حدیدی ج ۱ ص ۳۵۸ ج ۳ ص ۱۵ صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۳۶ تھوڑے تغیر کیساتھ

۴ بعض ضمیر فروش مؤرخین کی خواہش ہے کہ اس سال کا نام عام الجماعہ رکھیں۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ابوجعفر اسکافی نے اعمش سے نقل کیا ہے کہ جب ابوہریرہ عام الجماعۃ میں معاویہ کے ساتھ عراق آیا تو مسجد کوفہ کے پاس پہنچ کر لوگوں کا استقبال دیکھ کر مدہوش ہوگیا گھٹنوں پر

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) حالانکہ یہ لفظ اس سال کی الٹی تعبیر ہے۔ معاویہ تخت سلطنت پر متمکن ہوا تو یہ تفرقہ و تنافر کا سال تھا۔ اسے اجتماع و اتحاد سے کیا تعلق۔

ان سطور کے لکھنے کے بعد ایک کتاب نظر سے گزری جس کا نام تھا "معاویہ ابن ابی سفیان فی المیزان" اس کتاب کے بعض اقتباسات جو عام الجماعہ سے متعلق ہیں نقل کیے ہیں۔ اگرچہ مؤلف نے کتاب میں اکثر مقامات پر ایسے خلاف واقع بیانات بھی دے دیے ہیں جن کی غلطی کو ہر ہاتھ لمس کر سکتا ہے اور ہر آنکھ دیکھ سکتی ہے لیکن ہمیں اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

مؤلف ص۶۶ پر لکھتے ہیں کہ "اگر اس سال کا صحیح تاریخی محاسبہ کیا جائے تو اس کا نام مفرق الجماعات ہوگا۔ لیکن تاریخ کے طالب علم کیلئے اعمال و رجال کے پرکھنے میں بڑی عبرت اس بات سے حاصل ہوگی کہ بعض مؤرخین اس سال کو عام الجماعۃ کہتے ہیں جبکہ اس میں تفریق امت کے سوا کچھ نہ تھا اور جب اس شدید تفریق پر یہ نام پڑ گیا ہے تو اگر کہیں واقعی اتحاد و اتفاق کی کوشش ہوتی تو کیا نام رکھا جاتا۔ اس تفرقہ کی متعدد مثالیں ذکر کرنے کے بعد ص۸۱ پر تحریر فرماتے ہیں۔ اس مؤرخ سے زیادہ جاہل اور گمراہ کوئی شخص نہیں جو سنہ ۴۱ھ کو عام الجماعۃ کہتا ہے اس لیے کہ یہ سال معاویہ کی مطلق العنان بادشاہت کا ہے اور اس سے زیادہ اختلافات و افتراقات کسی وقت بھی نہیں ہوئے تھے۔

اس کے بعد مؤلف نے معاویہ کے تفرقہ انداز اعمال کے کچھ نمونے اور بھی پیش کئے ہیں جن کی بنا پر اسلام کی وحدت ختم ہوگئی۔ اس کی بنیاد متزلزل ہوگئی اور مسلمان مختلف بلاؤں میں گرفتار ہوگئے۔

جاحظ نے اس مقام پر ایمان خریدے ہوئے قلموں کے مقابلے میں ایک بڑی قیمتی بات کہی ہے۔ جسے ہم پیش کرنا چاہتے ہیں۔ وہ بنی امیہ کے بارے میں اپنے رسالہ کے ص۲۹۳، ۲۹۴ پر لکھتے ہیں: "اس وقت معاویہ سریر سلطنت پر متمکن ہو کر انصار و مہاجرین اور باقی مسلمین کا حاکم مطلق بن گیا۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

زور دیکھ کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا" اے اہلِ عراق کیا تم خیال کرتے ہو کہ میں خدا اور رسول

(بقیہ حاشیہ) پھر اس سال کا نام عام الجماعۃ رکھ دیا گیا حالانکہ وہ سال اجتماع کا نہ تھا بلکہ سالِ افتراق و قہر و جبر و غلبہ تھا۔ یہی وہ سال تھا جب امامت کسرویت میں تبدیل ہو گئی۔ خلافت قیصری منصب بن گئی۔ پھر یہ سلسلہ یونہی جاری رہا، یہانتک کہ رسالت کے فیصلے کی کھلی ہوئی مخالفت کی گئی حکم الٰہی کا صاف صاف انکار کیا گیا، صاحبِ فراش و زانی کے احکام کو بھلا دیا گیا جبکہ تمام امت کا اجماع تھا کہ سمیہ ابوسفیان کی زوجہ نہ تھی بلکہ اس نے زنا کیا تھا جسکے بعد معاویہ فجار سے نکل کر کفار میں داخل ہو گیا۔

اگرچہ حجر بن عدی کا قتل کر دینا، عمرو بن عاص کو خراجِ مصر کھلا دینا، یزید پلید کی بیعت لینا، مالِ غنیمت پر آمرانہ تصرف کرنا، اپنی خواہش سے حکام متعین کرنا، سفارش و قرابت سے حدود الٰہیہ کا معطل کر دینا کفر کے مترادف نہیں ہیں مگر زنا زادہ کو بیٹا بنا لینا حدیث کی کھلی ہوئی مخالفت ہے اور مخالفِ حدیث مثلِ مخالفتِ کتاب کریم کفر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مخالفتِ کتاب کا عقاب زیادہ ہے اور مخالفتِ سنت کا کم۔

امتِ پیغمبر میں یہ پہلا کفر تھا اس کے بعد یہ سلسلہ خلافت میں جاری ہو گیا یہاں تک کہ بہت سے لوگ اس کی تکفیر سے پرہیز کر کے خود ہی کافر ہو گئے بلکہ ایک نئی منطق یہ نکال لی گئی کہ معاویہ صحابی ہے اور اس کو برا بھلا کہنا بدعت ہے اس سے عداوت رکھنا خلافِ سنت ہے۔ گویا کہ اس نظریہ کے مطابق منکرِ سنت سے برائت بھی خلافِ سنت ہے۔

ہم اسی نقل پر اکتفا کرتے ہیں اس سے معاویہ کے اعمال کا ایک پہلو تو واضح ہو جاتا ہے اب دوسرا پہلو بھی نظر میں لائیں جس میں اقدار کا انحطاط، حقائق کی بدنمائی، رونقِ حقانیت کی تباہی اور مفاہیم و موازین کا انقلاب ہے۔

اس قول کی اہمیت و قیمت اس لیے بھی زیادہ ہے کہ یہ جاحظ کی زبان سے صادر ہوا ہے۔

کے خلاف جھوٹ بول کر جہنم کا انتظام کر رہا ہوں[1]۔

"خدا کی قسم میں نے رسولِ اکرمؐ سے سنا ہے کہ ہر نبی کا ایک حرم ہوتا ہے اور میرا حرم مدینہ ہے۔ عیر سے ثور تک[2]۔ اب جو شخص بھی مدینہ میں کوئی بدعت ایجاد کرے گا اس پر خدا و ملائکہ و انسان سب کی لعنت ہوگی۔ اب میں خدا کو حاضر و ناظر سمجھ کر کہتا ہوں کہ علیؑ نے حرم رسول میں بدعت ایجاد کی ہے" جب معاویہ کو اس روایت کی خبر ملی تو کثیر معاوضہ دے کر مدینہ کی ولایت بھی اس کے حوالے کر دی۔

حریز بن عثمان کا وقت وفات قریب آیا تو علیؑ کا تذکرہ کر کے آخری کلمات میں کہنے لگا۔ یہی وہ شخص ہے جس نے حرم رسول کو بدنام کیا ہے[3]۔ ظاہر ہے کہ اس حریز سے یہ کلام عجیب نہیں ہے اس لیے کہ اس نے یہ روایت بھی کی ہے کہ "نبی اکرمؐ نے وقت وفات علیؑ کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا تھا[4]۔

کیوں؟ کیا علیؑ نعوذ باللہ چور تھے جیسا کہ ولید بن عبدالملک نے اعلان کیا تھا لعنۃ اللہ کان لصؐ بن لصؐ لعنت کو زیر دیا اور لص کو پیش۔ لوگ تعجب سے پکار اٹھے ارے

۱: خدا جانے دل میں کونسا چور تھا!

۲: ابن ابی الحدید نے ج ۱ صنہ ۳۶ پر اس افترا کو نقل کرنے کے بعد کہا ہے کہ یہ لفظ ثور غلط ہے، اصل کلام عیر سے احد تک ہے اس کے بعد بیان کیا ہے کہ ابوہریرہ کا یہ قول غلط ہے۔ علیؑ ایک مرد متقی تھے انھوں نے عثمان کی اسی طرح کمک کی ہے جس طرح جعفر کی کمک کرتے اگر وہ گرفتار ہو جاتے۔

۳ و ۴: شرح النہج ج ۱ صنہ ۳۶ الغدیر ج ۱ صنہ ۲ پر حریز کے بہت سے قبیح افعال کا تذکرہ موجود ہے۔ لیکن ہمیں ان کے تذکرہ کی ضرورت نہیں ہے جبکہ یہ معلوم ہے کہ یہ شخص حضرت علیؑ پر ستر لعنتیں کیا کرتا تھا الغدیر ج ۵ صنہ ۲۵ ج ۱۱ صنہ ۸ اور نہ اس کے بیان کی ضرورت ہے کہ امام حاکم نے اسے ناصبی قرار دیا ہے الغدیر ج ۱۱ صنہ ۸ بلکہ یہ صرف کہنا ہے کہ یہ بخاری کا معتبر راوی ہے۔ افسوس!

یہ لیاقت اور یہ افترا، خدا جانے کونسی چیز زیادہ تعجب خیز ہے!

معاویہ اس ذلیل ترین مقابلے کی آگ روشن کرنے کیلئے اموالِ اسلام و مسلمین کو غصب کر کے اس کا ایندھن مہیا کرتا تھا۔ چنانچہ ایک طرف یہ جنگ جاری رہتی تھی اور دوسری طرف اسی مال سے ان لوگوں کو جائزے تقسیم ہوتے تھے جو فضائل میں کوئی حدیث وضع کریں یا مناقبِ علیؑ کے روایات پر پردہ ڈالیں یا کسی آیت کے معنی میں تحریف کر کے اس کی شانِ نزول کو بدل دیں۔

اسی کے ساتھ ساتھ ایک دوسری سرد جنگ بھی جاری تھی جس کا شعار یہ تھا کہ جس کے

۱: شرح النہج ج ۱ ص۳۶۵ جاحظ نے البیان والتبیین کے ج ۲ ص۲۰۹ پر یہ روایت نقل کر کے ولید پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس نے لص کے لام پر پیش دیا ہے اور یہ ایک واضح جہالت ہے حالانکہ یہ اعتراض غلط ہے۔ یہ پیش علمائے لغت کی نظر میں جائز ہے اصل اعتراض وہ ہے جو ہم نے نقل کیا ہے۔ جاحظ کے کلام کا سیاق و سباق بتا رہا ہے کہ ان بیانات میں اس کا مقصود ولید ہے لیکن سندوبی نے اس کی شرح میں اس واقعہ کو یزید بن ابی مسلم کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ ہمارا شاہد یہ ہے کہ جاحظ نے اس سے پہلے اور اس کے بعد ولید ہی کی غلطیوں کا تذکرہ کیا ہے اور اسی کی جہالت کو آشکار کیا ہے یہاں تک کہ اس کے باپ نے کہہ دیا "میرے لڑکے کو میری محبت نے مار دیا میں نے دیہاتوں میں نہ جانے دیا کہ زبان سیکھ لیتا"۔ سندوبی نے ہر ہر نقطہ پر ولید کی حمایت کرتے ہوئے یہاں پر بھی یہ کہہ دیا کہ لڑکے سے مراد ولید یا محمد دو میں سے ایک بھائی ہے۔

اب اس کے بعد واضح ہو گیا کہ حضرت علیؑ پر تہمت و افترا کو ولید سے یزید کی طرف سے کیوں موڑ دیا گیا اور اس کی غرض و غایت کیا ہے؟ ہماری نظر میں تو یہ تمام باتیں ہمارے اس نظریے کی دلیل ہیں جو ہم سابق میں سندوبی کے بارے میں قائم کر چکے ہیں۔

دل میں علیؑ کی محبت ہو یا زبان پر ان کا ذکر خیر ہو اسے فوراً گرفتار کر لیا جائے۔ اس کے بعد یا تو برارت یا بیرحمی سے قتل۔

چنانچہ حجر بن عدی وغیرہ نے اس میدان میں قربانی کی وہ مثالیں پیش کی ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ راسخ ایمان اور پختہ عقیدہ کو زمانہ کی تیز و تند ہوائیں یا باطل کی خونریز تلواریں متزلزل نہیں کر سکتیں۔

تخت سلطنت پر متمکن ہوتے اور خلافت اسلامیہ کے قیصریت میں بدل دینے کے بعد بھی معاویہ کی سرکشی اسی پر موقوف نہیں ہوئی کہ سب علیؑ کا سلسلہ صرف اپنے ہی دور حکومت تک جاری رکھتا بلکہ اس نے چاہا کہ یہ بدعت باقی رہ جائے تاکہ زمانۂ تاریخ کے اوراق کو ان بدعتوں سے سیاہ کرتا رہے۔

کہا جاتا ہے کہ امویین کی ایک جماعت نے معاویہ سے کہا کہ اب تو تجھے اپنا مدعا حاصل ہو گیا ہے اب اس مرد پر لعنت کا سلسلہ بند کر دے تو اس نے جواب دیا کہ ہرگز نہیں یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا کہ بچے بڑے ہو جائیں اور بڑے بڈھے ہو جائیں اور کوئی علیؑ کا ذکر خیر کرنیوالا باقی نہ رہے[1]۔

معاویہ نے اپنے طغیان کا سلسلہ صرف علیؑ کی ذات تک محدود نہیں رکھا بلکہ آگے بڑھ کر اس سیلاب میں ذات رسولؐ کو بھی لپیٹ لیا۔ چنانچہ مطرف بن مغیرہ بن شعبہ کا بیان ہے کہ میں اپنے باپ مغیرہ کے ساتھ معاویہ کے پاس گیا۔ اس کے پہلے میرا باپ برابر وہاں جایا کرتا تھا۔ اور واپس آکر مجھ سے معاویہ کی ذہانت و ذکاوت کے تذکرے کیا کرتا تھا ایک دن جب وہ رات کی نشست سے واپس آیا تو کھانا نہیں کھایا، بلکہ مغموم رہا۔

---

[1] شرح حدیدی ص۲۵۶، الغدیر ص۱۰۲ (جاحظ سے نقل کرتے ہوئے) الغدیر جلد ۱۱ میں ص۲۵ سے ص۲۸ تک معاویہ کے ان مظالم کا مفصل تذکرہ موجود ہے۔

میں نے خیال کیا کہ میرے اعمال میں شاید کوئی چیز ناپسند خاطر ہو گئی۔ میں نے عرض کی آخر آپ مغموم کیوں ہیں؟ کہنے لگے کہ میں خبیث ترین اور کافر ترین انسان کے پاس سے آرہا ہوں۔ میں نے کہا آخر قصہ کیا ہے؟ کہنے لگے کہ میں نے تنہائی میں معاویہ سے کہا کہ اب تو حکومت مل گئی ہے اب کچھ انصاف اور خیر سے کام لو اب تم کبیر السن بھی ہو گئے ہو اب تو بنی ہاشم کے ساتھ صلہ رحم کرو اب ان بیچاروں میں خوف کھانے کی کوئی طاقت نہیں رہی۔

تو اس نے جواب دیا افسوس ایک تیمی نے ان مسلمانوں پر حکومت کی، انصاف کیا لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ مرتے ہی سب اسے ابوبکر کہنے لگے۔ اس کے بعد عدی نے حکومت کی دس سال تک زحمتیں برداشت کیں لیکن مرتے ہی وہ عمر ہو گیا۔ اس کے بعد بھائی عثمان کو حکومت ملی ایسا شریف النسب انسان لیکن اسے یوں قتل کر دیا گیا کہ اب اس کے خدمات کا تذکرہ ہی نہیں رہا بس اس کے عیوب کا ذکر باقی ہے۔

ذرا دیکھو تو یہ بنی ہاشم روزانہ پانچ مرتبہ اشہد ان محمداً رسول اللہ کہتے ہیں۔ اس کے بعد سوائے اس کے کیا چارہ ہے کہ اس شہادت کو دفنا دیا جائے[1]

بھلا اس گفتگو کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی، یہ بدبخت جو اسلام کا خلیفہ اور مسلمانوں کا حاکم بنا ہوا ہے، ان کے حقوق پر تصرف کرتا ہے اور پھر ذکر رسول اس کے دل میں تیر کی طرح چبھ رہا ہے کہ اسے نیند تک نہیں آتی۔

ہم اس شخص کے بارے میں کیا کہیں جس نے مغیرہ جیسے بدکار انسان کو ایسا بد حواس بنا دیا کہ چہرے کے خطوط سے لڑکے نے پریشانی کا احساس کر لیا اور یہ تصور کر لیا کہ شاید ہم سے کوئی خطا ہو گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب مغیرہ جیسے افراد کفر کا احساس کریں اور یہ سمجھ

۱: صلح حسن ص ۲۲ مروج الذہب ج ۲ ص ۳۴۲ شرح النہج ج ۲ ص ۳۰۷ قدرے اختلاف کے ساتھ الغدیر ج ۱۰ ص ۲۸۳، ۲۸۴ ۔ دعوت خیر ی ج ۱ ص ۲۷۳، ۳۱۲ ؛

لیں کہ یہ شخص رسول اکرمؐ کی توہین پر تلا ہوا ہے تو پھر دوسروں کا کیا ذکر ہے مثل مشہور ہے اس کے کفر میں کیا کلام کہ جیسے نمرود کافر ہے ۔

ہمیں اس امر کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ہم معاویہ کے اُن تمام اقوال وافعال کی فہرست پیش کریں جن میں اس نے اپنے کفر کا اظہار کیا ہے اور رسول اکرمؐ کی صریحی مخالفت کی ہے ۔ اسلام قول وعمل اور عقیدہ کا نام ہے اور معاویہ نے ہر پہلو سے آنحضرتؐ سے معارضہ کیا ۔ اس کے بعد اس کے کفر میں کیا شک ہو سکتا ہے !

ہم ان تفصیلات میں پڑجائیں تو کتاب اپنے موضوع سے خارج ہوجائیگی اس لیے ناظرین کرام کو الغدیر جلد عاشر کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دیتے ہیں ۔ اس کتاب میں ان تمام اطراف وجوانب سے مکمل ومفصل بحث کی گئی ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ معاویہ اپنے قصدی عناد، رسما، اصرار، تکلیف دہ تعدی اور مسخرہ پن سے رسول اکرمؐ کی مسلسل مخالفت کرتا تھا اور ان تمام باتوں کا باعث وہ حسد وکینہ وشرک اور وہ عداوت و دُنیا پرستی وخود غرضی تھی جو اپنے خاندان سے میراث میں ملی تھی ۔

یہ تاریک دَور گزرنے لگا کہ اس کے بعد ایک ایسا دور آئے جو اس سے زیادہ سیاہ، تاریک اور ظلمت خیز ہو جسمیں اس وقت تک تاریکیاں بڑھتی رہیں جب تک کہ نور فجر آنکھوں سے یہ سیاہ پردے نہ اٹھاتے ۔

اب وہ دَور آگیا جس میں سبّ علیؑ کو سنّت قرار دیدیا گیا ۔ خواہشات نے دل کی گہرائیوں میں جگہ کرکے اس طریقۂ کار کو وسیع تر بنایا ۔ اب اگر خطیب لعنت کرنا بھول جائے تو چار طرف سے آوازیں بلند ہوجائیں سنّت ، سنّت ! تاکہ اسے احساس ہوجائے کہ کسی غلطی کا ارتکاب کیا ہے اور کسی سنّت کو ترک کیا ہے ۔ ؟

معاویہ نے ہر اموی النسب یا اموی الخیال شخص کے دل میں یہ کلمہ اس طرح اتار دیا تھا کہ ہر خطیب خطبہ جمعہ کا اختتام ان کلمات سے کرتا تھا! :-

"خداوندا! ابوتراب نے تیرے دین میں الحاد کیا ہے، تیرے راستے سے لوگوں کو روکا ہے لہٰذا اس پر بدترین لعنت اور سخت ترین عذاب نازل کر" (معاذ اللہ)

یہ طریقہ دلوں اور زبانوں سے اس وقت تک محو نہ ہو سکا جب تک کہ عمر بن عبدالعزیز کو خلافت نہ ملی لیکن اس تک خلافت پہنچنے سے پہلے ہی ایسے بدترین حالات رونما ہوئے جنھوں نے اوراقِ تاریخ کو سیاہ اور جبینِ انسانیت کو عرق آلود کر دیا۔ تاریخ کا رخ بدل گیا اور حق کی شادابی ختم ہو گئی۔ اس سلسلے میں حجاج غدار و سرکش کو جو معاویہ کا شاگرد اکبر تھا (سیرت و کردار کے اعتبار سے) اس کا وہ قابلِ فراموش نہیں ہے وہ دور جس میں معاویہ کے مظالم کی بنیادیں مضبوط کی جا رہی تھیں بلکہ اس بلند ترین عمارت میں مزید خشتوں کا اضافہ کیا جا رہا تھا شیعوں کے سروں پر ظلم و جور کی تلواریں علم ہو چکی تھیں معمولی معمولی تہمتوں اور خیالوں پر خون بہائے جا رہے تھے۔

یہ حضرت علیؑ کی اس بددعا کا اثر تھا جو آپ نے اہلِ عراق سے عاجز آکر فرمائی تھی آپ نے ان کی بیوفائی کو اس حد پر پایا کہ معاویہ کو دس آدمی دیکر ایک آدمی لینے پر آمادہ ہو گئے تو عرض کی خداوندا ان پر بنی ثقیف کے اس لڑکے کو مسلط کر دے جو ان کو ان کی حرکتوں کا مزا چکھائے۔

حجاج ایک انتہائی انتقام پسند آدمی تھا، اس نے اپنے ضمیر کی پستی اور حسد و کینہ و عداوت کی آگ کو بجھانے کیلئے بالکل معاویہ کے طریقے پر حضرت علیؑ پر لعنت کرنا شروع کی اور دوسروں کو بھی لعنت کرنے کا حکم دے دیا!

۱: شرح النہج ج ۱ ص ۳۵۶، الغدیر ج ۲ ص ۱۰۲ ج ۱ ص ۲۹ - الدعوة ج ۱ ص ۱۵۵،

ایک دن حجاج کہیں جا رہا تھا راستہ میں ایک شخص سے ملاقات کی اور کہنے لگا۔ اے امیر! میرے بزرگوں نے مجھ پر ظلم کیا ہے کہ میرا نام علی رکھ دیا ہے۔ میں فقیر ہوں آپ کے رحم وکرم کا محتاج ہوں، یہ سن کر حجاج کے دل میں بغض و حسد کی آگ سلگنے لگی تھوڑی دیر کے بعد دلی جذبات نے یہ اثر ظاہر کیا کہ اس شخص کا نام بدل کر اپنا مقرب بارگاہ بنا لیا[1]۔

عبداللہ بن ہانی جو حجاج کا شریک عمل تھا ایک مرتبہ حجاج نے اس سے پوچھا کہ ان زحمات کے صلے میں سردار فرازہ اسماء بن خارجہ اور رئیس الیمانیہ سعید بن قیس ہمدانی کی لڑکیاں دلوا دے۔ ان دونوں نے عقد سے انکار کر دیا تو ایک کے لیے تازیانہ کا انتظام اور دوسرے کے لیے تلوار کا۔ یہ دیکھتے ہی دونوں نے قبول کر لیا اور اس طرح عقد تمام ہو گیا۔

امیر المسلمین کے ہاتھ سے اسلامی احکام یونہی جاری ہوتے ہیں۔

حجاج نے عبداللہ پر یہ احسان رکھنا شروع کیا کہ میں نے ان زحمتوں سے تمھیں یہ لڑکیاں دلوائی ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ میرے فضائل تو ایسے ہیں جن کا عرب میں کوئی جواب ہی نہیں ہے۔

حجاج نے پوچھا وہ کیا؟

جواب دیا وہ یہ ہے کہ ہماری کسی محفل میں عبدالملک کو برا نہیں کہا گیا۔

حجاج بولا بیشک یہ فضیلت ہے۔

پھر عبداللہ نے کہا کہ ہمارے قبیلے کے ستر افراد صفین میں معاویہ کے ساتھ تھے اور علیؑ کے ساتھ صرف ایک آدمی تھا اور وہ بدترین آدمی تھا۔

حجاج بول اٹھا خدا کی قسم یہ فضیلت ہے۔

۱: شرح النہج ج ۱ ص ۳۵۶ ج ۳ ص ۱۶۔

عبداللہ نے کہا کہ ہمارے جس آدمی سے بھی ابوتراب پر سب و شتم کرنے کے لیے کہا گیا اس نے قبول کر لیا اور اس پر عمل کیا۔ بلکہ ابوتراب کے ساتھ حسنؑ و حسینؑ اور ان کی ماں فاطمہؑ کا بھی اضافہ کر دیا۔

حجاج بول اٹھا، واللہ یہ فضیلت ہے!

عبداللہ نے کہا کہ پورے عالم عرب میں ہمارے برابر کوئی حسین و ملیح نہیں ہے۔

چونکہ عبداللہ نہایت بدصورت اور کریہہ المنظر تھا۔ جلد سخت، چہرہ داغدار، سر بڑا منہ ٹیڑھا، صورت خراب۔ اس لیے حجاج نے کہا کہ اب اس حسن و جمال کا تذکرہ نہ کرو!

(ان صفات سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا بندروں سے کوئی ربط تھا)۔ مترجم

معاویہ نے سب و شتم علیؑ کو ایسی بدعت بنا کر جسمیں بچے جوان اور جوان بوڑھے ہو جائیں اپنی خواہش کو پورا کر لیا لیکن حقؑ کی جوہریت کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکا اس لیے کہ پروردگار عالم اپنے نور کو مکمل کرنے کا مصمم ارادہ کر چکا ہے۔

معاویہ کا دور گزرا تو اخلاف میں شرارت کو اور بھی عروج ملا۔ پستی ضمیر نے شرارت کے نئے نئے ڈھنگ سکھانا شروع کر دیے۔ اب ہشام کی طرف سے عراق کا امیر خالد بن عبداللہ قسری منبر پر جاتا ہے اور کہتا ہے:

"خدایا اس علی پر لعنت کر جو ابو طالب بن عبدالمطلب بن ہاشم کے فرزند، رسول اللہؐ کے داماد، فاطمہؑ کے شوہر اور حسنؑ و حسینؑ کے باپ ہیں"۔

نشۂ دولت و امارت میں سرشار خطیب ایسے کلمات استعمال کرتا ہے جن میں کسی تاویل کی گنجائش ہی نہ ہو۔ نہ پردہ نہ استعارہ نہ کنیت نہ کنایہ اس کے بعد بھی قوم سے سوال

۱۔ شرح النہج ج ۱ ص ۳۵۷ الدعوۃ ج ۱ ص ۲۱

کرتا ہے کوئی کنایہ تو نہیں ہوا[1]

اس کے بعد ایک درجہ اور آگے بڑھا اور معاویہ کے نقشے کو بروئے کار لانے کیلئے رسول اکرمؐ کی شان میں جسارت کرنے لگا، کیوں نہ ہو سب اسی خبیث سرزمین کے پروردہ یافتہ ہیں جس میں شجرۂ ملعونہ کی نشوونما ہوئی ہے۔

خطبۂ جمعہ میں حضرت علیؑ پر سب وشتم کرنے کے بعد کہتا ہے "خدا کی قسم رسولؐ کو علیؑ کی حالت معلوم تھی لیکن وہ ان کو اس لیے بڑھانا چاہتے تھے کہ یہ ان کے داماد تھے"

خطبۂ جمعہ کے ذریعے تقرب الٰہی کا وسیلہ یہ ہے کہ رسالت کی پاکیزگی، نبوت کی طہارت کی توہین کر کے رسولؐ کو خواہش پرست، مخالفِ حق اور جذباتی انسان ثابت کیا جائے۔

سعید بن مسیب جس کی علیؑ دشمنی معروف ہے وہ بھی اس خطبہ میں شریک تھا۔ خالد کے یہ کلمات سن کر چونک اٹھا گھبرا کر کہنے لگا۔ ارے خدا۔ اسے سمجھے اس خبیث نے اس نے یہ کیا کہا۔ میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ قبرِ رسولؐ شگافتہ ہو رہی ہے اور آپ فرما رہے ہیں غلط کہتا ہے اے دشمنِ خدا![2]

ایسے ہی قبیح افعال اور ذلیل اسلوب سے حق کا مقابلہ کیا گیا جس میں نہ اخلاق کا کوئی عنصر تھا اور نہ انسانیت کی کوئی آبرو، لیکن اس کے باوجود طماع طبیعتیں خوش نہ ہو سکیں اور انھیں چین سے بیٹھنے کا موقع نہ مل سکا (یہ اور بات ہے کہ جہنم میں بیٹھنے کا ٹھکانہ بن گیا) یہ اعمال وہ ہیں جن سے تاریخ کے صفحات سیاہ اور جن کے شمار سے قلمکار کا قلم عاجز ہے۔

۱: نہج ج ۱ ص۳۵۶ کامل مبرد ج ۲ ص۲۶۳ ۲۲۸ (قدرے شائستہ الفاظ کے ساتھ)

۲: اعیان الشیعہ ج ۳۵ ص۷

دردناک اور غم انگیز بات یہ ہے کہ ان بدترین افعال کا ارتکاب ان عظیم شخصیتوں سے ہوا ہے جن کو تاریخ اسلام میں خلیفۂ رسول اور امیر المومنین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے جبکہ ان میں طلیق، منافق، چور، زانی، ظالم، شراب خور، فاسق، فاجر کے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔ معاویہ منافق، یزید شراب خوار اور مروان وغیرہ سے ہوتی ہوئی یہ اسلامی خلافت عبدالملک یزید اور مروان تک پہنچ گئی۔

مزید لطف یہ ہے کہ ان تمام جعلی اقوال، وضعی احادیث، تحریفی کلمات اور خواہشاتی تفاسیر کا سرچشمہ وہ لبہاتے مجلس ہیں جو ان تمام باتوں کو رسول اکرم کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

ہم جب ان احادیث و اقوال کے افترا پردازوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اصحاب رسول کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے۔ جہاں صحابیت کی مستحکم دیوار ہے اور اس کی آڑ میں اپنی خباثت و رذالت کی پردہ پوشی کی ہے۔

اب اگر کوئی اس دیوار کا جائزہ لینا چاہے یا اس پردہ کو چاک کرنا چاہے تو وہ اس بلیک مارکیٹ کی اصطلاح میں حق کا مخالف، صحابہ کا دشمن اور بزرگوں کا حاسد شمار کیا جائیگا۔ اس لیے کہ ان کے چہرے پر صحابیت کی نقاب پڑی ہے یہ اور بات ہے کہ ان حضرات نے خود ہی اپنے کو انسانیت کے درجہ سے گرا کر اپنے قصر فضائل کو ڈھا دیا ہے۔ اس کی بنیادوں کو مسمار کر کے اپنی خیانتوں اور جنایتوں کے پردہ کو چاک کر دیا ہے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ رقیبوں کی آنکھیں سو رہی ہیں یا ان پر غفلت کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔

یہ لوگ برابر اپنے عمل میں مشغول تھے، روایات وضع کر کے اس کے عوض میں وہ مال عذاب امت جمع کر رہے تھے جو ان کی قبروں کو آتشکدہ بنا سکے اور جس سے ان کی پیشانی اور ان کے پہلو داغے جا سکیں۔

یہ اموال کثیرہ ان مجرم ہاتھوں سے لیتے تھے جو اپنی سلطنت اور اپنے اقتدار کے تحفظ کی خاطر ہر گراں اور ارزاں کو قربان کر سکتے تھے۔ ان کا مقصود اصلی دوام سلطنت تھا

ان کی منطق میں حصولِ مقصد کیلئے ہر وسیلے کا اختیار کیا جانا جائز تھا۔

لطف یہ ہے کہ یہ لوگ خلفاء المسلمین اور امراء المومنین بھی تھے۔ امت گمراہی کے گڑھے میں گر رہی تھی، زندہ ضمیروں کو پامال کیا جا رہا تھا۔ عدالت کا متنجز، حق کی مخالفت افترا پردازی، حرامخوری، کذب و بہتان سب شعار بن چکے تھے۔ اور اس طرح اقتدار کی پیاس بجھائی جا رہی تھی۔

یہ تھا بعض صحابہ کرام کا کردار، جھوٹ بولیں، روایتیں گھڑیں، افترا پردازی کریں اور اس کے عوض میں چند چھینے ہوئے دینار، لوٹے ہوئے درہم رشوت کے طور پر لے لیں عطا کرنیوالا بھی انتہائی سخی، اس کی سلطنت رہ جائے چاہے ساری امت کا مال کام آجائے سب ذلیل ہو جائیں سب ننگے ہو جائیں صرف اپنا تاج و تخت باقی رہ جائے۔ خونریزی، حق تلفی، توہین و تذلیل، ظلم و جور، منکرات و محرمات اور امت کے فقر و فاقہ کو ان مظالم کے تتمہ میں شمار کیجئے۔ یہ اس عہدِ ظلم کا فطری نتیجہ تھا کہ جس کا حاکم معاویہ جیسا انسان ہو اور جس کی تاریخ اتنی سیاہ و تاریک ہو

اپنے بہیمانہ خواہشات اور سیاہ اغراض و مقاصد کی تکمیل کیلئے مختلف فسادات اور دسیسہ کاریاں کر کے یہ بزرگ دنیا سے چل بسے تاکہ اس کے بعد ایک دوسری نسل آئے اور وہ ان کے بیانات کو سنے اور انھیں حق سمجھ کر قبول کرے۔

کاش یہ آنے والے لوگ کچھ فکر کرتے، دقت نظر سے کام لیتے بحث و تمحیص کرتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ یہ بیانات صرف اس قابل ہیں کہ انھیں کسی زمین میں دفنا دیا جائے۔ اور یہ آئندہ کی فضا کو متعفن نہ کر سکیں۔ اور ان سے دین کا پرنور چہرہ داغدار نہ ہو سکے۔

اسی نسل میں ایسے افراد بھی پیدا ہوئے جن کی افترا پردازی محدود نہ ہو سکی۔

آزادی کے ساتھ گمراہیوں میں پلتے رہے۔ نہ دین کی نگرانی کا خیال تھا اور نہ ضمیر کے محاسبہ کا تصور نہ حق کی روک تھام تھی اور نہ عقاب الٰہی کا خوف و خیال!

میرا خیال یہ تھا کہ اس قسم کے افترا و بہتان کا زیادہ حصہ معاویہ اور اس کے شجرۂ ملعونہ کے برگ و بار سے مربوط ہوگا۔ یا پھر ان لوگوں سے متعلق ہوگا جو اس کے وظیفہ خوار یا کرایہ دار رہے ہوں۔ مجھے یہ تصور بھی نہ تھا کہ اس افترا پردازی میں سیوطی کا بھی ہاتھ ہوگا۔ اور وہ بھی یا ایہا الذین امنوا لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ حتیٰ تعلموا ما تقولون[1] (اے اہل ایمان حالت مستی میں نماز کے قریب نہ جاؤ جب تک کہ تمہیں ہوش نہ آجائے) کو حضرت علیؑ کی طرف منسوب کر دیں گے اور وہ بھی اس طرح کہ خود حضرت ہی نے فرمایا ہے کہ ایک روز عبدالرحمٰن بن عوف نے ہماری دعوت کی اور اس میں شراب پلادی۔ شراب کا خمار زیادہ ہوگیا اور لوگوں نے مجھے نماز کیلئے کھڑا کر دیا۔ میں نے آیت یوں پڑھ دی قل یا ایہا الکفرون لا اعبد ما تعبدون ونحن نعبد ما تعبدون[2]۔ تو یہ آیت نازل ہوگئی۔

میں سیوطی سے نہ روایت کی سند پر بحث کرنا چاہتا ہوں اور نہ اس کے تناقص پر اور نہ ہی پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس میں علیؑ کا نام کہاں سے آگیا۔ جب کہ اس آیت کے سلسلے کی اکثر روایتیں بے نام کی ہیں اور بعض میں دیگر صحابہ کا نام ہے۔

میں تو صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ یہ روایت قرآن مجید اور احادیث نبویہ سے کس طرح مخالفت رکھتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ شراب پینا اس تطہیر کے بالکل متضاد ہے جس میں علیؑ کا داخل ہونا قابلِ شک و انکار نہیں ہے جس طرح یہ فعل حرام ہے رسولِ

۱: النساء آیت ۴۳   ۲: اسباب النزول ص۶۳

اکرمؐ کا نفس ہونے سے بالکل متناقض ہے جیسے آیت مباہلہ نے بیان کیا ہے۔ اس لیے کہ اس بنیاد پر یہی نسبت یعنی رسولِ اکرمؐ کی طرف بھی ہوجائیگی۔

اس کے علاوہ یہ روایت سارے مسلمانوں کے اس اجماع سے بھی مخالف ہے جس میں اعتراف کیا گیا ہے کہ حضرت علیؑ نے ایک لمحہ کے واسطے بھی کفر و شرک نہیں اختیار کیا جس کے بعد یہ ناممکن ہے کہ "معاذ اللہ" آپ نماز میں کافروں سے خطاب کرکے یہ کہہ دیں کہ میں تمھارے خداؤں کی عبادت کرتا ہوں۔

ہم اس قسم کے ذلیل اور پست بیانات پر تفصیلی بحث نہیں کرنا چاہتے ہمارا مقصود تو صرف دور سے ایک اشارہ ہے تاکہ نکتہ رس حضرات بات کی حقیقت تک پہنچ جائیں۔ البتہ اس مقام پر یہ بتا دینا انتہائی ضروری ہے کہ بعض مفسرین نے اس آیت کے ذیل میں شراب پینے والوں میں بعض صحابہ کا ذکر کیا ہے جن کے عیب کو چھپانے کے لیے یہ کوشش کی گئی ہے کہ ان کی جگہ پر حضرت علیؑ کا نام لکھ دیا جائے شاید اس ناکام کوشش کرنے والے کو یہ خبر نہیں تھی کہ یہ افترا نفسِ رسول سے ذاتِ رسولؐ تک پہنچ جائیگا۔ علاوہ اس کے کہ بعض مفسرین کی نظر میں اس مقام پر نشہ سے مراد شراب کا نشہ نہیں بلکہ نیند کا خمار ہے۔[1]

جب ہم اس نسل کے ان خرافات کا جائزہ لیتے ہیں جن سے اختلاف و افتراق کی خلیج بے حد وسیع ہوگئی ہے اور جن کا تعلق نہ حق و صداقت سے ہے اور نہ حسن نیت سے۔ تو ہمیں غزالی کا وہ جواب نظر آتا ہے جو انھوں نے اس سوال کے سلسلے میں پیش کیا تھا "کیا یزید پر لعنت کرنے والا فاسق ہے؟ اور کیا یزید کیلئے

۱: مجمع البیان ج ۵ ص ۱۱۲ الکشاف ج ۱ ص ۳۹۵

دعائے رحمت جائز ہے ؟"

جی ہاں یزید پر لعنت کرنے والا فاسق و گنہ گار ہے (مجیب) اس لیے کہ عام مسلمان بلکہ جانور تک پر لعنت کرنا حرام ہے۔ جیسا کہ حدیث پیغمبر میں وارد ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ مسلمان کی عزت کعبہ کے برابر ہے۔ یزید کا اسلام ثابت ہے اور اس کا قتل امام حسینؑ کے لیے حکم دینا یا اس سے راضی ہونا ثابت نہیں ہے پھر مسلمان سے بدظنی بھی حرام ہے جب تک واقعہ کی تحقیق نہ ہو اس وقت تک حسن ظن ضروری ہوا کرتا ہے۔ علاوہ بریں قتل حسینؑ کفر بھی تو نہیں ہے صرف ایک گناہ ہے۔ رہ گیا دعائے رحمت کا معاملہ تو وہ جائز بلکہ مستحب ہے اس لیے کہ ہم نماز میں اللھم اغفر للمومنین والمومنات پڑھتے ہیں اور یزید مومن تھا[1]

ارباب دانش! آپ نے یہ تناقض اور حیلسازی ملاحظہ فرمائی۔ مومن سے بدظنی حرام ہے، قتل حسینؑ کفر نہیں ہے، مومن کی حرمت بنص رسولؐ کعبہ سے زیادہ ہے لہٰذا یزید پر لعنت حرام ہے یعنی امام حسینؑ کی کوئی حرمت نہیں ہے ان کے خون مقدس کی کوئی قیمت نہیں۔ ان کے بارے میں رسول اکرمؐ کے ارشادات کا کوئی وزن نہیں، ان کے قتل سے یزید کے احترام میں کوئی فرق نہ آئے گا وہ خلیفۂ رسول اور امیر المومنین تھا لہٰذا وہ ہر نماز کی دعا میں داخل رہے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اپنے باپ کو قتل کر کے اس کے کاسۂ سر میں شراب پینے والے اور اپنی ماں سے زنا کرنے والے شخص سے ایمان کا قائل ہونا حق و صداقت پر ظلم اور انصاف سے علیحدگی کے اعتبار سے اتنا اہم نہیں ہے جس قدر یزید کے ایمان کی اہمیت ہے جس کی ساری زندگی فسق و فجور، شراب خواری و مستی اور عیاری و

۱۔ سیرۃ حلبیہ ج ا ص ۱۹۵

عیاشی میں گزر گئی۔

لیکن یزید کا قاتلِ امامؑ ہونا ہی ایسا محرک تھا جس نے غزالی کو اس ذلیل و پست موقف میں لا کھڑا کیا۔ اور وہ پوری قوت سے یزید کی حمایت پر تُل گئے۔

خدا جانے کیا بات ہے کہ غزالی نے یزید سے دفاع کرتے میں اسی بیان پر اکتفا نہیں کی بلکہ بار بار ضرورۃً یا بلاضرورت اس کا اعادہ کیا ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر فرماتے ہیں "اگر کوئی سوال کرے کہ کیا حسینؑ کو قتل کرنے یا ان کے قتل کا حکم دینے کی بنا پر یزید پر لعنت کرنا جائز ہے؟ تو جواب دیا جائیگا یہ ثابت نہیں ہے لہٰذا بلا تحقیق یہ نسبت بھی جائز نہیں ہے چہ جائیکہ لعنت اس لیے کہ مسلمان کی طرف گناہ کبیرہ کی نسبت دینا حرام ہے[1]۔"

غزالی کی نظر میں اتنا دفاع یزید کے لیے اور حقائق و مسلمات سے اس قدر انکار کافی نہیں تھا۔ اس لیے کہ وہ اس امر سے واقف تھا کہ اس نے اپنے جعل و فریب سے ایک اور ایک دو ہونے کا انکار کیا ہے۔ چنانچہ اس نے ایک دفعہ پھر نئے انداز سے دفاع کی کوشش کی اور چاہا کہ فقط یزید نہیں بلکہ تمام قاتلانِ امام حسینؑ کو بری کر دیا جائے تاکہ اگر یزید کا قاتل ہونا بھی ثابت ہو جائے تو کوئی داغ دامنِ یزیدیت پر نہ رہ سکے۔

فرماتے ہیں کیا یہ جائز ہے کہ قاتل حسینؑ یا حاکم قتل حسینؑ کو لعنہ اللہ کہا جائے؟

جواب: حق تو یہ ہے کہ اگر لعنت کی جائے تو اس شرط سے کہ اگر توبہ نہ کی ہو تو لعنت اس لیے کہ توبہ کا احتمال بہر حال باقی ہے۔

اس کے بعد وحشی قاتل حضرت حمزہؓ کے افسانۂ توبہ سے استدلال کرنے کی کوشش

---

[1] احیاء العلوم ج ۳ صفحہ ۱۲۱ اگرچہ غزالی نے سر العالمین میں اس رائے کی مخالفت کی ہے لیکن ان تمام تناقضات و اختلافات کا منشا وہ لوگ ہیں جنکے اشارہ پر یہ کتابیں تالیف ہوتی تھیں

کی ہے جبکہ وحشی کے متعلق یہ معلوم ہے کہ اس نے زندگی کے کسی لمحہ میں اپنی وحشیت کو ترک نہیں کیا بلکہ ساری زندگی شراب میں ڈبو دی اور کبھی اس نشہ سے افاقہ نہ ہوسکا[1]

بہرحال غزالی کی یہ ناکام کوشش کہ کسی فاسق وفاجر، عاصی وکافر کی توہین نہ ہونے پائے اور اس پر لعنت نہ ہوسکے اس حد تک ترقی کر گئی کہ اس نے ابلیس کی حمایت کا اعلان کر دیا: "ابلیس پر لعنت کرنے سے سکوت میں کوئی مضائقہ نہیں ہے چہ جائیکہ غیر ابلیس[2]"

افسوس کہ یہی غزالی جو ایسے ذلیل و رسوا کن موقف میں کھڑے ہوکر یزید ابلیس اور اس کی اولاد سے دفاع کرتا ہے۔ ایک مرتبہ نہایت بیباکانہ انداز میں یہ اعلان کر دیتا ہے "دوسرا مرتبہ اوصاف کے ذریعے لعنت کا ہے جیسے یہود، نصاریٰ مجوس، قدریہ، خوارج، رافضی، زانی، ظالم، سودخوار پر لعنت اور یہ جائز ہے[3]۔

بعض لوگ یہ خیال کریں گے کہ غزالی کے ان دونوں فتووں میں اختلاف ہے کہ یہاں ان جماعتوں پر لعنت کو جائز قرار دیا ہے اور وہاں یزید بلکہ ابلیس پر لعنت کو حرام کیا ہے۔ حالانکہ ابلیس ان تمام جماعتوں کا سردار ہے۔

لیکن اگر ذرا سا غور وتامل کیا جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ ان دونوں بیانات کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ ایک گہرا ربط ہے۔ اس لیے کہ طائفہ روافض (جو شیعوں کی چڑ نکالی گئی ہے) پر لعنت اور یزید سے دفاع مقصد وغایت کے اعتبار سے بالکل متحد ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ تمام بیانات اس عداوت ونفرت کا نتیجہ ہیں

۱: استیعاب ج ۳ ص۱۴۱ ۲: احیاء العلوم ج ۳ ص۱۲۱

۳: احیاء العلوم ج ۳ ص۱۲۰

جو ان مؤلفین کو خاندانِ رسالت سے حاصل تھی۔ اور جب مقصد معلوم ہو گیا تو ہمیں کوئی تعجب اس امر سے نہیں ہے کہ اس مؤلف نے شیعوں کو خوارج اور قدریہ کے ساتھ کیوں جمع کر دیا۔ اور ان پر لعنت کیونکر جائز کر دی؟ ظاہر ہے کہ اس کی نظر میں تشیع ایک ایسا گناہ ہے جس کی توبہ نہیں اور ایک ایسا عمل ہے جس میں کوئی خیر نہیں۔

بلکہ اگر غزالی اپنے دل کے راز کھول سکتا تو یہ بھی کہہ سکتا کہ تمام فرق و مذاہب شیعوں سے بہتر ہیں۔ اس لیے کہ علیؑ کی محبت اس فرقہ کا وہ جرم ہے جو قابلِ عفو نہیں، وہ میل ہے جو دھل نہیں سکتا۔

کتنا عظیم فرق ہے غزالی کی اس یزید دوستی اور جاحظ کے انصاف پسند موقف میں جہاں اس نے یزید کی حقیقت کا اعلان کرتے ہوئے "عام الجماعۃ" کے حالات میں کہتا ہے کہ "اس کے بعد معاویہ کے بیٹے یزید، اس کے عمال اور اس کے انصار و اعوان کے اعمال ہیں۔ مکہ پر حملہ، کعبہ کی تباہی اور مدینہ کی تخریب منی کا مسئلہ ہے۔ امام حسینؑ نے یہ کہہ دیا تھا کہ میں اپنے گھر، حرم رسولؐ یا کسی ایسی جگہ جا کر قیام کر سکتا ہوں جہاں حکومت کو کوئی گزند نہ پہنچ سکے۔ لیکن دشمنوں کی نظر میں سوائے قتل کے کوئی اور چارہ نہ تھا[1]

اس کے بعد یزید کے اعمال سے اس کے کفر پر استدلال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں

"ذرا اس کے ان اشعار کا بھی حساب کرو جن کا کہنا کفر اور جن سے مماثلت شرک ہے۔ پھر یہ دیکھو کہ حسینؑ کے دندان مبارک سے جسارت بنات رسول کو برہنہ سر ناقوں پر سوار کرنا علی ابن الحسینؑ سے اطفال مشرکین کا سا سلوک کرنا کیا اس کی بھی کوئی تاویل ہے؟"

---

[1]: رسائل جاحظ ص ۲۹۴۔

کیا تاویل ہوگی عبید اللہ بن زیاد کے اس قول کی جو اس نے اقارب و اعزائے حسینؑ سے کہا تھا: میں چاہتا ہوں کہ اس (امام سجادؑ) کو بھی قتل کر دوں تاکہ یہ شاخ ہی ختم ہو جائے، یہ مرض ہی مٹ جائے اور یہ مادہ ہی قطع ہو جائے؟ مجھے کوئی بتائے کہ قتلِ امام کے بعد یہ سختیاں یہ شقاوتیں کس بات کی دلیل ہیں؟ کیا یہ سب دشمنی غلط رائے، حسد، بغض، نفاق اور بے ایمانی کی علامتیں نہیں ہیں؟ کیا اخلاص و محبتِ رسولؐ حفظِ اولادِ رسولؐ، حسنِ سیرت و برائتِ ذمہ کی نشانیاں یہی ہیں۔

اگر یہ تمام باتیں فسق و فجور اور گمراہی ہی کی حد تک ہوں تب بھی فاسق بہر حال ملعون ہوتا ہے اور ملعون کی لعنت سے روکنے والا بھی ملعون ہے۔"[1]

مجھے اس بیان پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں اس لیے کہ اس تقریر میں جاحظ نے ارادی یا غیر ارادی طور پر غزالی کے اس موقف کی مکمل رد کر دی ہے جس میں اس نے خاندانِ جور و ظلم مجموعۂ رذائل و خبائث شجرۂ ملعونہ کی حمایت کی تھی۔

جب ہم غزالی کی ان تمام غلط بیانیوں کا جائزہ لے کر یہ دیکھ لیتے ہیں کہ ایسا بیباک اور لاپروا انسان بھی حجۃ الاسلام کا لقب پا سکتا ہے تو ہمیں اس کے اس فتوے سے کوئی تعجب نہیں رہ جاتا کہ واعظ و غیر واعظ پر مقتل حسینؑ کا روایت کرنا اور صحابہ کے باہمی اختلافات کا بیان کرنا حرام ہے۔ اس لیے کہ اس سے صحابہ کا بغض اور ان پر طعن و طنز کی جرأت پیدا ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ سب دین کے پرچم تھے۔ ان کے اختلافات کو اچھے مقاصد پر محمول کرنا چاہیے۔ اور شاید یہ تمام باتیں خطائے اجتہادی کی بنا پر تھیں۔ انھیں حبِّ جاہ اور طلبِ ریاست سے کوئی تعلق

---

[1] : رسائل جاحظ ص ۲۹۵

نہیں تھا"!

اربابِ نظر جانتے ہیں کہ اس حیلسازی اور فریب کاری کے ساتھ ایک ایسے عظیم سانحہ کے تذکرہ کا حرام کرنا جس کی نظیر عالمِ انسانیت میں نہیں ہے اور نہ ایسے حادثہ سے بنی نوع بشر دوچار ہو سکتے ہیں، کیا مقصد رکھتا ہے؟ اور یزید جیسے افراد کو پرچمِ دین قرار دینے کا مطلب کیا ہے؟

یزید ــ بنیادِ دین ـ یزید کا مخالف باطل پسند، باطل کوش (العیاذ باللہ) یہی نہیں بلکہ اسی ایک دفاعی مشن سے ہر باطل پرست کی حمایت کردی گئی اور جنگ صفین جیسے معرکہ کو اجتہادی غلطی کا نتیجہ قرار دیدیا گیا، معاویہ کا اقدام غزالی کی نظر میں تعمیر اسلام کے لیے تھا اس میں حبِ جاہ وریاست کو دخل نہ تھا۔ یہ اور بات ہے کہ خود یزید کے باپ ابوسفیان کے بیٹے اور امیہ کے پوتے نے اس کی تردید اپنے اس خطبہ میں کردی تھی جس میں اہلِ کوفہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

"اے اہلِ کوفہ! کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ میری جنگ نماز، زکوٰۃ اور حج کیلئے ہے؟ یہ قطعاً غلط ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم نماز گزار، زکوٰۃ کے پابند اور حج کے ادا کرنے والے ہو۔ میں نے تو صرف اس لیے جنگ کی ہے کہ تمھاری گردنوں پر حکومت کروں۔ اللہ نے مجھے یہ نعمت دیدی ہے اب چاہے تم اسے ناپسند کرو۔ یاد رکھو اس معرکہ کا ہر مال اور ہر خون مباح ہے اور میرے شرائط میرے قدموں کے نیچے ہیں"۔[1]

ہم اس مقام پر غزالی کی ان تمام افترا پردازیوں کا محاسبہ نہیں کرنا چاہتے جو اس نے احیاء العلوم میں درج کی ہیں اس لیے کہ اس کتاب میں کذب و بہتان جہل و

۱: الغدیر ج ۱۰ ص۲۱۱ تفسیر روح البیان ج ۴ ص۱۴۲، ۲: شرح نہج ج ۴ ص۱۶ الغدیر ج ۱۰ ص۳۲۶

فریب، تدلیس و تلبیس کی بہتات ہے۔ ہمیں تو صرف ان اقدامات کے نمونے پیش کرنا تھے کہ جن میں ملتِ اسلامیہ اس وقت مبتلا ہو گئی جب رجال سوء حاکم بنے اور دین دنیا کے عوض بکنے لگا۔

اس لیے اگر ایسے حکام برسرِ کار نہ ہوتے تو اعلان بھی نہ ہو سکتا کہ حسینؑ اپنے نانا کی شریعت سے مارے گئے۔

یہ قائل کون تھا؟ ابوبکر بن عربی جس کی نظر میں یزید امام زمانہ تھا اور (معاذ اللہ) حسینؑ خارجی! اور ظاہر ہے کہ دینِ رسول میں باغی کا قتل معین ہے۔ اس مقام پر ابنِ عربی کو غزالی پر یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے اپنے دل کے راز کو فاش کر دیا۔ جبکہ غزالی ... مد میں زہر ملا کر دینے کا قائل تھا!

اس کے بعد ابن خلدون کی باری آئی وہ یہ نہیں چاہتا کہ اہلبیت میں سے فقط کسی ایک فرد کی توہین کرے بلکہ اس نے کھلے لفظوں میں یہ اعلان کر دیا:

● "اہلبیت ایک جداگانہ فقہ اور بدعتی مذہب کے بانی تھے۔ ان کے اصول لغو اور ان کے مبانی خوارج سے ملتے جلتے تھے، جمہور نے ان کی طرف اعتنا بھی نہیں کی ہے۔ بلکہ ان کا انکار کیا ہے۔ ان کی رد و قدح کی ہے ہم نہ ان کے مذہب کو پہچانتے ہیں اور نہ ان کی کتابیں نقل کرتے ہیں۔ ان کے مذاہب انہی کے شہروں تک محدود ہیں۔ شیعوں کی کتابیں اس وقت تک رائج تھیں جب تک مغرب و مشرق و یمن میں ان کی حکومت قائم تھی اور خوارج کی بھی یہی شان ہے۔ دونوں کی کچھ کتابیں ہیں تالیفات ہیں اور عجیب و غریب فقہی خیالات ہیں۔"[1] ●

۱: مقدمہ ابن خلدون ص ۴۴۶

ابن خلدون کو اگر یہ فخر ہے کہ اس نے مذہب اہلبیت کو ترک کر دیا ہے تو ہوا کرے لیکن یہ طے شدہ ہے کہ اہلبیتؑ نے کوئی بدعت ایجاد نہیں کی، ان کی طہارت پر نص قرآن موجود ہے اور کیا کہنا اس بدعت کا جس کا سرچشمہ قرآن کریم ہو۔ جس کے سوتے قرآن کی زمین سے پھوٹتے ہوں۔

ابن خلدون کیلئے دوسری قابلِ فخر بات یہ ہے کہ اس نے اہلبیتؑ کو خوارج سے ملا دیا ہے اور دونوں کو شاذ و اہلِ بدعت قرار دیا ہے جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ اہلبیتؑ بھی خوارج کی طرح دین سے خارج اور احادیث پیغمبر اسلام کا مصداق ہیں۔

تیسرا فخر یہ ہے کہ اس نے مذہب اہلبیت کو انکار و رد و قدح کی منزل میں قرار دیا ہے۔

اور بعض لوگوں نے یہاں تک ترقی کی ہے کہ اپنے یہاں کے اخبار و روایات سے ثابت شدہ احکام کو بھی صرف اس لیے ٹھکرا دیا ہے کہ ان میں مذہب شیعہ سے مشابہت پائی جاتی ہے۔

اس مقام پر انتہائی ضروری ہے کہ ہم ان مخالفتوں کے بھی چند نمونے پیش کر دیں تاکہ اس وسیع خلیج کے طول و عرض کا اندازہ کیا جا سکے جو مذہب شیعہ و سنی کے درمیان پیدا کی گئی ہے۔ اور جس میں شیعوں کا جرم احادیث رسول کی طرح اخبار آئمہ معصومینؑ سے تمسک و تعلق تھا۔

قبر کے بارے میں سنّت یہ ہے کہ اس کی سطح برابر ہو لیکن بعض حضرات نے اسے کوہان نما بنانا اولیٰ قرار دیا ہے صرف اس لیے کہ مسطح قبر شیعوں کا شعار ہے اگرچہ یہی شافعی کا بھی فتویٰ تھا۔

۱: الغدیر ج ۱۰ ص ۲۰۹-۲۱۰،

چنانچہ غزالی اور ماوردی نے کہا ہے کہ "اگرچہ قبر کا مسطح ہونا ہی حکم شریعت تھا لیکن چونکہ رافضیوں نے اسے اپنا شعار بنا لیا ہے اس لیے ہم نے اس سے عدول کر لیا ہے"۔[۱]

انگشتری کے بارے میں سنت یہ ہے کہ داہنے ہاتھ میں پہنی جائے لیکن بعض حضرات کا فتویٰ یہ ہے کہ "اگرچہ حکم شریعت یہی ہے کہ انگشتری داہنے ہاتھ میں ہو لیکن چونکہ اسے رافضیوں نے اپنا شعار بنا لیا ہے لہٰذا اب بائیں ہاتھ میں ہونی چاہیے"۔[۲]

اس فتوے میں ایک طرف مذہب شیعہ یعنی سنت رسول کی مخالفت کی گئی ہے اور دوسری طرف معاویہ کا اتباع کیا گیا ہے اس لیے کہ سب سے پہلے بائیں ہاتھ میں انگوٹھی کی ایجاد اسی نے کی ہے۔

شیعوں کی مخالفت! یہ ایک ایسا جملہ ہے جو اکثر مقامات پر نظر آتا ہے چنانچہ ملاحظہ ہو:

"یہ امامیہ کا شعار ہے لہٰذا اس سے اجتناب کیا جائے"[۳] "اس سے رافضیت کا اتہام پیدا ہوتا ہے"[۴] "کسی مومن کیلئے مناسب نہیں کہ یزید ملعون، شیعہ رافضی یا خوارج سے تشبہ اختیار کرے"[۵]

اکثر مقامات پر سنت کو اس لیے ترک کیا گیا ہے کہ "یہ رافضیوں کا شعار ہے"۔ "سنت کا ترک کرنا بھی سنت ہے اگر وہ اہل بدعت کا شعار بن جائے جیسے کہ انگشتری کا مسئلہ ہے کہ اصل سنت دائیں ہاتھ میں پہننا تھا لیکن چونکہ اہل بدعت نے اسے اپنا طریقہ بنا لیا ہے اس لیے اب سنت یہ ہے کہ اسے بائیں ہاتھ میں پہنا جائے"۔[۶]

رفتہ رفتہ شیعوں کی مخالفت معمول میں داخل ہو گئی اور اسی کے ذریعے سنت کی مخالفت بھی شروع ہو گئی اب کوئی ایسا نہ تھا جو اس کا انکار کرسکتا حد ہو گئی کہ بعض لوگوں نے رافضیوں سے مشابہت

۱: الغدیر ج ۱۰ ص ۲۰۹-۲۱۰، ۲: الغدیر ج ۱۰ ص ۲۰۹-۲۱۱

۳: ۴: ۵: ۶: الغدیر ج ۱۰ ص ۲۰۹-۲۱۰،

کی بحث میں یہ تک کہہ دیا کہ[1] "اسی لیے بعض فقہا نے مستحبات کو ترک کر دینے کا فتویٰ دیدیا۔ اس وقت جبکہ وہ رافضیوں کا شعار بن جائیں۔ اگرچہ مشابہت کی بنا پر ان مستحبات کا ترک کرنا واجب نہیں ہے لیکن چونکہ اس سے شیعہ و سنی کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے اور مصلحت اسی میں ہے کہ یہ امتیاز باقی رہے تاکہ ان سے ترکِ موالات کی جا سکے اس لیے اس کا ترک کرنا ہی بہتر ہے، علاوہ اس کے کہ اس مخالفت کی مصلحت اتباع سنت کی مصلحت سے زیادہ اہم بھی ہے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں ذہنی سوالات کی بوچھار اور علاماتِ استفہام کی بھرمار ہو جاتی ہے۔ آخر یہ انکارِ سنت، مخالفتِ شرع اور فرقہ حقہ امامیہ پر مظالم کیوں؟ جبکہ اس فرقہ کا کوئی قصور سوائے اس کے نہیں ہے کہ اس نے دینِ حنیف کی تعلیمات قرآنِ کریم کے اوامر، سنتِ پیغمبر اسلام کے احکام پر عمل کرتے ہوئے قوانینِ شریعت کو ان صاف و شفاف چشموں سے لیا ہے جن کی طہارت و نظافت پر متعدد نصوص و ارشادات دلالت کرتے ہیں۔

کیا سنت انہی لوگوں کی مخالفت کا نام ہے؟ کیا اس مخالفت میں اتنی عمومیت ہے کہ اس میں ہر وہ فرقہ و جماعت داخل ہو جائے جس کی رائے ان حضرات کی رائے سے ہم آہنگ نہ ہو، یا اس کا تعلق صرف شیعوں سے ہے؟

واضح لفظوں میں یوں کہا جائے کہ کیا وہ مخالفت جو عینِ سنت ہے صرف آلِ اہلبیتؑ کی مخالفت ہے جو ثقلین کی ایک فرد ہیں۔ جن کے تمسک سے نجات اور جن کی مخالفت سے ہلاکت دائمی ہے۔

کیا سنتِ پیغمبر قابلِ تغیر و تبدل ہے؟ کیا حلالِ محمدؐ قیامت تک کے لیے حلال اور حرامِ محمدؐ قیامت تک کے لیے حرام نہیں ہے؟ بھلا اس شخص کی جزا کیا ہے؟

۱: الغدیر ج ۱۰ ص ۲۰۹–۲۱۱

جو ایک عمل کو سنّتِ پیغمبر کہہ کر حرام کرتا ہو یا اس کی مخالفت کرتا ہو یا اس کو ختم کر کے شیعہ و سنی افتراق و امتیاز پیدا کرنا چاہتا ہو!

شیعہ نماز پڑھتے ہیں زکوٰۃ دیتے ہیں، واجباتِ شریعہ ہی نہیں بلکہ رضائے الٰہی کے لیے اکثر مستحبات پر بھی عمل کرتے ہیں تو کیا مخالف شیعہ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ان تمام واجبات کو اور مستحبات کو ترک کر دے یا صرف اتنا کافی ہے کہ ان کی مخالفت کے لیے صرف بعض مستحبات کو بدعت قرار دیدے۔

جب ہم مخالفتِ سنّت کے اس واضح اعلان کو دیکھ لیتے ہیں تو ہمیں شیعوں پر ہونے والے اعتراضات کی حقیقت اس ایک مثل میں آجاگر نظر آتی ہے "رمتنی بدائها وانسلت" "وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا!"

اُمتِ اسلامیہ کی مصیبت یہ ہے کہ اس پر ایسے افراد مسلّط ہو گئے جن کا علم و عرفان خدمتِ انسانیت اور سعادتِ بشریت کا ذریعہ نہ تھا بلکہ ان کا تمام تر فریضہ انسانیت کی بنیادوں کا منہدم کرنا تھا تاکہ اس کے نتیجہ میں اختلافات و افتراقات پیدا ہو سکیں۔ ان عقلوں کا مصرف انکشافِ حقائق نہیں ہے بلکہ ان کا کام حقائق و معارف کا ضائع و برباد کرنا ہے۔ منصب، رتبہ، مال یا جاہ کی خاطر!

ہم ان افراد سے تو متعجب ہیں جنھوں نے حدیثیں وضع کیں، کذب و افترا اور جعل کیے، منکرات و واہیات کا ذخیرہ مہیا کیا۔ ہمیں معاویہ پر تعجب ہے کہ جس نے ضمیر خرید لیے، عہد توڑ دیے، پیمان بھلا دیے، مالِ خدا کو ربیع کی گھاس کی طرح چر لیا، امت پر مسلّط ہو گیا حقوق کو ضائع کر دیا۔

ہمیں ان افراد کے اقوال و منکرات پر تعجب ہے لیکن ان سے زیادہ تعجب ان لوگوں پر ہے جنھوں نے مٹی کو اور بھی گیلا کر دیا۔ بالبسری میں لغمات کا اور بھی اضافہ کر دیا۔ یعنی ان تمام اقوال و خرافات کو اس طرح قبول کیا کہ گویا یہ سب قابلِ تنقید ہی نہیں۔

ہیں، جھوٹی حدیثوں کو اس طرح تسلیم کیا گویا ان کے راوی سب مُوثق و معتبر اور یہ سب رسولِ اکرمؐ کے دہنِ مبارک سے نکلی ہوئی ہیں۔ استغفر اللہ!

ہمارا تعجب ان حضرات کے بارے میں کسی حد پر رکتا ہوا نظر نہیں آتا اس لیے کہ وہ لوگ روایات کو وضع کرتے تھے۔ آخرت کو دُنیا، ضمیر و انسانیت کو مال و منصب کے مقابلے میں فروخت کرکے چمکتا ہوا سونا اور جگمگاتی ہوئی چاندی) لیا کرتے تھے۔

ان کا مشتری معاویہ وہ تاجر کبیر تھا جس کی نظر میں فضیلت کا کوئی وزن نہیں تھا وہ صرف اپنے مقصد کا خواہاں تھا اور اسی کے پیچھے دوڑا کرتا تھا۔ اس کے حصول کیلئے ہر وسیلہ کو اختیار کرتا تھا خواہ کتنی ہی دولت لٹ جائے اور کسی قدر خسارہ کیوں نہ ہوجائے

اس کی نظر میں مقصد کی خاطر ہر وسیلہ جائز تھا خواہ دین کے ارکان متزلزل ہو جائیں ضمیر کی سانس اکھڑ جائے، عدالت کا گلا گھٹ جائے اور انصاف کی آوازیں ہوا میں منتشر ہوجائیں۔

اس کی سیاست کا تقاضا یہ تھا کہ ان تمام اقدار و مفاہیم کا انکار کردے جو اس کے پست مقصد کی راہ میں حائل ہوسکیں۔

بادشاہِ عباسی کا قبرِ رسولؐ کے پاس آکر یہ کہنا کہ "ملک بانجھ ہے اگر صاحب قبر بھی مجھ سے اس بارے میں نزاع کرے تو تلوار سے اس کی ناک کاٹ لوں"۔ اس وقت کی خلافت کے حالات کی صحیح عکاسی کر رہا ہے۔

یہی وہ خلافت تھی جس سے اسلام بیزار تھا اور جس سے جہاد کا حکم دے رہا تھا، وہ چاہتا تھا کہ خلافت اس کے ہاتھ میں جائے جو اس کے تمام شرائط سے آراستہ و پیراستہ ہو۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوسکا اور اس کے تخت پر ایسے عباسی بادشاہ متمکن ہوگئے

جب ہم ان کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں جن میں کسی دور تاریخ کے حالات درج کیے گئے ہیں یا مختلف احادیث پیغمبر کو اس لیے جمع کیا گیا ہے تاکہ آئندہ نسل کے لیے ایک عمدہ و تابندہ میراث بن سکیں۔

تو اپنے کو ایک ڈوبنے والے کے مانند پاتے ہیں جسے چار طرف سے موجوں نے گھیر لیا ہو جس کے سامنے تاریکیاں ہی تاریکیاں ہوں جسے نور کی شعاعیں دور تک نظر نہ آتی ہوں اور جس سے امید کی کرنیں تک چھپ گئی ہوں۔

اس لیے کہ یہ کتابیں خرافات سے پر، موضوعات و مجعولات کا خزانہ ہیں، ان کے مؤلفین کو اپنی غلط بیانیوں اور افترا پردازیوں کی حقیقت معلوم تھی لیکن ان میں کسی نے کتاب وزیر کیلئے لکھی ہے اور کسی نے بادشاہ کیلئے تاکہ اپنی خواہش سے بھر مال حاصل کرے اور اپنی مادی پیاس بجھا سکے، ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں وہ کتاب میں ان تمام باتوں کو درج کریگا جو اس امیر یا وزیر کے پسند خاطر ہوں، اس کی خواہشات کا علاج کرسکیں، اور اجرت بقدر ضرورت مل سکے۔ خدا ناراض ہے تو ہوا کرے۔

یہی وہ اصل سبب تھا جس نے کتابوں میں اختلاف کی بنیاد ڈالی۔ ایک ہی مؤلف ایک کتاب میں ایک بات لکھتا ہے اور دوسری کتاب میں بالکل اس کے متضاد لکھتا ہے۔ صرف اس لیے کہ ایک کتاب امیر کے نظریہ کے مطابق لکھی گئی ہے اور دوسری وزیر کے نقطۂ نظر کے مطابق۔ ظاہر ہے کہ خواہشات کے اختلاف سے بیانات میں اختلاف ناگزیر ہے۔ یہاں کا صحیح وہاں غلط اور وہاں کا حق یہاں باطل۔ ہم ان تمام اختلافات کی مثالیں پیش کرنا شروع کر دیں تو ہماری مسافت زیادہ ہو جائیگی جب کہ مقصد یہ ہے کہ اس ڈیوڑھی سے گزر کر اصل منزل تک جلد ہی پہنچ جائیں۔

اس کے باوجود چند مثالیں آپ کے سامنے پیش کی جارہی ہیں تاکہ آپ اندازہ کرسکیں کہ لوگوں نے اپنی خواہشات کی تکمیل کیلئے کس طرح حقائق کو مسخ کیا ہے۔

بھلا کون ایسا ہے جو اس امر کا انکار کر دے کہ حضور اکرمؐ نے حکم بن العاص اور اس کی اولاد پر لعنت کی ہے۔ مروان کو دیکھ کر ملعون ابن ملعون کے نام سے یاد کیا ہے بلکہ ولادت سے قبل ہی اس پر لعنت کی ہے جیسا کہ حضرت عائشہ کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ مروان رسول اکرمؐ کی لعنت کا ایک جزو ہے۔ اس کے علاوہ حضرتؐ نے حکم کو مدینے سے باہر نکال دیا اور اپنی زندگی بھر داخل نہ ہونے دیا۔ بلکہ ابوبکر و عمر کے دور حکومت میں بھی جب اس کے بارے میں کوئی سفارش کی گئی تو دونوں نے نہایت ہی شدت کے ساتھ جواب دے دیا کہ "ہم رسولؐ کے نکالے ہوئے کو پناہ نہیں دے سکتے ہم حضرت کے بست وکشاد کے پابند ہیں[۲] بلکہ عمر نے تو عثمان کی سفارش پر یہ تک کہہ دیا کہ رسول اکرمؐ نکال باہر کریں اور ہم داخلہ کی اجازت دیدیں۔ ہم ایسا کریں گے تو لوگ کہہ دیں گے کہ عہد رسول کو تبدیل کر دیا۔ خدا کی قسم مجھے یہ گوارا ہے کہ میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں لیکن مخالفت رسول گوارا نہیں کی جا سکتی اے ابن عفان! دیکھو اب نہ کہنا[۳]۔

کیا ان تمام حقائق و معارف کے بعد بھی یہ تصور ہو سکتا تھا کہ جناب شہاب خفاجی اپنے دور میں حکم کے تائب اور پاکباز ہونے کا اعلان کر دیں گے۔

اگر معاویہ کی دولت نہ ہوتی تو وہ کونسا انسان ہوتا جو ابو سفیان جیسے دشمن دین

۱: ینابیع المودۃ ص۲۵۲۔ النزاع والتخاصم ص۵ شرح النہج ص۵۵ اکشف الاستار ص۵ الم سیرہ ص۱۲۶ الدعوۃ ج ۱ ص۱۸۹ العذیر ج ۵ ص۱۳ ج ۸ ص۲۵۲، ۲۶۶ مستدرک حاکم ج ۴ ص۴۸۹-۴۸۲
۲: شرح النہج ج ۱ ص۶۹ العذیر ج ۸ ص۲۵۔ ۲۶۰ رسائل جاحظ ص۲۹
۳: شرح النہج ج ۱ ص۲۳۲ ۴: السیرۃ النبویہ ج ۱ ص۲۲۹

کے ایمان بلکہ اسلام کا قائل ہوتا جس کے متعلق مشہور ہے کہ عباس اُسے امان دیکر رسول اکرمؐ کی خدمت میں لائے تھے تو آپ نے فرمایا تھا اے ابوسفیان! کیا ابھی وقت نہیں آیا ہے کہ تو کلمۂ توحید کا اقرار کرلے! اور اس نے جواب دیا تھا کہ میرے ماں باپ فدا آپ علیہا صلۂ رحم کرنیوالا حلیم وکریم کون ہوگا مجھے معلوم ہوگیا کہ اگر کوئی اور خدا ہوتا تو میرے کام آتا جس پر حضرت نے فرمایا تھا کیا ابھی میری رسالت واضح نہیں ہوئی تو اس نے عرض کیا تھا کہ آپ حلیم وکریم ضرور ہیں لیکن مسئلے میں کچھ تردّد تو رہے اور عباس نے بگڑ کر کہا تھا کمبخت شہادت دیدے ورنہ گردن اڑجائیگی[1]

ابھی اس واقعہ کو کچھ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ابوسفیان نے ایک مجمع کو حضور اکرمؐ کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے دیکھا اور دبے لفظوں میں کہنے لگا "کاش اس شخص کی یہ حیثیت نہ ہوتی!" حضرتؐ نے یہ دیکھ کر ایک ہاتھ اس کے سینے پر مارا اور فرمایا "خدا تجھے رسوا کرے"۔ یہ سن کر ابوسفیان کو غیظ آگیا اور غصے میں اپنے دلی جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کرنے لگا "مجھے ابھی تک آپ کی رسالت کا یقین ہی نہیں ہے"[2]

سچ تو یہ ہے کہ ابوسفیان کو اس کے بعد بھی یقین نہیں ہوسکا اور یہی وجہ ہے کہ اس کیلئے سب سے زیادہ تکلیف دہ وہ کلمات تھے جن سے رسالت کا اقرار ظاہر ہوسکے چنانچہ پیغمبر اسلامؐ کو اپنے عظیم لشکر اور فداکار انصار کے مجمع میں دیکھ کر عباس بن عبدالمطلب سے کہنے لگا "خدا کی قسم تمھارے بھتیجہ کا ملک بہت بڑا ہوگیا ہے"[3]

ایک اور موقع پر ابوسفیان نے آنحضرتؐ کو مسجد میں دیکھا ایک ایسی نظر سے جس سے بغض وحسد، کینہ وعداوت، افسوس ورنج کے آثار نمایاں تھے۔ صرف اس لیے کہ رسول

۱: استیعاب ج ۴ ص ۸۶ شرح النہج ج ۴ ص ۲۰۸ الغدیر ج ۳ ص ۲۲۳ رسائل جاحظ ص ۷۰،

۲: الاصابہ ج ۲ ص ۱۷۲ الغدیر ج ۸ ص ۲۸۵ ج ۱۰ ص ۸۳،

۳: الامام علی صوت العدالۃ ص ۲۰۸ ج ۴ ص ۱۱۷،

اکرمؐ کی تبلیغ ناکام نہیں ہو سکی اور جس باطل کے لیے اس نے دائمی رسوائی اختیار کی تھی وہ حق پر غالب نہ آ سکا۔ یہ دیکھ کر دل ہی دل میں اپنے کو عتاب کرنے لگا اور کہنے لگا "کاش! مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ یہ کیسے غالب آ گئے؟"

حضرتؐ نے یہ دیکھ کر چاہا کہ ابوسفیان پر حقیقت واضح کر دیں کہ غلبہ کا معیار اکثریت اور مغلوبیت کا معیار اقلیت نہیں ہے۔ چنانچہ آپؐ نے اس کی پشت پر ایک ہاتھ مار کر فرمایا:

"اے ابوسفیان! میں نے تجھ پر اللہ کے ذریعہ غلبہ حاصل کیا ہے۔"[1]

اس کے علاوہ جب اسے عثمان کی بیعت کی اطلاع ملی تو فوراً اس کے پاس پہنچ گیا۔ کہنے لگا یہاں کوئی اور تو نہیں ہے۔ اور جب اطمینان ہو گیا کہ فضا سازگار ہے تو کہنے لگا۔ اب تیم و عدی کے بعد خلافت تمہیں ملی ہے، اسے گیند کی طرح نچاؤ اور اس کا مرکز بنی امیہ کو قرار دو۔ اس کی قسم جس کی قسم عثمان کھاتا ہے[2] میں مدت سے اس کا امیدوار تھا اور اب تو یہ تمہاری اولاد میں میراث کے طور پر چلے گی۔ یاد رکھو خلافت ایک سلطنت ہے اس کے علاوہ جنت و دوزخ کچھ بھی نہیں ہیں۔"[3]

اس کے بعد جناب حمزہ کی قبر کی طرف متوجہ ہوتا کہ دل میں بھڑکنے والے شعلوں کو بجھا سکے اور قبر مبارک کو ٹھوکر مار کر کہتا ہے "اے ابوعمارہ! دیکھو جس کام کے لیے تم نے شمشیر زنی کی تھی آج وہ ہمارے بچوں کا کھیل بن گیا ہے۔"[4]

۱: صوت العدالۃ ص۲۰ ج ۴ ۱۹۹۱ء

۲۔ ناظرین کرام ان ہستیوں سے بھی واقف ہیں جن کی قسم ابوسفیان کھاتا ہے جن کا تعارف مختلف جنگوں میں ہو چکا ہے اور جن کے نام پہ اعل ہبل شعار جنگ بن چکا ہے۔

۳: الاستیعاب ج ۴ ص۸۷-۸۸ شرح النہج ج ۱ ص۱۳۰ الامام علی ج ۱ ص۳۱۹ النزاع و التخاصم ص۲ معجم القبور ص۱۹۱ اہل الشیعہ ص۲۶ الغدیر ج ۸ ص۲۸۵-۲۹۳ ج ۱۰ ص۸۳ صوت العدالۃ ۹۴۱ ج ۴ ص۹۱۵ء

۴: النزاع ص۵۲ شرح النہج ج ۴ ص۵ مروج الذہب ج ۲ ص۳۵۱ الامام علی ۲۲۲ الغدیر ج ۱۰ ص۸۳ صوت العدالۃ ۹۱ ج ۴

افسوس! کہ اس کے بعد بھی اگر آپ کتبِ احادیث کی سیر کریں گے تو ابوسفیان کے فضائل کا ایک پورا باب نظر آئیگا۔

ان واضعینِ حدیث نے اسی پر اکتفا نہیں کی کہ ابوسفیان کے بارے میں اسلام لانے کے بعد روایات وضع کرتے بلکہ اسلام لانے سے پہلے کے لیے بھی حدیثیں گھڑ ڈالیں۔

غالباً یہ فضائل اسلام کو تباہ کرنے اور رسولِ اکرمؐ سے خونریز جنگیں لڑنے سے پیدا ہوئے تھے۔ یہی نہیں بلکہ ایک کھلا ہوا جھوٹ یہ پیش کیا گیا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: "اسلام کو ہمیشہ ابوسفیان کی تائید حاصل رہی ہے۔ قبل اسلام اور بعد اسلام جب میں اللہ کی طرف سے ابوسفیان کے پاس محاسبہ کے لیے آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ ہاتھ میں یاقوتِ سرخ کا ایک کاسہ لیے ہے اور کہتا ہے میرے دوست! نوش کیجئے۔ لوگ ابوسفیان کی مذمت کرتے ہیں حالانکہ انھیں رضا ہی رضا حاصل ہے۔ خدا ان پر رحم کرے۔ بھلا ان کمالات و فضائل کے بعد ابوسفیان کا مثل کون ہو سکتا ہے!؟[1]

ہم اس افترا پردازی پر کسی تنقید سے اس لیے معذور ہیں کہ ابوسفیان کی پوری زندگی ایک مستقل تنقید ہے۔ تاریخ کے وہ صفحات جن میں اغراض و خواہشات کی داستانیں درج ہیں مجھے کسی مزید تبصرہ سے روک رہے ہیں۔

آپ جس طرح کتبِ احادیث میں ابوسفیان کے فضائل کے باب دیکھیں گے اسی طرح آپ کو ایک مکمل ذخیرہ مغیرہ بن شعبہ بدکار، مروان بن حکم ملعون عمرو بن عاص اور معاویہ جیسے آئمہ ضلال[2] اور اس کے علاوہ مختلف اولادِ زنا اور صاحبانِ پرچم فاحشہ کے

۱: الغدیر ج۔ ۱ ص۔۔۔ ۲: شرح النہج ص۱۵ میں ابن ابی الحدید نے جناب امیرؑ کے کلام کی شرح کرتے ہوئے آئمہ ضلال سے معاویہ و عمرو عاص وغیرہ کو مراد لیا ہے،

فضائل نظر آئیں گے۔

ابن حجر نے اپنی کتاب صواعق محرقہ کے بیانات پر اکتفا نہیں کی بلکہ معاویہ کی خلافت کے اثبات کیلئے ایک مستقل کتاب لکھ ماری اور اس کا ایک بھاری بھرکم نام تطہیر الجنان واللسان عن الخطور والتفوۃ بثلب سیدنا معاویہ بن ابی سفیان رکھ دیا۔

عنوان کا رعب داب دیکھ کر اگر آپ اس عنوان سے مرعوب ہو گئے ہیں تو اپنے دل و زبان کو طاہر بن طاہر سردار ابن حجر، سرفہرست تاجرین معرفت کی شان میں جسارت سے پاک کر ڈالیے۔

رہ گیا علیؑ سے جنگ کرنا، اُن کے خلاف بغاوت کرنا، مسلمانوں کا خون بہانا، علیؑ کو لعن وطعن سب وشتم سے یاد کرنا، عمر و حجر اور دیگر اصحاب کا قتل کرا دینا، امام حسنؑ کو زہر دینا، مالک اشتر کو شہید کرانا، زیاد کو اپنا بھائی بنا لینا اور دیگر قبیح اعمال کا معاملہ تو اس کا صاف حل یہ ہے کہ معاویہ مجتہد تھا اور مجتہد کو غلطی پر بھی ایک اجر ملتا ہے۔ پھر وہ تو وحی کا امین ہفتم یا سیوم بھی تھا۔[1]

اگر آپ اس کتاب کی چند سطروں کا بھی مطالعہ کر لیں تو رنج وغم سے آپ کا دل پاش پاش ہو جائیگا اور آپ حیرت زدہ رہ جائیں گے کہ حقائق یوں مسخ کیے جاتے ہیں اور حق

---

[1]: اہی جعلی حدیثوں میں ایک افسانہ یہ بھی ہے کہ امین سات ہیں لوح، قلم، اسرافیل، جبرئیل، میکائیل، محمد، معاویہ اور بعض روایات کی بنا پر صرف تین ہیں جبرئیل، پیغمبر، معاویہ۔ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ قریب تھا کہ معاویہ نبی بن جائے اس لیے کہ اسکا علم وافر اور وہ امین کلام الہٰی تھا، خدا اس کے گناہ بخشے، اسے حساب سے بچائے، اُسے ہدایت یافتہ قرار دے۔ الغدیر ج ۵ ص ۲۲۲ اس کتاب میں صفحہ ۲۵۳ سے ۲۸۴ تک ان خرافات کی ایک فہرست درج کی گئی ہے جن کی تعداد تقریباً ایک سو پانچ تک پہنچ جاتی ہے۔

سے یوں دشمنی کی جاتی ہے۔ اس کتاب میں وہ حدیثیں بھی نظر آئیں گی جو آنحضرتؐ نے معاویہ کی مذمت میں ارشاد فرمائی ہیں اور صاحب کتاب کے انھیں تاویل کر کے مدح کے موڑ پر لگا دیا ہے اس کے علاوہ کذب و بہتان کا ایک انبار ہے جسے رسول اکرمؐ اور امیر المومنینؑ کی زبان مبارک سے ادا کیا گیا ہے تو اس مقام پر ابن حجر کو معذور سمجھئے اس لیے کہ اس نے یہ کتاب شہنشاہ ہند ہمایوں کی خواہش پر تالیف کی ہے اور ظاہر ہے کہ ایسی تالیف کا معیار ہی یہ ہے کہ سلاطین و امراء کے چشم و ابرو کے اشاروں پر قلم کو گردش دی جائے۔

بعض لوگ ابن حجر جیسے ضمیر فروش، باطل کوش اور حق پوش لوگوں کو واقعاً معذور سمجھتے ہیں اور ان کی دنیاداری و زرپرستی کو مجبوریوں پر محمول کرتے ہیں۔ لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ عذر لنگ ان لوگوں کے موقف کو جائز نہیں بنا سکتا بلکہ اس جعل و فریب کی مکمل مسئولیت انہیں مؤلفین کے سر ہے، انہیں لوگوں نے خلافت ظالمہ کی بنیاد رکھی ہے اور اس کے ارکان مستحکم کیے ہیں۔ اب اگر ان حضرات کو بھی معذور تسلیم کر لیا جائے تو ان لوگوں کیلئے کیا عذر ہوگا جو عصر نور و حریت میں واضح حقائق کو دیکھنے کے بعد بھی تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ ماضی کے افسانوں پر اعتماد کرتے ہیں اور آزادی فکر کے ساتھ بحث و تمحیص تحقیق و تفتیش کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔

مانا کہ اُس دور کی بدنام سیاست ایسے ہی موقف کی خواہاں تھی۔ افتراق و اختلاف ہی کو پسند کرتی تھی۔ سرمایہ پر زبان و قلم خریدنے کی عادی تھی۔ اپنے کمزور اور بے بنیاد مقصود کو محکم ہی کرنا چاہتی تھی۔ خلافت اسلامیہ کے نام پر "لڑاؤ اور حکومت کرو" کے اصول پر عامل تھی۔ تو آج کا دور تو ویسا نہیں ہے، آج کے حالات تو کل سے مختلف ہیں۔ آج کی دنیا تو دوسری ہو چکی ہے۔ آج وحدت و اتفاق کا زمانہ ہے۔ آج مشترک دشمن کے مقابلے میں تمام سابقہ کینوں کو دلوں سے نکال کر برابر سے صف آرا ہونے کی ضرورت ہے۔ آج فضا کو گمراہیوں اور جعلسازیوں کے بادلوں سے صاف کر دینا چاہیے لیکن افسوس کہ حالات

اس کے بالکل برعکس ہیں۔

اب جو انسان بھی واقعہ کی حقیقت تک پہنچنا چاہتا ہے اس کا فریضہ ہے کہ پہلے اپنے جذبات و عواطف اور رسوم و تقالید کی اصلاح کرے، اس کے بعد ایک مخلص، پاکباز اور طالب حقیقت کی حیثیت سے خالصۃً لوجہ اللہ تحقیق شروع کرے۔ اس کا مقصد صرف حقائق کا اجاگر کرنا اور حق کی نورانیت کو عالم آشکار کرنا ہو۔ اور اگر کسی شخص کو یہ کیفیات میسّر نہ ہوں تو اسے چاہیے کہ ماضی کو بالکل فراموش کر دے۔ ان تاریکیوں میں قدم نہ رکھے، ایسا نہ ہو کہ بلا علم و عرفان فیصلے شروع کر دے اور اس طرح خواہشات و جذبات پرستی میں بدنام بھی ہو اور اسلامی وحدت کے شیرازہ کو منتشر بھی کرے۔

لیکن افسوس! افسوس!! محرومی، ناکامی۔ نوکِ قلم سے اشک جاری ہیں یہ "لیکن" کہاں سے آگیا۔ خدا بُرا کرے اس "لیکن" کا! یہ تمدّن روشن فکری، علم وایٹم، بحث و تمحیص و تحقیق کا زمانہ اور اس میں ایسے اشخاص جن کا جسم حال کے قید و بند میں اور دماغ ماضی کے ظلمات میں۔ یہ عہد سنگ کی یادگار عقلیں صرف اس لیے رہ گئی ہیں کہ مسلمانوں میں فساد برپا کریں، عوام کو گمراہ کریں، علوم و معارف کا چہرہ بگاڑ دیں۔ اور پھر علماء و عرفاء ہی بنے رہیں۔

ہم اس مقام پر ان لوگوں سے محاسبہ یا ان کی تردید کرنا نہیں چاہتے۔ اس کام کیلئے بڑا وقت درکار ہے۔ ہم تو صرف یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ جب راقمی نے تحت رایۃ القرآن" کتاب لکھی جو ایک غیر شیعہ مؤلف کا جواب تھی تو اس کی کیا ضرورت محسوس کی کہ شیعوں پر بھی افتراء و بہتان رکھ دے! اگرچہ دل میں کچھ نہ تھا۔

ڈاکٹر احمد امین اپنی ان کتابوں میں جن کا نام صبح و شام اسلام رکھا گیا ہے اس بات پر کیوں اڑے ہوئے ہیں کہ شیعوں کی توہین کی جائے۔ یہاں تک کہ بعد میں علامہ کاشف الغطاء طاب ثراہ سے یہ معذرت کرنا پڑے کہ ان بیانات کا کوئی مدرک و ماخذ نہیں

تھا۔ اصل الشیعہ ص۵

کیا عبداللہ القصیمی، محمد رشید رضا، محب الدین الخطیب جیسے استعماری وزرخرید

۱ موصوف نے اپنی کتاب "الصراع بین الاسلام والوثنیہ" میں اسلام سے سنی اور بت پرست سے شیعوں کو مراد لیا ہے۔ والد مرحوم طاب ثراہ نے اس کتاب کی علمی رد نہایت ہی سنجیدہ انداز میں تحریر فرمائی ہے اور اس طرح کتاب کے بہتان وافترا کو واضح کر کے اتحاد و اتفاق کی فضا کو خوشگوار بنایا ہے۔ والد مرحوم کی کتاب کا اسلوب نہایت ہی پاکیزہ ہے اس لیے کہ مقصد صرف احقاق حق و اتحاد مسلمین تھا۔ افسوس کہ اجل نے والد مرحوم صاحب کو کتاب کی تکمیل کا موقع نہ دیا لیکن اس کے باوجود قصیمی کی رد کے لیے کافی ذخیرہ موجود ہے اس لیے کہ اس کی دو جلد کتاب میں سب وشتم کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔

۲: آپ کی کتاب "السنۃ والشیعہ" ہے اس کتاب میں افترا و بہتان، سب وشتم، طعن وطنز کا ایک مکمل ذخیرہ موجود ہے۔

۳: آپ نے اکثر حواشی و تحریرات میں اس شرمندہ کن سب وشتم سے کام لیا ہے جس سے نہ اسلام راضی ہے نہ عربیت بالخصوص آپ کا حاشیہ "مختصر منہاج السنہ" پر انتہائی تکلیف دہ ہے جس میں علماء شیعہ قدماء و معاصرین کے بارے میں ایسے کلمات استعمال کیے گئے ہیں جن کو تہذیب وحیا سے کوئی ربط ہی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ مجلۃ "الازہر" کے مقالات آپ کی نفسانی کیفیات کے صحیح عکاس و ترجمان ہیں۔ افسوس کہ یہ رسالہ اس جامعہ ازہر کی طرف سے نکلتا ہے جس کا نام دینی اور کام اتحاد بین المسلمین ہے لیکن اس کے باوجود ایسے مقالات کو بھی جگہ دیدی جاتی ہے شیخ الازہر حضرت شلتوت نے جہاں فقہ جعفری کی تعلیم کا انتظام کیا ہے وہاں انکا فریضہ یہ بھی ہے کہ خطیب جیسے افراد کی زبان بندی کریں اسلیے کہ یہ آوازیں نہ اتحاد کو برقرار رکھ سکتی ہیں اور نہ اسلامی بنیادوں کو برقرار رہنے دینگی اگر دنیا میں اسم ومسمیٰ میں مطابقت کا خیال ہوتا تو اس شخص کا نام محب الدین نہ ہوتا اسلیے کہ تمام گمراہ کن جعلسازی، فریب دہ اور سراسیمہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ ذ شیخ ازہر اس دنیا سے رحلت کر چکے ہیں اس لئے یہ ذمہ داری مصر کے موجودہ علماء اور اہل قلم پر ہے۔ جوادی)

افراد جنھوں نے اپنے حسد، کینہ، بغض و عداوت، مرض قلبی و بے ترتیبی کی بنا پر اپنے قلبی مفاسد وامراض کے ردعمل کے طور پر فضائے اتحاد کو مسموم اور معاشرۂ اتفاق کو فاسد بنا دیا ہے۔ ان حضرات کیلئے یہ مناسب نہ تھا کہ اپنے علوم و معارف کو ان راہوں میں صرف کرتے جن سے عمومی منفعت اور دائمی فائدہ حاصل ہوتا۔ خدا و ضمیر اور حق و دین راضی ہوتے۔ دین کے سرچشمہ سے سیراب ہوا جاتا۔ محبت و خیر و سلامتی کے جذبات کارفرما ہوتے، الفت و اتحاد کا اضافہ ہوتا اور اس طرح مسلمان سیسہ پلائی ہوئی دیوار کے مانند باطل کے مقابلے میں جم جاتے۔

لیکن افسوس ان لوگوں نے ذلیل اغراض کیلئے ٹیڑھے راستوں کو اختیار کیا۔ راستے الگ الگ ہو گئے مرکز فراموش ہو گیا۔ ہدایات کے نشانات گم ہو گئے گمراہی کے گڑھے سامنے آ گئے نتیجہ یہ ہوا کہ ان تاریخی جنایتوں نے لقمہ گلوگیر کر دیا اور آنکھوں میں کھٹک پیدا کر دی۔

شاید اس کے بعد بھی یہ لوگ یہی خیال کرتے تھے کہ انھوں نے اپنے فریضہ کو نہایت ہی حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا ہے حالانکہ اگر وہ ذرہ برابر فکر کرتے اور ذرا بھی تامل کرتے تو ان کے سامنے وہ تلخ حالات آ جاتے اور وہ اپنے کو دین کے سرچشمہ سے بہت دور پاتے، ان پر یہ واضح ہو جاتا کہ انہیں دین سے وہی تعلق ہے جو بھیڑیے کو جناب یوسف ؑ کے خون سے تھا۔

ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ علماء میں ایسے افراد نہیں ہیں جنھوں نے دینی تعلیمات کو حاصل کیا، اپنے کو ان خرافات کے مقابلے کے لیے وقف کر دیا اور اپنے فرائض کو پوری طرح انجام دیا جنہیں سوائے خوشنودی اور رضائے خدا کے ان کی کوئی غرض و غایت نہ تھی۔ ان حضرات نے اس آواز کو بلند کیا جس کا مقصد اصلح اور نمایاں تھا۔ اتحاد کے قصر کی بنیادوں کو مستحکم بنایا، افتراق پسند، باطل کوش، حق پوش اور سیاہ کار

عناصر کا شدت سے مقابلہ کیا۔

ہیں ۔ اور یقیناً ہیں ۔ لیکن ہماری گفتگو کا تعلق فی الحال ان سچے خدمت گزاروں سے نہیں ہے، ہماری بحث تو ان سیاہ کاروں سے ہے جن سے فضائے اسلام مکدر ہوئی ہے اور جن کی ذات افتراق کا اہم سبب ثابت ہوئی ہے۔ ہم ان لوگوں کا ذکر بھی نہ کرتے لیکن جناب ابوطالب کی سیرت کے بارے میں گفتگو کرنے کے لیے اس موضوع کا زیر بحث لانا انتہائی ضروری تھا اس لیے کہ وضع احادیث کے سلسلے میں جن افراد کو نشانۂ ستم بنایا گیا ہے ان میں سے ایک آپ کی ذات گرامی بھی ہے۔

معاویہ نے زبان و قلم، شمشیر و خنجر کوئی وسیلہ ایسا نہیں چھوڑا جس سے حضرت علی کا مقابلہ نہ کیا ہو اور ظاہر ہے کہ اس طوفانی سیلاب کی زد میں جناب ابوطالب کو بھی آنا چاہئے تھا اس لیے کہ آپ انھیں کے باپ تھے۔ بلکہ شاید اگر یہ رشتہ نہ ہوتا تو یہ حملے بھی نہ ہوتے جیسا کہ میرے والد مرحوم فرماتے تھے [1]۔

یہی وہ تاریک و سیاہ حالات تھے جنھوں نے حقائق کو مسخ کر کے کتم عدم میں ڈالنے پر کمر باندھ لی تھی۔ اب کیا تعجب تھا اگر یہ حالات شیخ بطحا پر اس وقت حملہ آور ہو جائیں جب آپ دنیا کو خیرباد کہہ کر تشریف لیجا رہے تھے۔ احتضار کا عالم تھا، روح تن سے کھینچ رہی تھی، آنکھوں میں خنکی تھی، دل کو راحت تھی صرف اس بات سے کہ آسمانی پیغام کی پوری طرح حمایت کی جا چکی ہے۔

جانے والے کو اس بات کی مطلق فکر نہ تھی کہ آنے والے کی مسخ شدہ تاریخ اس کے حالات میں کتر بیونت کرے گی۔ اس کے اس عظیم کردار، بلند دفاع، ہمت آزما موافقت کو فراموش کر دے گی جن میں عقیدہ سے دفاع، بنیادوں کا استحکام، رسالت کے نغمے اور فضائل و کرامات نبوت پر افتخار کے آثار نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

---

[1]: مولف محترم کے والد مرحوم نے اپنے ایک رسالہ میں اس مقصد کی وضاحت فرمائی ہے (مترجم)

تاریخ نے ان کارہائے نمایاں میں بعض کا تذکرہ ضرور کیا ہے لیکن مؤرخ کو جب یہ یاد آگیا کہ ابوطالب حضرت علیؑ کے باپ تھے تو قلم بہکنے لگا۔ رفتار بدل گئی، راستہ تبدیل ہوگیا۔ اور صراطِ مستقیم کو مجبوراً چھوڑنا پڑا۔ اس لیے کہ دل کے تقاضے اپنے اتباع پر مجبور کرتے ہیں۔

یاد رکھیئے ابر کسی قدر کیوں نہ جمع ہوجائیں، آفتاب کا چہرہ کتنا ہی کیوں نہ چھپا دیا جائے لیکن وہ ہمیشہ ان دراڑوں اور روزنوں کی فکر میں رہتا ہے جس سے اپنی شعاعوں کو عالم تک پہنچا کر دُنیا کو منور کر سکے۔ آفتاب یہ کیونکر برداشت کرتا ہے کہ اس کی سیر بانی رہے اور دُنیا تاریک رہے۔

یہی وجہ ہے کہ آپ تاریخ کے اتنے مظالم کے باوجود ایسے صفحات بھی دیکھیں گے کہ جن میں اس مردِ مجاہد کے سوانح حیات کے کلمات نمایاں حروف میں جلوہ گر نظر آئیں گے۔

میں نے ابتدائے امر میں یہ خیال کیا تھا کہ اس اہم اور متنازعہ فیہ مسئلے پر قلم اٹھانا انتہائی دشوار گزار امر ہوگا اس لیے کہ ماخذ قلیل اور مدارک کم ہونگے لیکن اس کے باوجود میں اپنی راہ پر چلتا رہا۔ قدم آگے بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ اس مردِ مجاہد کی مدد سے ایک بڑا ذخیرہ ہاتھ آگیا۔ مختلف کتابوں سے مطالب جمع کیے اور حق گوئی کی خاطر نمایاں کرنے کا سامان ہوگیا۔

دل نے کہا:

"حق کو ناصر و مددگار ضرور مل جاتے ہیں۔ باطل کو بقا نصیب نہیں ہو سکتی۔ کذب و بہتان کی عمر کم اور نورِ الٰہی کی تمامیت مسلّم ہے۔"

بادل کتنے ہی کیوں نہ چھائے رہیں ایک ایسی ہوا بھی آئے گی جو ان کو

پارہ پارہ کردے ـــــ آسمان کتنا ہی ابر آلود اور تاریک کیوں نہ ہو فضا کی صفائی افق کی چمک اپنی راہ ضرور بنا لے گی ـ

وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللهِ

عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ؕ
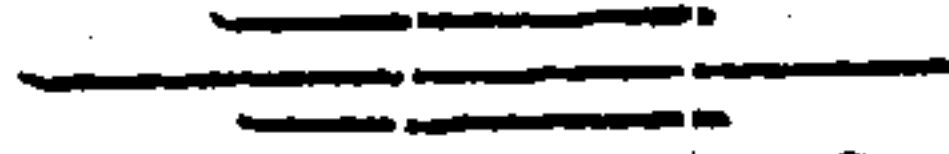
الجزءُ اوّلُ

مدارجِ زندگانی
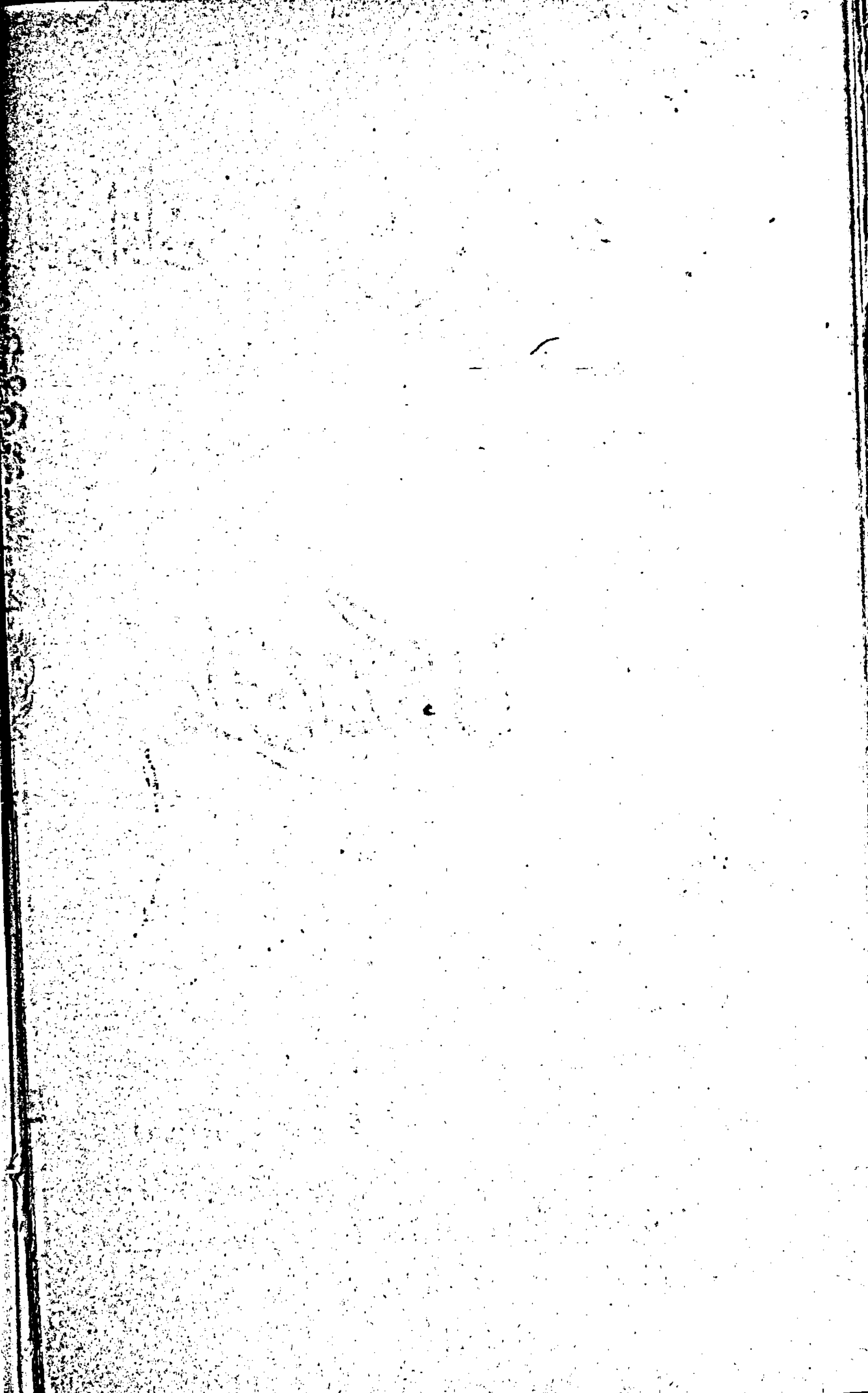
خاندان

وہ تاریک سماج اور جاہل معاشرہ جسمیں دینی نقطۂ نظر سے حیات انسانی انتہائی پستی میں جا پڑی تھی، اصنام کی فراوانی تھی۔ ہر قبیلہ کا صنم الگ ہر گھرانے کا معبود جدا بلکہ ہر شخص کا ایک جداگانہ خدا تھا جس میں دوسرے کی شرکت غیر ممکن تھی۔

وہ ماحول اور وہ معاشرہ جسمیں شعور مُردہ، احساس مفقود، آنکھیں بند اور علامات ربوبیت ناقابلِ توجہ تھے۔ وہ سماج جس میں ایسی تند و تیز آندھیاں چل چکی ہوں کہ جنھوں نے دینِ فطرت، ابراہیمی ملّت کو سنگ و چوب کی پرستش میں بدل دیا ہو، جس کے معبود انسانی ہاتھ کے تراشے ہوئے ہوں نہ سنیں نہ بولیں نہ فائدہ پہنچا سکیں نہ نقصان، مختلف رنگوں سے رنگے جائیں، مختلف زینتوں سے آراستہ کیے جائیں تاکہ انھیں خدا بنایا جائے یا ان کے ذریعے خدا تک پہنچا جائے۔ ایسا ماحول جس میں جہالت و ضلالت کی بدلیاں چھائی ہوئی ہوں، آنکھیں بند، دل مقفل احساس مُردہ اور بشریت قعرِ ذلت میں ہو ایسے ماحول میں ایک ایسے انسان کا پیدا ہونا انتہائی دشوار تھا جس کی آنکھیں دوررس جس کا دل کشادہ جس کی فکر نکتہ سنج ہو، جو نور کو دیکھ کر اس کی شعاعیں حاصل کر سکتا ہو، جو اپنے راستوں کو خود ہی روشن بنا سکتا ہو، کتب سماویہ کا مطالعہ کر کے دل کو مطمئن کر سکتا ہو ضمیر کو راحت پہنچا سکتا ہو، زندگی کے سخت ترین مراحل کو جھیل کر اطمینان حاصل کر سکتا ہو۔ جو آسمانی کتابوں اور عالمِ طبیعت کے کیفیات میں ضرورت رسول کے آثار کا مطالعہ کر سکتا ہو، جو ارضِ مکّہ کو مرکزِ انوار سمجھ کر خوشی سے مست و مگن ہو جاتا ہو جس کا دل اس امّید پر رقص کرتا ہو کہ ہم بھی اس نور کامل سے شعاعیں حاصل کریں گے ہم بھی اس ضیاء مجسم کی کرنوں سے استفادہ کریں گے۔

الیاسیت و اختلاط پذیر یا حول جس میں کوئی مکان بھی کسی لکڑی یا پتھر کے ٹکڑے سے خالی نہ ہو۔ وہ ٹکڑا جسے سب گھر والے سجدہ کریں جس کی بارگاہ میں تضرع و زاری کریں سفر کے موقع پر سب سے آخر میں اسے وداع کریں اور سب سے پہلے اس کی زیارت کریں۔ اسی سے طالبِ امداد ہوں اسی سے توفیقات کا مطالبہ کریں۔ اسی بارگاہ میں وہ ہاتھ اٹھائیں جنھوں نے اسے خلق کیا ہے تراشا ہے بنایا ہے اور پھر اسی سے خوفزدہ اور امیدوار رہوں۔

مگر کیا کہنا اس گھر کا جو ایسے ہی تنگ و تاریک ماحول میں خلیلی شعاعیں پیش کر رہا تھا اس کی روشنی دائم اور اس کا ثبات قائم تھا، اس پر نہ کفر کی تاریکیاں مسلط تھیں نہ جہالت کی ہوائیں۔ اس کا ایمان اتنا محکم تھا کہ ملتِ ابراہیم، توحیدِ الٰہی، شریعت غراء کے بارے میں کبھی شک کو اپنے دل میں جگہ ہی نہیں دی۔

اس گھرانے کو خلیلِ خدا سے دو قسم کے تعلقات تھے ایک نسل و ولدیت کا رشتہ اور دوسرا دینِ توحید کا تعلق، گویا کہ یہ مکان دعوتِ خلیل کا ایک تسلسل تھا جو اس وقت تک باقی رہ گیا تھا۔

اسی عمیق الایمان اور راسخ العقیدہ گھرانے میں جناب ابوطالب نے آنکھیں کھولیں اور حیات کے مدارج طے کیے۔ ظاہر ہے کہ اس گھر کی زندگی دوسری زندگیوں سے اور اس کا رہن سہن دوسرے لوگوں کے طور و طریق سے بالکل مختلف ہوگا۔

اس گھر کے ذمہ دار حضرت عبدالمطلب دوسرے انسانوں سے بالکل مختلف شخصیت کے مالک تھے وہاں پورے سماج میں ڈیل ڈول جسم و ہیکل کی بزرگی تھی۔ انسانی چہروں کو بہتات دل بھانے والے محاسن کی کثرت تھی عقل کا گذر نہ تھا۔ عالم یہ ہے کہ اگر کبھی انسان فریب نظر میں مبتلا ہو بھی جائے تو ایک مرتبہ گھبرا کر اسی طرح چیخ اٹھے کہ جس طرح دعبل نے ایک دنی توجہ کے بعد فریاد شروع کر دی تھی "ارے! یہ تعداد تو بہت ہے لیکن کوئی ایک نظر کیوں

نہیں آتا!

لیکن یہ ذمّہ دار انسان قوم میں محترم با اقتدار و باہیبت ہے اس کا قول مسموع اور اور اس کا حکم نافذ ہے۔ اس کی سخاوت شہرۂ آفاق اور اس کا کرم غیر منقطع ہے یہ مسافر کو اس کی سواری پر کھانا دیتا ہے اور طیور و وحوش کے لیے اس کے مساکن اور آشیانوں تک غذائیں پہنچاتا ہے اس کا لقب ایک طرف "فیاض" ہے تو دوسری طرف "مطعم طیر السماء" (اڑتی چڑیوں کو کھلانے والا) اس کی دعائیں مستجاب، اس کے مطالبات مقبول اور اس کی طلب پر لبیک ہی لبیک ہے گویا وہ آسمان کا محبوب اور زمین کا ہر دلعزیز ہے اسی لیے تو اُسے "شیبۃ الحمد" کہتے ہیں۔

اس میں جاہلیت کی کثافتیں، گمراہی کی پستیاں نہیں ہیں۔ وہ احکام بناتا ہے تو ایسے کہ جو اس کے پاکباز اور بلند نفس ہونے پر دلالت کریں، وہ اپنے طور طریقہ سے ملّتِ ابراہیمی کو باقی رکھنا چاہتا ہے۔ اس کی نظر میں شراب خوری، محرم عورتوں سے نکاح حرام ہے۔ کعبہ کا طواف سات مرتبہ ضروری ہے۔ ننگے ہو کر طواف کرنا ناجائز ہے، چور کے ہاتھ کاٹنا ضروری ہیں۔ زناکاری، لڑکیوں کا دفن کرنا، قمار بازی، جوا بازی کا ذبیحہ سب حرام ہیں۔ اور نذر کا پورا کرنا واجب[1]۔ اس کے یہ احکام اتنے مقدس و پاکیزہ تھے کہ اسلام نے سب ہی کو قائم و دائم رکھا۔

ابوسفیان کے باپ حرب بن امیہ بن عبدشمس سے ایک یہودی کا جھگڑا ہو گیا یہودی نے سربازار اسے بُرا بھلا کہہ دیا۔ حرب کو غیرت آگئی اپنی موروثی مکاری سے کام لینے کی ٹھان لی اور ایک شخص کو آمادہ کر کے اس یہودی کو قتل کرا دیا۔

جناب عبدالمطلب کو ان مکاریوں کی اطلاع نہ تھی اور آپ یہ بھی نہ چاہتے تھے کہ اس یہودی کا خون رائیگاں ہو جائے اس لیے آپ نے حرب کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ یہودی

۱: السیرۃ الحلبیہ ج ۱ ص۵ السیرۃ النبویہ ج ۱ ص۱۲ البحار ج ۶ ص۳۸ الجباس ص۱۶ ینابیع المودۃ ج ۲ ص۹

کے عزیزوں کو سو اونٹ بطور دیت پیش کرے[1]۔

ان تمام باتوں کے علاوہ آپ نے نہ کبھی بوسیدہ لکڑی کے ٹکڑے کو سجدہ کیا اور نہ کبھی کسی تراشے ہوئے پتھر کو، اس لیے کہ آپ ایک بافہم وشعور اور دانشمند و ذکی انسان تھے[2]

غار حرا میں عبادت کی بنیادیں آپ ہی نے قائم کی تھیں۔ جب ماہِ رمضان ہوتا تھا تو آپ پہاڑ پر چلے جاتے تھے اور چند دنوں تک عظمت و جلالت الٰہی میں تفکر و تامل کیا کرتے تھے۔

جناب ابوطالب نے اپنے باپ کا وہ وقت بھی دیکھا تھا جب ابرہہ خانہ کعبہ کو منہدم کرنے کیلئے آیا اور اس نے جناب عبدالمطلب کے جانوروں پر قبضہ کرلیا۔ آپ اس سے اپنے جانوروں کا مطالبہ کرنے کیلئے گئے تو اس نے نہایت درجہ توہین آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا "افسوس! کہ تمھیں اپنے اونٹوں کی فکر ہے اور اس گھر کی فکر نہیں جو تمھاری نظر میں مقدس ترین مکان ہے۔" اور آپ نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اپنے ایمان محکم اور قلب مطمئن کا ثبوت دیتے ہوئے فرمایا: انا رب الابل وللبیت رب یحمیہ (میں اونٹوں کا مالک ہوں مجھے انکی فکر ہے اس گھر کا مالک کوئی اور ہے وہ خود ہی حفاظت کریگا)

پھر اس کے بعد خانہ کعبہ کے قریب آئے اور زنجیر پکڑ کر مناجات کرنے لگے:

یارب لا ارجو لہم سواکا	یارب! فامنع منہم حماکا
خدایا اب تیرے سوا کوئی نہیں ہے	تو ہی اپنے حرم کی حفاظت کر
ان عدو البیت من عاداکا	امنعہم ان یخربوا فناکا

۱: السیرۃ الحلبیہ ج ۱ ص۱۸۔ ابن اثیر تاریخ کامل ص۲۰۹ پر اس واقعہ کو مختلف انداز سے نقل کیا ہے جس میں فیصلہ کو نوفل بن عبدالعزیٰ، عمر بن خطاب کی طرف منسوب کیا ہے۔ ۲: ابن ابی الحدید نے اپنی شرح کے جلد ۱ ص۲۹ پر دور بعثت کے حالات لکھتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ اس دور میں بھی بعض ایسے حضرات موجود تھے جو موحد متقی اور محتاط تھے جیسے جناب عبداللہ، جناب عبدالمطلب اور جناب ابوطالب۔

۳: کامل ابن اثیر ج ۱ ص۲۶۱ بحار ج ۶ ص۳۳۲، مروج الذہب ج ۳ ص۱۲۵

خدایا دشمن کعبہ تیرا بھی دشمن ہے اسے اتنا موقع نہ دے کہ اس مکان کو برباد کر سکے

اللہ اللہ کیا ایمان افروز اور توحید آمیز مناجات ہے۔

اس کے بعد دل کی آوازیں سنیں ـــــ "ضرور کوئی انتظام ہوگا!" اور کہنے لگا۔

لاھم ان العبد یمنع رحلہ فامنع حلالک

خدایا بندہ اپنے مال کا تحفظ کرتا ہے تو اپنے مال کا تحفظ کر

لایغلبن صلیبھم ومحالھم عدوا محالک

خدایا ایسا نہ ہو کہ مسیحیت کے آثار تیرے گھر پر غالب آجائیں

ولئن فعلت فانہ امر تتم بہ فعالک

آج کے تیرے فعل سے تمام افعال کی تکمیل ہو گی

انت الذی ان جاء باغ نرتجیک لہ فذالک

تو ہی وہ ہے کہ جب کسی باغی کے مقابلے میں تجھ سے کچھ چاہتے ہیں تو ملتا ہے

ولوا ولم یحوا سوی خزی وتھلکم ھنالک

خدایا یہ رسوا ہو کر پلٹیں اور انھیں ہلاک بھی کر دیا جائے۔

لم استمع یوما بارجس منھم یبغوا قتالک

میں نے اتنی گندی ذہنیت سنی بھی نہیں کہ اب تجھ سے بھی جنگ ہو گی۔

جروا جموع بلادھم والفیل کی یسبوا عیالک

یہ اپنے وطن کا سارا اجتماع مع ہاتھی کے لیکر آئے ہیں تاکہ تیری پناہ والوں کو پکڑیں۔

عمدوا حماک بکیدھم جھلا وما رقبوا جلالک

یہ تیرے حرم کا قصد کر چکے ہیں اور تیرے جلال کو بھول گئے ہیں۔

ان کنت تارکھم وکعبتنا فامر ما بدالک[1]

۱: کامل ابن اثیر ج ۱ صـ۲۶۱ بحار ج ۲ صـ۲۳۵ مروج الذہب ج ۳ صـ۱۲۸

اگر آج تو نے انھیں چھوڑ بھی دیا تو تیری خاص مصلحت ہوگی۔

پھر آپ نے قریش سے خطاب کر کے فرمایا: "یاد رکھو! یہ لوگ اس گھر تک نہیں پہنچ سکتے اس لیے کہ اس کا محافظ موجود ہے" پھر چپکے چپکے دعائیں شروع کر دیں۔ ادھر آسمان پر ابابیل اڑنے لگے۔ خاموش طیارے! تاکہ ایٹم بم سے بہتر بم گرائیں وہ بم جو مجرم کے علاوہ کسی کو نقصان نہ پہنچائے۔ بےقصور کو ہلاک نہ کرے آج کا سا ایٹم بم نہیں جو پوری بشریت کو ہلاک کر دے اور گنہ گار و بےگناہ کے امتیاز کو مٹا دے۔ یہ انسان کی ایجاد ہے اور وہ خالق بشریت کی تخلیق!

ابوطالب نے اپنے باپ کی وہ مناجات سنی ہے کہ جب اللہ نے آپ کو دس اولادیں عطا کر دیں اور ایفائے عہد کیلئے آپ نے قرعہ ڈالنا شروع کیا:

یارب انت۔ الملک المحمود	خدایا! تو قابل تعریف بادشاہ ہے
وانت ربی الملک المعبود	خدایا تو قابل پرستش شہنشاہ ہے
من عندک الطارف والتلید	خدایا نیا پرانا جو کچھ ہے تیرا ہی عطیہ ہے[1]

جناب ابوطالبؑ نے وہ مواعظ بھی سنے ہیں جن میں ترک ظلم و جور اور مکارم اخلاق کی تعلیم شامل تھی۔ جن میں اس دن سے ڈرایا جا رہا تھا جب ہر اچھے بُرے کو اس کے عمل کا بدلہ ملے گا۔

انھوں نے اکثر جناب عبدالمطلب کے یہ فقرات سنے ہیں "دنیا سے کوئی ظالم اس وقت تک نہیں جا سکتا جب تک اس سے انتقام نہ ہو جائے یا اس پر عتاب نہ ہو جائے"

جس پر کسی شخص نے اعتراض بھی کر دیا کہ ایسے لوگ مر رہے ہیں اور ان پر کوئی عتاب نہیں ہوا تو آپ نے نہایت ہی اطمینان سے جواب دیا "خدا کی قسم اس گھر کے بعد دوسرا گھر بھی ہے جہاں احسان کا بدلا اور گناہوں کی پاداش ملے گی"[2]

۱: السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۴۶،

۲: السیرۃ النبویہ ج ۲ ص ۲۱ سیرۃ حلبیہ ج ۱ ص ۴ العباس ص ۱۷ الغدیر ج ۷ ص ۳۵۲،

یہی حضرت عبدالمطلب اپنے فرزند عبداللہ کے یہاں ایک ایسے مولود کا استقبال کرتے ہیں جس کے نور سے سارا عالم منور ہو جاتا ہے جس کی شعاعوں سے دنیا میں روشنی پھیل جاتی ہے کیف و سرور کا یہ عالم ہے کہ ادھر بچہ عالم ہستی میں قدم رکھتا ہے ادھر دادا ماں کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ تاکہ ان آثار کا علم حاصل کرے جو وقت ولادت عالم ایجاد میں رونما ہوئے ہوں تھوڑی دیر کے بعد بچے کو گود میں لیکر خانۂ کعبہ کی طرف چلے تاکہ بارگاہِ الٰہی میں اس فضل و کرم نعمت و احسان کا شکریہ ادا کریں۔ زبان پر یہ کلمات جاری تھے:

الحمد للہ الذی اعطانی — ھذا الغلام الطیب الاردان

قد ساد فی المھد علی الغلمان — اعیذہ باللہ ذی الارکان

حتی اراہ بالغ البنیات — اعیذہ من شر ذی شنآن

من حاسد مضطرب العنان[1]

(شکر ہے اس معبود کا جس نے مجھے یہ طیب و طاہر بچہ عنایت کیا ہے۔ اللہ اسے بچائے! یہ بچہ تو گہوارہ ہی سے آثارِ سعادت رکھتا ہے اللہ اسے ہر افتراق پردازسے محفوظ رکھے اور اسے کامیاب بنائے خدا اسے حاسدوں کے شر سے اپنی پناہ میں رکھے!)

جناب عبدالمطلب نے اس بچہ کی سرپرستی شروع کر دی اور اس کی حفاظت و حمایت میں ہر ممکن کوشش کرنے لگے۔ اس لیے کہ آپ کی دُور رس نگاہیں اس بچہ کا مستقبل دیکھ رہی تھیں۔ آپ کو معلوم تھا کہ ایک دن شرق و غرب اسی کے زیر اقتدار ہوں گے۔ سارے سر اس کی بارگاہ میں خم ہوں گے، ساری پیشانیاں اس کے سامنے جھکیں گی، دل اسکی محبت سے سرشار ہوں گے، زبانیں اس کے تذکرے کریں گی تعظیم و تجلیل اس کے قدم چومیں گی۔

اب عالم یہ ہے کہ عبدالمطلب جیسا باہیبت و جلال باعظمت و شکوہ انسان خانۂ کعبہ

۱: اعیان الشیعہ ج ۲ ص ۱۰، مروج الذہب ج ۲ ص ۲۸۱ بحار ج ۶ ص ۴۹، بحار ج ۶ ص ۱۹
(قدرے اختلاف کے ساتھ)

کے اطراف میں اپنا فرش بچھاتا ہے کسی انسان میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ اس فرش پر قدم رکھ سکے سب دور ہی دور سے مشاہدہ کر رہے ہیں۔

لیکن یہ طفل یتیم نہایت ہی سکون و اطمینان کے ساتھ آتا ہے اور بیباکانہ انداز سے مجمع کو چیرتا ہوا اپنے دادا کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اب اس بچے کے قدم ہیں اور دادا کا وہی فرش۔ اب اگر لوگ ہٹانا بھی چاہتے ہیں تو آپ منع کر دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اس کی ایک حیثیت ہے"۔ اسے پہلو میں جگہ دیتے ہیں، پشت پر بٹھاتے ہیں چہرہ سے فرحت و انبساط آثار نمایاں ہیں خطوط رخ اتھاہ مسرت کی غمازی کر رہے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس سے لگی ہوئی آس ضرور پوری ہوگی اور اس سے بندھی ہوئی امیدیں ضرور کامیاب ہوں گی۔

کبھی کسی روکنے والے سے کہتے ہیں "میرے بیٹے کو بیٹھنے دو اس لیے کہ یہ اپنے دل میں کچھ عظمت محسوس کرتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اسے وہ شرف حاصل ہوگا جو کسی عرب کو نہ اس سے پہلے ملا ہے اور نہ اس کے بعد مل سکے گا"

کبھی فرماتے ہیں "میرے بچے کو میری جگہ پر آنے دو۔ اس کے دل میں ملک عظیم کے جذبات ہیں عنقریب اس کی ایک عظمت و حیثیت ہوگی"[1]

کبھی جناب ابوطالبؑ سے فرماتے ہیں "اے ابوطالبؑ! اس بچے کی بڑی شخصیت ہے، اس کو بچاؤ، اس سے تمسک کرو، یہ تنہا ہے اس کو ماں کی طرح سے پرورش کرو، دیکھو کوئی ناگوار خاطر بات نہ ہونے پائے"[2]

یاد رکھیے جناب عبدالمطلبؑ کے یہ کلمات بے ربط نہیں تھے، آپ کو فضول گوئی کی عادت نہ تھی، آپ بیجا گفتگو کے قائل نہ تھے بلکہ آپ چہرہ کے خطوط سے اندازہ کر رہے تھے کہ اس کا مستقبل ایک عظیم شخصیت اپنے ہمراہ لا رہا ہے۔

۱: السیرۃ الحلبیہ ج ۱ ص ۱۲۹ السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۲۳ سیرۃ ہشام ج ۱ ص ۱۷۰ بحار ج ۶ ص ۲۲ العباس ص ۱۵ حاشیہ سیرت ج ۱ ص ۱۵۵ ، ۲: مجالس سنیہ ج ۲ ص ۲۶ ،

آپ کو اپنی رائے پر اعتماد اور اپنے عقیدہ پر کامل وثوق تھا۔ آپ کے لیے زندگی کا ہر پہلو اور ماحول کا ہر اندازہ ایک پیشین گوئی کی حیثیت رکھتا تھا۔ بنی مدلج جو عرب کے مشہور اور ماہر ترین قیافہ شناس تھے، آپ سے کہا کرتے تھے "محمدؐ کو بچاؤ"۔ اس لیے کہ اس کے قدم ابراہیم کے قدم سے بہت زیادہ مشابہ ہیں"۔

سیف بن ذی یزن الحمیری بادشاہ یمن سے مقابلے میں کامیاب ہوتا ہے حبش کی حکومت ہاتھ آتی ہے، سارے عرب کے وفد مبارکباد کے لیے آتے ہیں، سب سے آگے آگے قریش کا وفد ہے جس کے نمایندہ اور امیر کارواں جناب عبدالمطلبؓ ہیں۔

بادشاہ کے سامنے پہنچتے ہی آپ کا وہ خطبہ شروع ہوتا ہے جو فصاحت و بلاغت کا معجزہ ہے، وہ خطبہ جسے سن کر سیف جیسا بادشاہ عظمت و جلالت، شخصیت و حیثیت سے مرعوب ہو کر جھک جاتا ہے، استقبال کرتا ہے، تعظیم و تکریم بجا لاتا ہے اور معزز مہمانوں کی طرح قیام کا انتظام کرتا ہے۔ ایک مہینے تک یہ مہمانی باقی رہتی ہے۔ ایک دن سیف جناب عبدالمطلب کو طلب کرتا ہے تاکہ انھیں ایک بشارت دے۔ اس کا خیال یہ ہے کہ آپ کو اس کی خبر نہیں ہے سیف کی نظر میں خبر ایسی ہے کہ جس کے چار طرف فضیلت و آثار ہیں، علم کی روشنی ہے، دنیا کی سیادت ہے اور اس میں جناب عبدالمطلب کا بھی حصہ ہے کہتا ہے جب مکہ میں ایسا بچہ پیدا ہو جس کی پشت پر نشان ہو تو سمجھ لینا کہ وہ امام ہے اور اس کے ذریعہ تمھارے لیے قیامت تک کی ریاست و زعامت ہے"۔ اس کے بعد بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے "اس کا نام محمدؐ ہوگا اس کے ماں باپ مر جائیں گے اور اس کی تربیت دادا اور چچا کے ہاتھوں ہوگی"۔

دل بے چین ہو جاتا ہے اور مزید اسرار کھولتے ہوئے کہتا ہے "اس گھر کی تمام علامات واضح ہیں اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ تمھیں اس کے دادا ہو"۔

یہ سننا تھا کہ آپ سجدہ میں گر پڑتے ہیں، شکر خدا بجا لاتے ہیں، مناجات کرتے ہیں۔

اب جو سر اٹھاتے ہیں تو سینے میں خنکی، چہرے پر سرخی، لبوں پر تبسم اور زبان پر اس نبی کی زندگی کے قصے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ اس کے ماں باپ مر چکے ہیں اور اب اس کے چچا اور ہم اس کے کفیل ہیں [1]"۔

یہ دلائل ایک طرف اور پیغمبر اکرمؐ کی زندگی کے کثیر معجزات و علامات ایک طرف۔ ہر علامت ایک مستقل برہان اور ہر کرامت ایک سکون بخش دلیل اور ان تمام دلائل و براہین کا خلاصہ یہ ہے کہ یہی محمدؐ وہ ہے جس کا ذکر کتب سماویہ میں پایا جاتا ہے اور یہی رسول وہ ہے جس کی بشارت گزشتہ رسولوں نے دی تھی۔

ایک مرتبہ قحط کا زمانہ آیا، بارش کا سلسلہ منقطع ہو گیا، صحرا کی گھاس سیاہ اور جانوروں کا دودھ خشک ہو گیا۔ زندگی سخت، حیات دشوار، دنیا تاریک، عالم سیاہ، چار طرف غم و الم، شش جہت میں خوف و ہراس، چہرے پر زردی، جسم زرد و سیاہ، کوئی ایسا نہیں جس کے پاس جائیں اور وہ اپنے پاکیزہ نفس اور مقدس زبان سے بارگاہِ احدیت میں فریاد کرے کہ آسمان چند قطرات ہی سے کرم کرے اور دنیا کی گئی ہوئی شادابی پلٹ آئے۔

نظر پڑتی ہے تو صرف جناب عبد المطلب پر، یہی اگر چاہیں تو قریب المرگ نفوس و حیوانات اور نزدیک بہلاکت و تباہی اموال پر رحم کھا کر اللہ کی بارگاہ میں التماس کریں دعا کریں، سفارش کریں کہ بارش ہو!

لوگ جناب عبد المطلب کے پاس آئے، آپ ان کی خواہش پر چلے، گود میں محمدؐ ہیں چار طرف سے نوجوان حلقہ کیے، نجابت کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے، شرافت کی نسیم چل رہی ہے، کوہ ابو قبیس پر پہنچتے ہیں، رقت و رحمت سے بھرے ہوئے دل اور ایمان سے

---

[1] سیرۃ الحلبیہ ج ۱ ص ۱۲۵-۱۲۶، سیرۃ نبویہ ج ۱ ص ۶۶، ۶۸، ۷۹، بحار ج ۶ ص ۱۲

لبریز سینے سے کچھ کلمات نکلتے ہیں، لبہائے مبارک کو جنبش ہوتی ہے۔ آواز آتی ہے

اللھم ھولاء عبیدک وبنو عبیدک واماؤک وبنو اماتک
وقد نزل بنا تری وتتابعت علینا ھٰذہ السنون فذاھبت
باللطف والخف والحافر فاشفت علی الانفس فاذھب عنا
بجدب وائتنا بالحیاء والخصب

(خدایا یہ تیرے بندے اور تیرے بندوں کی اولاد ہیں، خدایا یہ تیری کنیزیں اور تیری کنیزوں کی ذریت ہیں، انھیں قحط نے ستا رکھا ہے سارے جانور ہلاک ہو گئے ہیں اور جانوں کی باری آ گئی ہے خدایا اس قحط کو دور کر دے اور ہمیں ابر کرم سے شاداب کر کے ہماری زمینوں کو سبز کر دے)

کیا کہنا اس ایمان بھری دعا کا، اسے تو خدائے رحیم ضرور ہی سنے گا۔۔ اور قبول بھی کرے گا۔

ابھی مجمع دامن کوہ سے آگے نہ بڑھا تھا کہ ابر گھر گھر کر آنے لگا؛ بارش کے ساتھ شادابی کے آثار نمایاں ہونے لگے، بادل فیاضی پر اتر آئے؛ آسمان سخاوت پہ کمربستہ ہو گیا، وادیاں سیلاب کی تیاریاں کرنے لگیں۔ لبوں پر تبسم، دلوں میں راحت آنکھوں میں شوخی نظر آنے لگی۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ کچھ چہروں پر غیظ و غضب، کچھ دلوں سے بغض و حسد اور کچھ آنکھوں سے عداوت و کینہ کے شرارے اٹھنے لگے۔

فرق یہ تھا کہ ان شراروں کی راہیں بند ہو چکی تھیں اور ان مسکراہٹوں کے دروازے کھلتے جا رہے تھے۔

ابھی قافلہ مکہ کے قریب پہنچا ہی تھا کہ ایک باریک اور سریلی آواز کانوں میں آنے لگی۔ لہجہ شیریں، تاثر دلپذیر اور ترنم کیف آور تھا۔ یہ کیا تھا؟ ابی صیفی بن ہاشم

کی لڑکی کا ترنم جو انتہائی کیف و سرور کے عالم میں کچھ شعر گنگنا رہی تھی:

بشیبۃ الحمد اسقی اللہ بلدتنا ۔ وقد عدمنا الحیاء واجلوذ المطر

فجابالماء جونی لہ سبل ۔ دان فعاشت بہ الانعام والشجر

منا من اللہ بالمیمون طائرہ ۔ وخیر من بشرت یوما بہ مضر

مبارک الاسم یستقی الغمام بہ ۔ ما فی الانام لہ عدل ولا خطر[1]

(اللہ نے شیبت الحمد کے طفیل میں اس وقت سیراب کیا جب بارش کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ بادلوں نے وہ موسلادھار پانی برسایا کہ درختوں اور جانوروں کی زندگی بن گئی۔ یہ اللہ کا کرم اس کے صدقے میں تھا جو قبیلہ مضر کا بہترین انسان تھا جس کا نام مبارک جس کی ذات بے مثل و عدیل اور جس کے وسیلے سے بادل مائل بہ کرم ہوتے ہیں)۔

پانی برسا سیل رواں ہوئی، سبزہ اُگنے لگا، دُنیا مطمئن ہو گئی۔ لیکن قیس و مضر کے شہروں تک اس پانی کا ایک قطرہ بھی نہ پہنچا، وہ اسی طرح پریشان حال رہے اور ابر کرم کا منہ تکتے رہے۔ آخر کار بزرگوں نے اجتماع کیا اور یہ طے کیا کہ انہیں عبدالمطلب کی خدمت میں چلیں جن کے پاس اہلِ مکہ گئے تھے۔ یہی وہ شخص ہیں جن کی دعا رد نہیں ہوتی۔ اور یہی وہ انسان ہے جو زمین و آسمان دونوں پر[2] تسلط رکھتا ہے۔

۱: سیرۃ حلبیہ ج ا ص ۱۳۲، سیرۃ نبویہ ج ا ص ۶، بحار ۶ ص ۱۲۷، ۱۲۸، شرح ابن ج ص ۱۵، قدرے اختلاف کے ساتھ

۲: زمین کے تذکرہ سے ایک تو چاہ زمزم کی طرف اشارہ ہے دوسرے اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جب آپ قریش کے فیصلے کیلئے جا رہے تھے اور راستہ میں پانی کے نہ ہونے کی وجہ سے آپ کے اصحاب قریب ہلاکت پہنچ چکے تھے قریش نے بھی پانی دینے سے انکار کر دیا تھا اور آپ کے کرم و فضل کی وجہ سے گھوڑے کے سُم سے چشمہ نکل آیا تھا اور سب سیراب ہو گئے تھے اور تاریخ میں ان کا پانی پلانا اور لوگوں کا پانی بند کرنا ثبت ہو گیا تھا۔

یہ طے کرنے کے بعد قافلہ مکہ آیا۔ جناب عبدالمطلب کے پاس سب حاضر ہوئے آپ نے خوش آمدید کہا۔ نمایندہ نے اپنے بیان کو شروع کر دیا ہے اس لیے کہ حالات میں تاخیر کی گنجائش نہیں ہے اور زمانہ بڑی شدت و سوزش کے ساتھ گزر رہا ہے۔ ہر لحظہ موت سر پر سوار ہے اور گرمی کی تپش بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ نمایندہ نے واضح الفاظ میں یوں درخواست کی: ہمارے ہاں قحط پڑ گیا ہے ہمیں آپ کی خبر ملی ہے ہم نے آپ کے کلام کی تاثیر سنی ہے، آپ ہمارے واسطے بھی سفارش فرمائیں اس لیے کہ آپ کو حق شفاعت ملا ہے اور آپ کی دعا پر بارش ہوتی ہے۔

جناب عبدالمطلب نے یہ درخواست سنی اور وعدہ فرمالیا دوسرے دن حسب وعدہ عرفات میں پہنچے، چاروں طرف سے لوگوں کا ہجوم اور گود میں یتیم عبداللہ محمدؐ! جلالت کی شعاعیں نمودار، عظمت کی کرنیں درخشندہ، بچے کو لیکر اپنی کرسی پر بیٹھے، دعا کے لیے ہاتھ بلند کر دیے خشوع بھری آواز، ایمان سے لبریز دل اور عقیدہ سے مطمئن نفس مشغول مناجات ہو گیا۔ خدایا! اے چمکتی بجلی، گرجتی بدلی کے مالک، اے کُل کے پروردگار، اے مشکلوں کو آسان کرنے والے! یہ قیس و مضر جو سر فراز تھے خاک لبہ ہو گئے ہیں، لاغری سے اُن کی کمریں جھک گئی ہیں، اب تو یہ جان و مال کی بربادی کی فریاد لیکر آئے ہیں۔ خدایا ابر کرم بھیج کر اُن کی زمین کو ہنسا دے اور ان کے نقصان کا مداوا کر دے۔

ابھی دُعا اسی حد تک پہنچی تھی کہ سیاہ ابر گھرنے لگے۔ بارش کے آثار دعا کی قبولیت کی سند لیکر آئے، بادلوں نے دور دراز شہروں کا قصد کیا جناب عبدالمطلب نے قوم سے خطاب کیا اے قبیلہ قیس و مضر والو! جاؤ تم سیراب ہو گئے۔[1]

باپ کے یہ فقرات سُن کر بیٹے سے ضبط نہ ہو سکا اور جناب ابوطالب کی زبان پر بیساختہ یہ اشعار جاری ہونے لگے:

---

[1] سیرت حلبیہ ج ۱ ص ۱۳۳ ـ سیرت نبویہ ج ۱ ص ۶۵

ابونا شفیع الناس حسین سقو بہ ۔۔۔ من الغیث رجاس العشیر بکور
ونحن سنین المحل قام شفیعنا ۔۔۔ بمکۃ یدعو والمیاہ تغور
فلم نبرح الاقدام حتی رأیتها ۔۔۔ سحابات مزن سوبھن درور
وقیس اتتنا بعد أزم وشدۃ ۔۔۔ وقد عضها دھراکب عثور
فما برحوا حتی سقی اللہ ارضھم ۔۔۔ لبشیبۃ غیثاً فالنبات نضیر[1]

(ہمارا باپ وہ ہے جس کی وساطت سے موسلادھار بارش ہوتی ہے ہمارا شفیع وہ ہے جس کی دعا اتنی زود اثر ہے کہ جب مکہ میں دعا شروع کر دی تو لوگوں کے بیٹھنے سے پہلے ہی ابر باری لیکر آگئے اور طوفانی بارش کا سامان ہو گیا۔ بنی قیس شدائد و مصائب سے عاجز ہو کر ہمارے ہی پاس آئے تھے ہماری ہی دعا نے ان کی زمینوں کو سیراب کیا اور انہیں شادابی پیدا کی تھی)

اسی شان سے جناب عبدالمطلب کی پاکیزہ، روشن اور ضو فشاں زندگی گزر رہی تھی ہر لمحہ کتب سماویہ کی پیشین گوئیاں سامنے آرہی تھیں لیکن رسالت اس وقت پیشانی کا نور بنی ہوئی تھی۔ ایک وقت وہ آیا جب اس نور پر سرور کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اب کیا پوچھنا تھا تربیت کا خاص انتظام، شفقت و محبت کے نئے اصول!

بھلا ایسا بچہ جس کا مدت سے انتظار رہا ہو جس کی محبت تمام بچوں پر غالب آگئی ہو اس قابل ہو سکتا ہے کہ کسی وقت بھی اسے فراموش کر دیا جائے، یا اس سے غفلت برتی جائے؟ ہرگز نہیں! یہی وجہ تھی کہ ۸۲ یا ۸۵ سال کی زندگی کے آخری لمحات تک اس بچے کا خیال ذہن میں رہا۔ موت کی سختیاں سامنے آگئیں، آنکھیں پتھرانے لگیں۔ اولاد و اقارب جمع ہو گئے لیکن اس وقت بھی ایسے شخص کی تلاش میں ہیں

۱: اثبات الوصیۃ ص۸۵،

جو اس بچے کی حفاظت کر سکے، اسے قریش کے شر سے بچایا جا سکے۔ یہ فکر کوئی معمولی فکر نہ تھی۔ اس کے پس منظر میں دائمی راحت اور ابدی قرار مضمر تھا۔

ایک مرتبہ نظر ابوطالبؑ پر جم گئی اور یہ طے کر لیا کہ یہ بارِ گراں اسی دوش پر اٹھ سکے گا۔ اس لیے کہ یہ اس جہاد میں برابر کا شریک رہ چکا ہے۔ فرمانے لگے:

"اے عبدمناف! تمھیں ایک یتیم و بیکس کے بارے میں وصی بنائے جاتا ہوں[1]"

یہ کہہ کر حسب ذیل اشعار وردِ زبان کئے:

وصیۃ من کنیۃ بطالب ۔۔۔ عبد مناف وھو ذو تجارب[2]

یا ابن الحبیب اکرم الاقارب ۔۔۔ یا ابن الذی قد غاب غیر آئب

(میں نے ابوطالب جیسے تجربہ کار آدمی کو وصی بنایا ہے اس کے بیٹے کا جو مجھے عزیز و محبوب تھا اور اب جس کے واپس آنے کی کوئی امید نہیں ہے۔)

اس وصیت نے ابوطالب کے دل میں اس طرح گھر کر لیا کہ بے ساختہ بول اٹھے:

لا توصنی بلازم و واجب ۔۔۔ انی سمعت اعجب العجائب

من کل حبر عالم و کاتب ۔۔۔ بان بحمد اللہ قول راہب[3]

(آپ مجھے لازم و واجب کام کیلئے نصیحت کریں میں نے تو بڑے بڑے علماء سے عجیب عجیب خبریں سنی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس قول کی صحت ظاہر ہو گئی۔)

۱: اعیان الشیعہ ج ۳ ص ۴، ۳۹ ص ۱۲۵ ۔ عمدۃ المطالب ص ۶ ، مناقب ج ۱ ص ۲۱ بحار ج ۶ ص ۱۴ معجم القبور ج ۱ ص ۱۸۳ ۔

۲: اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۲۵ اس مقام پر مؤلف اعیان نے عبارت میں بجائے کنیۃ کے کفلتہ بیان کیا ہے جو کہ معنی کے اعتبار سے غلط ہے اصل وہی ہے جو یہاں نقل کیا گیا ہے واللہ اعلم

۳: مناقب ج ۱ ص ۲۱ ۔ عباس ص ۱۹ ، اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۲۵ ۔

اس کے بعد جناب عبدالمطلبؑ نے پھر ابو طالبؑ سے خطاب کیا:
"دیکھو! اس کی حفاظت کرنا، اس نے باپ کا لطف دیکھا ہے نہ ماں کی مامتا!
یہ تمہارے جگر کی مانند ہے میں نے اپنی تمام اولاد میں تمہارا انتخاب کیا ہے اس لیے کہ
تم اس کے باپ کے حقیقی بھائی ہو[1]۔ یاد رکھو اگر ممکن ہو تو اس کا اتباع کرنا، زبان
اور مال سے اس کی نصرت کرنا۔ یہ عنقریب سردار بنے گا اسے وہ کچھ ملے گا جو ہمارے
آباؤ اجداد میں کسی کو نہیں ملا تھا[2]۔ اچھا تمھیں یہ سب قبول ہے؟"
ابوطالب نے عرض کی۔ کیوں نہیں سب قبول ہے اور خدا اس کا شاہد ہے
"عہد تمام ہو گیا۔ ذمہ داری ختم ہو گئی۔ دل مطمئن اور ضمیر بالیدہ ہو گیا۔ فرمانے لگے
"ہاں اب موت آسان ہو گئی ہے"
پھر محبت سے اپنے بچے کو گلے سے لگالیا، بوسے دیے ایک باپ کی سی شفقت و
محبت کا اظہار کیا۔ فرمانے لگے میری اولاد میں تجھ سے زیادہ باوقار، پاکیزہ اور باوجاہت
کوئی نہیں ہے[3]۔

۱: المجالس السنیہ ۴ ص۲۷ - بحار ج ۶ ص۴۳ ۲: المجالس السنیہ، بحار
۳: بحار ج ۶ ص۴۳، اثبات الوصیہ ص۱۰۱، الحجۃ ص۷ (اختلاف عبارات کے ساتھ)

شخصیت

ایسے بلند پایہ، رفیع الشان، جلیل القدر خاندان اور ایسے شفیق باپ کے تعلیمات و ارشادات کے زیرسایہ جناب ابوطالب نے زندگی کے لمحات گزارے جس کا ماضی خود ہی دل میں مستقبل کی راہیں بناتا اور جس کی عظمت خود ہی صراط مستقیم کی دعوت دیتی ہے۔

اگر انسان کی شخصیت اور اسکی عظمت میں وراثت کو بھی دخل ہے جیسا کہ علماء نفس نے بیان کیا ہے تو ابوطالب نے اس وراثت سے ایک لامتناہی فائدہ حاصل کیا ہے اور یہی وہ دلیل ہے جس سے کوئی نفسیاتی انسان انکار نہیں کرسکتا۔

درحقیقت ابوطالبؑ اپنے خاندان کی وہ نورانی، بارونق و عظمت اور باہیبت جلالت تصویر ہیں جس میں عبدالمطلب سے لیکر مورث اعلیٰ تک کے کمالات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

اب اگر ابوطالبؑ انسانیت کی تصویر کامل اور بشریت کا مثالی نمونہ نظر آئیں تو تعجب نہیں اس لیے کہ قدرت نے انھیں اپنے نبی کی کفالت کیلئے منتخب کیا ہے۔

اب اگر ابوطالب اس قدر بلند پایہ اور جلیل القدر ہوں تو محل استعجاب نہیں ہے اس لیے کہ انھیں کی نگرانی میں رسول اکرمؐ نے جوانی کے وہ لمحات گزارے ہیں جو انسانی زندگی کا سخت ترین دور شمار ہوتے ہیں اور جس میں احساس، تاثر اور فعالیت کے جذبات پورے شباب پر ہوتے ہیں

گویا ابوطالبؑ کی ذات عظمت و حفاظت دونوں جلالتوں کا مرکز بنی ہوئی تھی عظمت نے رسول اکرمؐ کا کفیل بنایا اور حفاظت نے ناصر رسولؐ، مومن کامل قرار دیا اب ابوطالب کی ذات شیخ بطحا بھی ہے اور بیضۃ البلد بھی!

کتنا حسین امتزاج تھا اس عظمت وحفاظت کا کہ اگر کوئی تاریخ حیات میں دونوں کے درمیان حدِ فاصل قرار دینا چاہے تو ایک دشوار طلب اقدام کیا جائیگا اور جب حضرت ابوطالب کو قدرت نے اس اہم کام کے لیے منتخب کیا تو ان کی ذات کا اتنا باعظمت ہونا بھی ایک ضمنی حیثیت رکھتا تھا۔

بھلا کیا تعجب ہوسکتا ہے اس بات میں کہ ابوطالبؑ زندگی بھر اپنے باپ کیلئے شریک زعامت بھی رہیں اور شریک حفاظت بھی[1]۔ باپ کے بعد زعیم اول اور محافظ وحید دونوں درجوں پر فائز ہو جائیں۔ اور کفالت کی وہ ذمہ داریاں برداشت کریں جن میں ان کا کوئی شریک نہ ہو سکے۔

ایسا باعظمت ماضی اور اتنا پُربہار اور روشن حال جس شخصیت کی تشکیل دے گا اس کا خیر اتنا عام، اس کے ثمرات اتنے عمومی اور اس کی خوشبو اتنی دور رس ہوگی جس سے دوست اور دشمن دونوں ہی استفادہ کرسکیں گے جس طرح ضیائے آفتاب کیلئے پہاڑوں کی چوٹیاں اور گھاٹیاں دونوں برابر ہیں۔ اب اس کا کیا کیا جائے کہ زکام زدہ ناک خوشبو کا احساس نہیں کرتی۔ آشوب زدہ آنکھ چمکتی ہوئی شعاعوں کو نہیں دیکھ سکتی۔

حضرت ابوطالبؑ کی شخصیت میں عظمت وحفاظت کا یہ امتزاج ایک ایسی شے ہے جس کی نظیر تاریخ میں نہیں مل سکتی ۔ ظاہر ہے کہ عظمت و زعامت کا شرف تھوڑے مال سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کیلئے ایک عظیم ثروت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو شخصیت کی بنیادیں مضبوط کرے تاکہ عظمت کی تمنا دل ہی دل میں گھٹ کر نہ رہ جائے!

لیکن کیا کہنا ابوطالبؑ کا! یہ وہ زعیم اول اور رئیس اکبر تھے جس نے پورے عالم پر زعامت کا شرف حاصل کیا لیکن نہ زر و جواہر کی تھیلیاں تھیں[3] نہ سیم و زر کے معبود!

۱: السیرۃ الحلبیہ ج ۱ ص ۱۳۴ ۲: شرح النہج ج ۱ ص ۹ ج ۳ ص ۴۶۲ السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۹۹ رسائل جاحظ ص ۱۰۹ معجم القبور ص ۱۸۹ اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۲۴ الامام علی صوت العدالۃ ج ۱ ص ۵۵،

یہ اور بات ہے کہ معادن وجواہر سیم وزر سے خالی لیکن خصائص نفسانیہ اور کمالات روحانیہ کی وہ دولت اپنے پہلو میں چھپائے ہوئے تھا جس میں اس کا شریک کوئی نہ تھا اور جو اس کی عظمت و شخصیت کو حتمی بنا رہی تھی۔ اور درحقیقت یہی وہ عظمت ہوتی ہے جو قابلِ اعتراض نہیں ہوتی اور یہی وہ منصب ہوتا ہے جو ہر شخص کو نہیں مل سکتا۔

ابوطالبؑ نے وراثت میں اپنے باپ کے تمام خصوصیات و کمالات لے لیے۔ گھر میں کچھ نہیں لیکن جود وسخا کا یہ عالم کہ ابر بہار بھی شرمندہ ہو جائے، سخاوت و عطا کا وہ منظر جسے دیکھ کر بادل کو بھی پسینہ آجائے۔ ظاہر ہے کہ اس سخاوت کا لازمی نتیجہ زیرباری ہوتا تھا چنانچہ حضرت ابوطالبؑ نے اسے بھی برداشت کر لیا لیکن یہ برداشت نہ کرسکے کہ خاندانی روایات اور پدری خصوصیات کو خیرباد کہہ دیں۔

باپ کے انتقال کے بعد حاجیوں کی سقایت کا انتظام سنبھالا، طریقہ یہ تھا کہ چاہ زمزم میں خرمہ و کشمش ڈال دیا جاتا تھا تاکہ اس کا پانی شیریں ہو جائے اور صحرا کی تپش سے جھلسے ہوئے چہرے کسی حد تک شاداب ہو سکیں۔

ایک ایسا وقت بھی آگیا جب حضرت ابوطالبؑ بالکل مفلس ہو گئے لیکن باپ کی سیرت مجبور کر رہی تھی کہ اپنی خاندانی روایات پر عمل کیا جائے۔ چنانچہ کمر ہمت باندھ کر اپنے بھائی عباس کے پاس پہنچے اور دس ہزار درہم ایک سال کیلئے بطور قرض طلب کیے تاکہ دور دراز سے آنے والے حاجی تلخ پانی نہ پئیں۔

سال گزر گیا اور ابوطالبؑ قرض ادا کرنے کے قابل نہ ہو سکے۔ افلاس کا یہ عالم رہا کہ اب اس سال کی مزید فکر پیدا ہو گئی۔ چنانچہ دوبارہ عباس سے چودہ ہزار درہم کا مطالبہ کیا۔ اس وعدہ پر کہ آئندہ سال تک سب ادا کر دیں گے۔ عباس نے اس مرتبہ یہ شرط کر لی کہ اگر آئندہ سال تک قرض ادا نہ ہوا تو سقایت کو ان کے حوالے کر دینا پڑیگا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔[1]

---

[1] شرح النہج ج ۳ ص ۴۶۱ السیرۃ الحلبیہ ج ۱ ص ۱ السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۱ کامل ج ۲ ص ۱۱ مجالس ج ۱ ص ۳۴

ظاہر ہے کہ سقایت کے ہاتھ سے نکل جانے کا کوئی اثر حضرت ابوطالبؑ کی شخصیت پر نہ ہوگا۔ اس لیے کہ وہ خیر کا منبع اور آسمان وزمین کے اتصالات کا مرکز تھے۔ ان کے خصوصیات و کمالات اتنے زیادہ تھے کہ جن کا بیان کرنا اس مقام پر ممکن نہیں۔

انھیں خصوصیات میں سے ایک بات یہ بھی کہ آپ کی ہیبت اور آپ کا وقار اتنا زیادہ تھا کہ آپ کے زیر سایہ رہنے والے ہر بلا سے محفوظ رہتے تھے۔ نہ زمانہ کی آندھیاں انھیں خوفزدہ کر سکتی تھیں اور نہ دنیا کے شدائد انھیں نرم بنا سکتے تھے۔

انھیں صفات میں سے ایسے علامات بھی تھے جو ہر انسان کو اس بات پر مجبور کرتے ہیں کہ وہ بلا شک و شبہہ اس بات پر ایمان لے آئے کہ آپ ملت ابراہیمؑ کے پابند اور توحید پرست تھے۔ جاہلیت کی خباثتیں، اس کی گندگیاں اور اس کے شر و قلق آپ کو اپنے رنگ میں نہ رنگ سکے۔ زمانہ کے کفر آمیز حالات آپ کو ایک آن کیلئے بھی اپنے مسلک سے نہیں ہٹا سکے۔

وہ ماحول جس میں آپ کی تربیت ہوئی جس میں آپ نے شعوری زندگی کے دن گزارے جو ہر انسان کی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے جو ہر بنی نوع کی فطری اور فکری راہیں معین کرتا ہے وہ بھی آپ کو متاثر نہ کر سکا صرف اس لیے کہ آپ ایک باہوش و فکر، دور رس، نکتہ سنج اور سلیم الفکر انسان تھے۔ آپ کو وراثت میں بشری کمالات اور انسانی نفسیات عطا ہوئے تھے۔

یہی وہ چیزیں تھیں جنھوں نے آپ کو ماحول سے متاثر نہ ہونے دیا، جنھوں نے آپ کو معیار سے گرنے نہ دیا۔ بلکہ آپ میں ایک ایسی قوت پیدا کر دی جس سے خود ماحول کو بدل دیں، انسانیت کو علم و عقل سے آشنا کر دیں، کیوں نہ ہوتا اب تو کوئی رسول بھی موجود نہ تھا اور اتمام حجت کیلئے ایک مصلح و مرشد کی بھی ضرورت تھی!

۱: شرح النہج ج ۱ ص ۳۴ ؛ ۲: العباس ص ۱۹، بحار ج ۶ ۔ ۳۰۲، ۳۷۵ ۔ اکمال صدوق ۱۰۲ معجم القبور ج ۱، ۱۹۰، ۲۰۰ ۔ الغدیر (علامہ طبرسی نے آپ کے حجت ہونے پر اجماع شیعہ کیا ہے)

حضرت عبدالمطلب کے بعد ابوطالبؑ کا وجود ایک تاریخی ضرورت تھا۔ اور آپ کی یہ پاکیزہ سیرت ایک مقدمہ بھی اس رسالت کیلئے جس کے انوار پھیلنے والے اور جس کی کرنیں پھوٹنے والی تھیں قدرت نے نہ چاہا کہ وہ نور کامل یکبارگی سامنے نہ آجائے کہ دنیا کی نظریں خیرہ ہوجائیں اس لیے ہراول کے طور پر ایسے فرد کو بھیجا جو اپنے کمالات اور اپنی سیرت سے بشریت کو اس نور کامل سے اکتساب فیض کے قابل بنادیں۔

حقیقتاً ایک ایسے چراغ کی ضرورت تھی جس کی لو ایک شعاع اکمل کا پیش خیمہ ہو، ایک ایسے ستارے کی حاجت تھی جس سے روشنی حاصل کی جاسکے یعنی اتمام حجت کیلئے ایک ایسے ہی انسان کی ضرورت تھی جو ابوطالب ہو!

کھلی ہوئی بات ہے کہ جس انسان کو رسول اکرمؐ کی بشارت اور ان کے وجود کا مقدمہ بنایا جائیگا اسے تمام کمالات وخصوصیات میں فرد اکمل ہونا چاہیے تاکہ اس کے ذریعہ بشریت آنے والے کمالات کا اندازہ کرسکے۔ اور تحمل انوار کی عادی بن جائے

یہی وجہ ہے کہ آپ خیر کا سرچشمہ، حوادث وآفات کی جائے پناہ، مصیبت زدہ کا ملجاو ماویٰ، نادار کیلئے ابرکرم، حیات کیلئے شادابی، بارش کیلئے ذریعہ توسل، صلۂ رحم کے پابند مشکلات کے معالج، نیک سیرت، رحمدل، بے منت کے محسن، بے طلب کے سخی، ارادہ کے قوی، فصاحت وبلاغت منطق وگفتار کے مالک، دل کے مضبوط، قلب کے مطمئن، چہرہ کے حسین وجمیل، ہیبت کے حامل تعظیم واحترام کے قابل تھے[1]

تشریع احکام میں آپ کی معرفت کامل اور آپ کا علم بڑا عمیق تھا، یہی وجہ ہے کہ آپ نے شراب خوری اور دیگر مہلکات کو اپنے اوپر حرام کرلیا تھا۔ جاہلیت کی کثافتیں، کفر، شرک اور جہالت کے مخالف تھے، کمالات نفسیہ میں ایک رفیع الشان منزل، بلند پایہ افق جلیل

۱: اثبات الوصیۃ ۱۰۷۔ ۱۰۸۔ آپ کے یہ اوصاف تاریخ میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔

۲: السیرۃ النبویہ ج ۱ ص۷۹ الحلبیہ ج ۱ ص۱۲۵ ابوطالب ص۱۱۲ ہاشم وامیہ ص۵۵ الجمع الفینور ج ۱ ص۱۹۵

عریض دنیا، پاک و پاکیزہ وادی کے مالک تھے۔

عمرو بن علقمہ کے قتل کے موقع پر اس قسامہ کی بنیاد آپ ہی نے ڈالی تھی جو بعد میں سنتِ نبوی میں داخل ہو گیا۔[1]

حضرت ابوطالب کی زندگی کی ایک کرامت جسے آپ کے معاصرین نے محسوس کیا یہ ہے کہ جب ہوازن و بنی کنانہ کے درمیان حرب فجار میں آپ شریک ہو جاتے تھے تو ہوازن جیت جاتے تھے۔ ورنہ ان کا ستارہ گردش میں رہتا تھا۔

چنانچہ ایک مرتبہ سب نے مل کر درخواست کی کہ آپ ہمیشہ ہمارے ساتھ رہا کریں اور آپ نے یہ درخواست بھی منظور فرمائی۔[2]

ایسا کیوں نہ ہوتا؟ آسمانی برکات کا سرچشمہ، زمین کا ملجا و ماوی، نسلِ خلیل کا بقیہ خاندانِ ذبیح کا وارث ہے، اگر دعا کر دے تو آسمان برس پڑے اگر طلب کر لے تو زمین سبزہ اگل دے، اگر اشارہ کر دے تو بارش بے تحاشا گر پڑے!

ابن عساکر نے جلہمہ بن عرفطہ کی زبانی نقل کیا ہے کہ میں مکہ میں آیا تو کیا دیکھا کہ لوگ قحط کی شدت سے سخت پریشان ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ لات و عزیٰ سے مدد مانگو، کوئی کہتا ہے کہ منات کی خدمت میں عرض کرو۔ ایک مرتبہ ایک بزرگ باوقار جن کے چہرہ سے فکر و تدبّر کے علامات نمایاں تھے اٹھے اور کہنے لگے۔ یہ کیا مہمل خیالات ہیں؟ کدھر بہک رہے ہو؟ ابھی تو وارث خلیل و ذبیح باقی ہے، لوگوں کے لیے یہ وراثت کوئی نئی بات نہ تھی۔ اور انھیں

۱: شرح النہج ج ۳ ص ۴۶۱ صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۹۶ قسامہ کا مطلب یہ ہے کہ مقتول کے وارث حاکم کے پاس جمع ہوں اور کسی آدمی کو قاتل معین کریں، اس کے علامات بیان کریں اور اس کے بعد پچاس قسمیں کھائیں مزید تفصیل کتب فقہیہ میں۔ ۲: شرح النہج ج ۳ ص ۴۶۲ السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۹۸ الحلبیہ ج ۱ ص ۱۵۲
۳: النبویہ ج ۱ ص ۸۱ الحلبیہ ج ۱ ص ۱۳۸،

اس کا مکمل علم تھا۔ اس لیے کہنے لگے کہ کیا آپ کی مراد ابوطالب ہیں۔ انھوں نے کہا ہاں، سب اٹھے۔ میں بھی اٹھ کر ساتھ چلا۔ دروازہ پر پہنچے، زنجیر در کھٹکھٹائی ایک باوقار بزرگ چادر اوڑھے ہوئے باہر آئے۔ لوگوں نے عرض کی۔ اے ابوطالب! وادیوں میں قحط ہے، خشک سالی کا دور دورہ ہے۔ ذرا ہمارے لیے بارش کا انتظام کر دو۔

آپ نکلے، ایک بچے کو ساتھ لیے ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا آفتاب ابھی بدلیوں سے نکلا ہے۔ اس کے ساتھ کچھ اور بچے بھی تھے۔ خانہ کعبہ کے قریب پہنچے۔ بچے کی پشت کو دیوارِ کعبہ سے ملایا۔ اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا، اشارہ پانا تھا کہ ابر گھرنے لگے، پانی برسنے لگا۔ وادیاں چھلکنے لگیں، سبزہ عام ہو گیا شادابی پھیل گئی[1] (یہ واقعہ ہم نے سیرت حلبیہ و نبویہ سے بلا کسی حاشیے کے نقل کر دیا ہے۔ ان دونوں حضرات کا خیال ہے کہ جناب ابوطالب کا ایک قصیدہ جس میں بارش کا ذکر ہے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وابیض یستسقی الغمام بوجہہ)!

یہی وہ صفات و کمالات اور آثار و خصوصیات تھے جن کی بنا پر حضرت ابوطالب کو یہ مرتبہ حاصل تھا کہ ہر دل میں ان کی محبت تھی ہر قلب میں ان کی عظمت تھی اور ہر نظر میں ایسی ریاست کہ جس میں اس وقت شرکت کی کوئی گنجائش نہ تھی جب تک آپ کے قدم اس زمین پر رہیں اور آپ کے دل کی دھڑکنیں باقی رہیں۔

۱: الغدیر ج ۷ ص ۳۴۶ شرح قسطلانی ج ۲ ص ۲۲۷ المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۴۸ خصائص کبریٰ ج ۱ ص ۸۶، ۱۲۴ طلبۃ الطالب ص ۴۲ الحجۃ ص ۹۱ بحار ج ۶ ص ۳۰۱ ابوطالب ص ۴۲ [illegible] سیرت العلابۃ ص ۴۲ [illegible]

آپ بھی جناب عبدالمطلب کی طرح مسند پر بیٹھتے تھے اور جب رسول اکرم ؐ آکر بیٹھ جاتے تھے تو فرماتے تھے:

"یہ میرا بھتیجا ایک بڑے شرف کا احساس لے کر آتا ہے"۔[۱]

۱: التنویر ج ۱ ص ۸ ـ الحلبیہ ج ۱ ص ۱۳۸ بحار ج ۶ ص ۱۲۹ اعیان الشیعہ ج ۲ ص ۱۱ ج

دلائل

حضرت ابوطالب کے اشعار اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ آپ کو رسولِ اکرمؐ کی رسالت کا علم بحیرا کی پیشین گوئی اور اپنے ذاتی مشاہدات کی بنا پر بعثت سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔

علامہ عبدالواحد السفاقسی

(السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۸۸)

دلائل

"میرے پدر بزرگوار تمام کتابوں کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ میری نسل میں ایک نبی ضرور ہوگا۔ کاش میں اس وقت تک زندہ رہتا تو اس پر ایمان لے آتا۔ خیر اب میری اولاد میں جو بھی رہ جائے اس کا فرض یہی ہے[1]۔"

ابوطالبؑ

ایسا راسخ العقیدہ، کامل الایمان جس کا قول یہ ہو کیا وہ بھی اپنے ایمان کیلئے کسی دلیل و برہان کا محتاج ہے؟!

اس کے ایمان پر تو اتنے دلائل ہیں جو حد احصار سے باہر اور شمار و اعداد سے مافوق ہیں۔ ان میں سے ہر دلیل رافع شک اور ہر برہان ثبت مطلب ہے۔

حضرت ابوطالبؑ کے ایمان کی ہر دلیل انسان کو دعوت ایمان و عقیدہ اور پیغام ثبات و استقلال دے رہی ہے۔ آپ کو بخوبی علم تھا کہ آپ کا بھتیجا ہی رسول منتظر ہے جس کا ذکر بابا نے کتب سماویہ میں پڑھا تھا اور جس کی بشارت تمام رسالتوں نے دی ہے پھر آپ کے سامنے ایسے واضح علامات و کرامات بھی تھے جن کو دیکھ کر ایک دشمن بھی بغیر اعتراف کئے نہیں رہ سکتا۔

آپ نے بہت سے دلائل تو باپ کی زندگی ہی میں دیکھ لیے تھے جن کی طرف حضرت عبدالمطلب اشارہ کیا کرتے تھے اور پھر اب دلیلوں کی کیا کمی تھی۔ جب کہ نبی کریمؐ آپ ہی

---

۱) شیخ الابطح ص۲۳، الغدیر ج۷ ص۳۴۸، العباس ص۲۲

کے زیر سایہ پروان چڑھ رہے تھے۔ اب تو ہر اُبھرتا ہوا سورج اور ہر پھیلتی ہوئی تاریکیٔ شب آپ کیلئے ایک علامتِ نبوت تھی۔

اب آپ اپنے بھتیجے میں اُن کمالات وخصوصیات کا مطالعہ کر رہے تھے جو ایک عام انسان میں نہیں ہو سکتے۔ انسان دنیا میں آتا ہے اور زندگی کے دن گزار کر جاں بحق تسلیم ہو جاتا ہے۔ اس کا ذکر اس طرح مٹ جاتا ہے جیسے اس نے کبھی اس زمین پر قدم ہی نہ رکھے ہوں۔ یا کبھی اس راہ سے گزرا ہی نہ ہو۔

لیکن یہ فرزند ایسے آثار رکھتا ہے جو انسانی تصویر کی مثالِ اکبر اور انسانی تخلیق کی تصویر اکمل ہے۔ یہ وہ مطابق اصل صورت ہے جس کی بلندی تک طائر فکر پرواز نہیں کر سکتا اور جس سے کمالات وفضائل کے چشمے جاری ہوتے ہیں۔ انھیں بلیشمار اور لاتعداد براہین ہیں ایسے واضح دلائل بھی ہیں جنھیں ایک مادی انسان بھی محسوس کر سکتا ہے خواہ اس کی عقل کتنی ہی ناقص اور اس کا ایمان کتنا ہی ضعیف کیوں نہ ہو! چہ جائیکہ ابوطالب جیسا کامل العقل، راجح الایمان، نافذ البصیرۃ اور عمیق الفکر انسان! ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ اس مقام پر چند دلیلوں کو بطور نمونہ پیش کر دیں تاکہ انھیں سے باقی کا اندازہ بھی کر لیا جائے۔

چشمہ جاری ہونا

رسول اکرمؐ کے قبل بعثت کے کرامات میں سے ایک یہ ہے کہ جناب ابوطالب کے ساتھ مقام ذوالمجاز (عرفات سے ایک فرسخ دور دورِ جاہلیت کا بازار ہے) میں تھے اتفاقاً جناب ابوطالب کو شدید پیاس محسوس ہوئی۔ پانی مطلق نہ تھا۔ آپ نے اپنے بھتیجے سے پیاس کی شدت کی شکایت کی حضرتؐ نے زمین پر ٹھوکر ماردی اس سے ایک ایسا چشمہ جاری ہو گیا جیسا جناب ابوطالبؑ نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ چنانچہ آپ سیراب ہو گئے اور اس کے بعد حضورؐ کی دوسری ٹھوکر سے چشمہ بند ہو گیا[1]

[1] البنویہ ج ا ص ۸۹ الحلبیہ ج ا ص ۱۲۹ تذکرۃ الخواص ص ۹ العباس ص ۲۰ بحار ج ۶ ص ۱۲۹

کاھن کی زبانی

لہب کا ایک شخص کاہن تھا۔ جب وہ مکہ میں آیا تو تمام لوگ اپنے اپنے بچوں کو لیکر اس کے پاس گئے تاکہ وہ ان کے مستقبل کی خبریں بتائے۔ انھیں لوگوں میں سے ایک حضرت ابوطالب بھی تھے۔ جو اپنے بھتیجے رسول اکرمؐ کو لیکر گئے تھے جب کاہن کی نظر آپ پر پڑی تو سب کو چھوڑکر اسی طرف دیکھنے لگا اور بولا اس بچے کو سامنے لاؤ۔

جناب ابوطالب نے اس کی نظروں سے تاڑلیا کہ اس کی نگاہ بڑی دوررس ہے۔ چنانچہ آپ نے نظربد سے بچانے کیلئے حضرتؐ کو چھپا دیا لیکن کاہن اسی طرح مضطرب رہا ایک مرتبہ چیخ اٹھا اس بچے کو لاؤ۔ خدا کی قسم مستقبل میں یہ بڑا باعظمت و باحیثیت ہوگا۔

ظاہر ہے کہ یہ عظمت و حیثیت کے الفاظ جناب ابوطالب کے لئے نئے نہ تھے آپ کو ابتدا ہی سے معلوم تھا کہ اس بچے کی ایک حیثیت ہوگی۔ اور یہ بھی معلوم تھا کہ اس حیثیت کا کیا مطلب ہے!

تو بڑا بابرکت ھے

جب سے جناب عبدالمطلب کی وفات ہوئی اور حضرت ابوطالبؑ نے رسول اکرمؐ کی کفالت شروع کی برابر اس کرامت کا مشاہدہ کر رہے تھے کہ جب آنحضرتؐ دسترخوان پر بیٹھ جاتے تھے تو کھانا کافی ہو جاتا تھا جسے حضرت ابوطالب اپنے بچوں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔

آپ کا دستور تھا کہ کھانے کے وقت اس وقت تک بچوں کو روکے رکھتے تھے جب تک کہ آنحضرتؐ نہ آجائیں، جب کوئی بچہ دودھ پینا چاہتا تھا تو پہلے پیالہ حضرتؐ کے

کے سامنے پیش کیا جاتا تھا اور جب آپؐ اس میں سے تھوڑا لے لیتے تھے تو باقی بچوں کو دیا جاتا تھا اور حضرت ابوطالب فرماتے "بیٹا! تو بڑا بابرکت ہے۔"[۱]

سفرِ شام

رسول اکرمؐ پر حضرت ابوطالبؑ کی عنایتیں اور شفقتیں اس حد تک بڑھ گئی تھیں کہ اب دونوں روحیں ایک نظر آنے لگی تھیں۔ ایسے موقع پر یہ کیونکر ممکن تھا کہ ابوطالبؑ ایک دور دراز سفر کا ارادہ کریں اور نبی کریمؐ کا دل بیقرار نہ ہو۔ چنانچہ آپ کے دل میں اس وقت یہ تصورات کروٹیں لینے لگے جب یہ حسن حصین اور قلعہ محکم سامنے نہ ہوگا۔ جب تیز و تند ہوائیں چلیں گی اور کوئی محافظ نہ ہوگا۔ جب دھوپ کی شدت، یتیمی کے احساسات ہوں گے اور کوئی بچانے والا نہ ہوگا۔

آپ یہ دیکھ رہے ہیں کہ چچا اپنی سواری کی طرف بڑھ رہے ہیں اور آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہوتے جا رہے ہیں۔ شفیق بزرگ نے یتیمی کے احساس پر ڈھلکتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھا اور دل تڑپ گیا۔ کان میں بھتیجے کی آواز آئی "چچا اب تو ماں باپ بھی نہیں ہیں یہ کس پر چھوڑے جا رہے ہیں؟" تڑپ کر بولے "خدا کی قسم اسے ساتھ لے جاؤں گا۔ اب نہ یہ مجھ سے جدا ہوگا اور نہ میں اس سے۔"[۲]

۱: السیرۃ النبوۃ ج ۱ ص ۸۰ الحلبیہ ج ۱ ص ۱۳۳، ۱۳۷ بحار ج ۶ ص ۱۲۴، ۱۹۰ فاطمہ بنت محمد از عمر ابوالنصر ص ۱۸ محمد النبی العربی ص ۲۰ العباس ص ۱۰ علی ہامش السیرۃ ج ۱ ص ۱۰۹ ج ۱ ص ۱۵۱ جناب ابوطالبؑ نے حضرتؐ کے اس معجزہ کو مکرر مشاہدہ کیا ہے چنانچہ آپ اس وقت بھی موجود تھے جب دعوت، ذوالعشیرہ میں آنحضرتؐ نے ایک ران گوسفند اور ایک کاسہ شیر سے تقریباً ۴۰ آدمیوں کو سیر کر دیا تھا (ظاہر ہے کہ یہ واقعہ اپنی شہرت کے لحاظ سے کسی حوالہ کا محتاج نہیں ہے اس کا ہر مورخ اور ہر تاریخ شاہد ہے)

یہ کہہ کر بھتیجے کو اپنی سواری پر بٹھالیا، قافلہ صحرا میں خطوط معین کرتا ہوا چلا۔ ہواؤں نے خبر سفر چار طرف پھیلائی۔ یہاں تک کہ مقام بصریٰ تک پہنچے۔ حضرت ابوطالب نے چاہا کہ کچھ دیر آرام کرلیں۔ اتفاقاً اسی مقام پہ دیر تھا اس میں بحیرا نامی ایک راہب رہا کرتا تھا جو علوم مسیحیت کا مرکز و مصدر تھا۔ آج اس راہب نے قافلہ کے کچھ نئے انداز دیکھے ہمیشہ قافلے گزر جاتے تھے اور یہ توجہ بھی نہ کرتا تھا لیکن آج دیر سے گردن نکال کر قافلے کا جائزہ لے رہا ہے۔ کیا دیکھتا ہے کہ اس قافلے میں ایک انسان ایسا بھی ہے جس کے سر پر ابر سایہ فگن ہے جس درخت کے نیچے بیٹھ جاتا ہے وہ درخت اپنے پتوں کو جوڑ کر سایہ کرلیتا ہے ایک نیا انداز اور عجیب طور ہے، وہ حیرت کے عالم میں گم ہوگیا لیکن ایک مرتبہ فوراً یاد آیا کہ کتاب مقدس کے کلمات میں ان علامات کا ذکر موجود ہے۔ یہ سوچتے ہی دیر سے نکلا، کھانا تیار کرنے کا حکم دیا اور قافلہ کے قریب پہنچ گیا۔

"اے گروہ قریش میں نے تمھارے لیے کھانا تیار کرایا ہے چاہتا ہوں کہ تم سب چھوٹے بڑے، غلام و آزاد آکر اسے تناول کرو۔"

ایک شخص حیرت زدہ ہوکر بولا: "اے بحیرا! خدا کی قسم آج عجیب بات دیکھ رہا ہوں، کل تک تو تو ایسا نہ تھا یہ آج کا اہتمام کیسا؟"

بحیرا نے اس کا شافی جواب دیا تو سب نے دعوت قبول کرلی سب جمع ہوگئے صرف رسول اکرم رہ گئے جن کو سامان کی حفاظت پر درخت کے نیچے چھوڑ دیا گیا تھا۔

بحیرا نے قافلے کے افراد پر ایک نگاہ ڈالی، یہ دیکھا کہ یہ مجمع میری پیاس کو نہیں بجھا سکتا۔ اس جماعت سے میری سیری نہیں ہوسکتی۔ یہ دیکھتے ہی قوم پکار اٹھی۔ بحیرا اب کوئی باقی نہیں ہے صرف ایک کمسن بچہ ہے جسے سامان کی حفاظت پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ راہب نے اسے بھی طلب کیا بچہ قریب آگیا۔ راہب نے گہری نظر سے اس کے چہرے

۱۔ سیرت نبویہ ج ۱ ص ۹، سیرۃ الحلبیہ ج ۱ ص ۱۳۱ (قدرے اضافہ کے ساتھ)

خطوط کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اور کتاب مقدس کے علامات کا جائزہ لینے لگا۔

کھانے سے فراغت کے بعد لوگ چلے۔ بحیرا نے بچے سے کچھ سوالات کا ارادہ کیا اور حضرت ابوطالب سے کہنے لگا "تمھارا اس بچے سے کیا رشتہ ہے؟ فرمایا یہ میرا بیٹا ہے۔ کہا ہرگز نہیں اس کے باپ کو زندہ نہ ہونا چاہیے۔ فرمایا ہاں بھتیجا ہے۔ کہا پھر باپ کہاں ہے؟ فرمایا اسی وقت انتقال ہو گیا تھا جب یہ بطن مادر میں تھا۔ بولا سچ ہے۔ اسے فوراً واپس لے جاؤ اور یہودیوں کے شر سے بچاؤ۔ خدا کی قسم اگر وہ اسے پہچان لیں گے تو اذیت دیں گے۔ یہ بچہ ایک عظیم الشان بننے والا ہے[1]"

رسول اکرمؐ مکہ پلٹ آئے۔ اب وہ پہلی سی زندگی نہیں ہے نیا عالم ہے جدید دنیا ہے جو نظروں میں گھوم رہی ہے اور حضرت ابوطالبؑ کا یہ عالم ہے کہ قدم قدم پر حفاظت کے انتظامات کر رہے ہیں۔ ہر آن اس خبیث فرقۂ یہود سے خطرہ محسوس کر رہے ہیں جو اس شادابی کا شاید دشمن ہے اور اس غنچہ کو کھلنے سے پہلے ہی پژمردگی سے ہمکنار کر دینا چاہتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ تمام خیالات شیخ بطحا کے ذہن سے کسی طرح بھی نہ نکل سکتے تھے لیکن اس کے باوجود آپ نے چاہا کہ اپنے ان تصورات کو زمانہ کی پیشانی پر کندہ کر دیا جائے۔ تاکہ آنے والی نسلیں بھی پڑھ لیں اور یہ سوچتے ہی اشعار پڑھنا شروع کر دیے:

ان ابن آمنة النبی محمداً عندی یفوق منازل الاولاد

۱: السیرۃ الہشامیہ ۱۹۱-۱۹۴، النبویہ ۹۰-۹۲۔ الحلبیہ ج ۱ ص ۱۳۹-۱۴۲۔ طبری ج ۲ ص ۲۲-۲۴۔ کامل ج ۲ ص ۲۳-۲۴ قصص العرب ج ص ۹۹-۱۰۰۔ بحار ج ۶ ص ۵۹، ۶۱-۶۱-۶۲-۱۲۹-۱۳۰-۱۳۱ ابوطالب ص ۱۳ علی ہامش السیرۃ ج ۲-ص ۳۰۷ (اس مقام پر روایات میں اچھا خاصا اختلاف ہے بحار میں یہ واقعہ چند مختلف طریقوں سے نقل ہوا ہے لیکن بہرحال اصل قصہ صحیح ہے۔ بزرگوں کا کام تھا نقل کرنا اور ہمارا کام ہے تحقیق و تفتیش)

لما تعلق بالزمام رحملة والعیس قد قلصن بالا زواد

فارفض من عینی دمع زارف مثل الجمان مفرق الافراد

راعیت فیه قرابة موصولة وحفظت فیه وصیة الاجداد

وامرته بالسیر بین عمومته بیض الوجوه مصالت انجاد

ساروا لابعد طیة معلومة فلقد تباعد طیة المرتاد

حتی اذا ما القوم بصری عاینوا لاقوا علی شرک من المرصاد

حبرا فاخبرهم حدیثا صادقا عنه ورد معاشر الحساد

قوم یهود قد راوا ما قد رای ظل الغمام وعز ذی الاکباد

ثاروا لقتل محمد فنهاهم عنه وجاهد احسن التجهاد

فثنی زبیرا من بحیرا فانثنی فی القوم بعد تجادل وبعاد

ونهی دریسا فانتهی عن قوله حبر یوافق امره برشاد[1]

(آمنہ کا لال محمد نبی میرے نزدیک اولاد سے زیادہ عزیز و بہتر ہے
جب اس نے زمام تھام لی تو باوجود تمام اہتمام کے میرے دل میں حجم
پیدا ہو گیا۔ آنکھوں سے اس طرح آنسو جاری ہو گئے جیسے موتی گرتے
ہیں۔ میں نے اس کے بارے میں قرابت کا بھی خیال کیا اور اجداد کی
وصیت کا بھی۔ تم سے ایسے قافلے کے ساتھ چلا جس میں سب سرخرو اور
فریادرس بہادر تھے جن کا قصد طولانی تھا اور صاحبان عزم کا یہی حال ہوتا ہے
یہاں تک کہ جب مقام بصریٰ میں پہنچے تو ایک عالم سے ملاقات کی جس نے
سچی خبر سنائی۔ اور حاسدین کی روک تھام کی۔

۱: الغدیر ج ۷ ص ۳۴۴ ۔ الحجہ ص ۷۶ اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۲۷، ۱۲۸ معجم القبور ج ۱ ص ۱۸۱ (تھوڑے تھوڑے اختلاف کے ساتھ)

وہ بقوم یہود جن کے جگہ ابر کا سایہ کرنا دیکھ کر غصہ سے آگ بگولا بن گئے تھے۔
انھوں نے محمدؐ کے قتل کا ارادہ کرلیا تھا لیکن اس راہب نے ان کو روک دیا۔
اور یہ بڑا اچھا واقعہ تھا۔
زبیر و دریس دونوں کو اس بحیرا نے پلٹا دیا۔
عیس کا امر مطابق رشد و علی ہوتا ہے۔"
اس کے بعد یہ اشعار زبان پر جاری ہوئے:

الم ترنی من بعد ہم ہممتہ ۔۔۔ بفرقۃ حر الوالدین حرام
باحمد لما ان شددت مطیتی ۔۔۔ برحلی وقد ودعتہ بسلام
بکی حزناً والعیس قد فصلت بنا ۔۔۔ واخذت بالکفین فضل زمام
ذکرت اباہ ثم رقرقت عبرۃ ۔۔۔ بجود من العینین ذات سجام

(کیا تم نے نہیں دیکھا کہ میں نے ایک آزاد و ملش محترم النسان یعنی احمد کے بارے میں یہ طے کرلیا تھا کہ اسے چھوڑ جاؤں بلکہ اسے وداع بھی کر دیا تھا۔
لیکن جب اس نے گریہ شروع کیا اور راستہ روک لیا تو میں نے بھی اس کے باپ کو یاد کر کے رونا شروع کر دیا۔)

اس کے بعد دیر کے راہب کے واقعے کو نظم فرماتے ہیں اور اس قضیے کو بھی نقل کرتے ہیں کہ جب راہب نے یہودیوں کے علماء کو رد کر دیا تھا:

فجاؤا وقد ھموا بقتل محمد[1] ۔۔۔ فردھم عنہ بحسن خصام
بتاویلہ التوراۃ حتی تیقنوا ۔۔۔ وقال لہ رمتم اشد مرام
ابتغون قتلاً للنبی محمد ۔۔۔ خصصتم علی شؤم بطول اثام
وان الذی تختارہ منہ مانع ۔۔۔ سیکفیہ منکم کید کل طغام

۱: الغدیر ج ۷ ص ۳۴۵ الحجہ ص ۳۰۱ اعیان الشیعہ ج ۲۹ ص ۱۳۸ مجمع البحرین ج ۱ ص ۵۳۱ (تھوڑے سے اختلافات کے ساتھ)

فذالک من اعلامہ وبیانہ ولیس نھار واضح کظلام

(یہ یہودی قتل محمد کا ارادہ کر کے آئے تھے لیکن بحیرہ نے بڑے انداز سے رد کر دیا
انھیں توریت کی تاویل بتائی یہاں تک کہ انھیں یقین ہو گیا اور کہا کہ تمھارا ارادہ بہت
برا تھا کیا تم محمد کو قتل کر کے ہمیشہ کے لیے منحوس بننا چاہتے ہو اس کے پاس ایک ایسا
مانع موجود ہے جو اسے تمھارے مکر سے بچا لیگا یہی اس کے علامات ونشانات ہیں اور
ظاہر ہے کہ واضح و روشن دن کسی رات کے مثل نہیں ہوتا ہے)

اس سے زیادہ اس واقعے میں تفصیلات کی ضرورت نہیں ہے۔

سچ بتایئے کیا ان تمام مناظر و مظاہر، کرامات و علامات کے بعد بھی یہ شک ہو سکتا ہے
کہ جناب ابوطالب ان امور کی طرف متوجہ نہ رہے ہوں گے؟ اور انھوں نے ان علامتوں کو عمیق
نظروں سے نہ دیکھا ہوگا جبکہ ان میں سے ہر علامت ایک انوکھی صورت رکھتی تھی اور ہر کرامت
پورے معاشرے سے ممتاز و جداگانہ حیثیت کا مالک تھی!

کیا یہ بات قابلِ التفات نہ تھی کہ کاہنِ مکہ کے سامنے سے تمام بچے گزر گئے اور
اس نے دو دو لفظوں میں ٹال دیا لیکن رسولِ عربی کو اہتمام و اصرار کے ساتھ واپس بلایا۔
اور جب اس کی آواز صدا بصحرا ہونے لگی تو اسی آواز کے ساتھ ایک جملہ کا اور اضافہ کر دیا۔
تاکہ آنے والا مستقبل اس کی شرح کرے اور تاریخ اسے اپنے دامن میں نمایاں جگہ دے
سکے وہ کونسا جملہ تھا؟ "خدا کی قسم اس کی ایک عظمت و حیثیت ہوگی"

کیا یہ بات جاذب نظر نہیں تھی کہ وہ بحیرا جس نے کسی قافلے کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا ہو
وہ اتنے اہتمام سے پورے قافلے کی دعوت کرے اور پھر ایسی گفتگو کرے جو نبوت پر برہان
قاطع اور رسالت پر دلیلِ واضح ہو۔

یہ محمد کو اپنا بیٹا کہیں اور وہ نہایت ہی باوقار اور متین لہجے میں جواب دیدے کہ
تم باپ نہیں ہو سکتے، اس کے باپ کو زندہ نہیں ہونا چاہیئے پھر یہودیوں کے خطرہ کا اظہار

ان لفظوں میں کرے کہ اس بچے کی آئندہ ایک خاص حیثیت ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ دلائل و براہین ہیں جن میں نہ شک کی گنجائش ہے اور نہ شبہہ کا گذر۔

ان تمام باتوں کے ساتھ وہ کلمات بھی قابل غور ہیں جو اپنے پدر بزرگوار سے سنا کرتے تھے جن میں اس بچے کی برکت کا مسلسل اعلان تھا جس برکت کا یہ عالم تھا کہ جس ظرف پر ہاتھ لگا دے اس سے ایک جماعت سیر ہو جائے۔ جس زمین پر ٹھوکر مار دے ایک صاف و شفاف چشمہ اُبل پڑے، جس طرف چل پڑے ابر متابعت کے لئے ساتھ چلے۔ جس جگہ بیٹھ جائے درخت کے پتے چتر شاہی کا کام کریں!

اگر یہ برکت نہیں تو پھر برکت کیا چیز ہے؟

اس کے علاوہ اس بچے میں کچھ نفسانی صفات و کمالات بھی ہیں، کلام میں صداقت، افعال میں رفعت، اخلاق میں بلندی، آثار میں جمال و جلال، گفتگو میں حلاوت، زبان میں فصاحت جیسے اوصاف و خصائل مجمع لگائے ہوئے ہیں اور وہ بھی اس بچے میں جو ابھی عمر کی دوسری دہائی کی منزلوں سے گزر رہا ہے جبکہ ان اوصاف کا اجتماع پورے شہر بلکہ پورے عالم عربیت کے کسی ایک فرد میں نظر نہیں آتا۔ یہ بچہ رہتا تو ہے اسی پست ماحول اور انحطاط پذیر معاشرہ میں لیکن نہ ان کے عادات سے متاثر ہوتا ہے اور نہ ان کی خصلتوں میں حصہ لیتا ہے۔

پھر یہ کمالات و خصائص وہ تھے جن کا مشاہدہ صرف حضرت ابوطالب سے مخصوص نہ تھا بلکہ پورا مکہ دیکھ رہا تھا اسی لیے سب صادق و امین کہتے تھے۔ حکم بنا کر فیصلے کراتے تھے۔ باتوں پر اعتماد کرتے تھے اور اوامر و احکام کی اطاعت کرتے تھے۔

تزویج

ابوطالب جیسے قلیل المال اور کثیر العیال شخص پر ایک وقت ایسا بھی آگیا جب آپ اس بات پر مجبور ہو گئے کہ اپنے بھتیجے کو کسی عمل پر معین کریں تاکہ اس سے کچھ کسب کیا جائے۔ ضروریات زندگی پورے کیے جائیں۔ پھر آپ کے ذہن میں یہ بھی تھا کہ ایسے روشن مستقبل والے انسان کو دوسرے پربار یا معاشرہ سے پوشیدہ نہیں رہنا چاہیے۔

آپ نے دیکھا کہ سب سے بہتر کاروبار تجارت ہے اس لیے کہ یہ بچہ اپنے صفات وکمالات کی وجہ سے اس درجہ پر فائز ہے کہ اگر یہ تجارت کرنے لگا تو سارا مکہ اسی کو اپنا عامل بنانے کی فکر کریگا۔ اور اس طرح آمدنی میں بھی اضافہ ہوگا۔

ادھر یہ گفتگو ہوئی اور ادھر حضرت خدیجہ کو یہ خبر لگ گئی۔ عرصے سے دل میں تمنا تھی کہ ایسے ہی صادق اور امین کو عامل بنایا جائے۔ آج مراد برآئی، فوراً ہی آدمی بھیج دیا۔ معاملہ طے ہو گیا، حضرتؐ گئے اور کامیاب پلٹے۔ خدیجہ کے دل میں گھر بن گیا اور انھیں یہ فکر لاحق ہو گئی کہ اس جوان کو اپنی زندگی بھر کا شریک کار بنالیا جائے۔ عالم عربیت میں حسن وجمال، اخلاق و آداب، صداقت وامانت اور بلند کرداری میں اس جیسا کوئی نہیں ہے۔

حضرت خدیجہ نے جس وقت سے اپنے غلام میسرہ سے وہ حالات سنے جو راہ شام میں پیش آئے تھے اسی وقت سے انھوں نے اپنے دل میں یہ ٹھان لی تھی کہ اس کے علاوہ کسی اور کو شریک زندگی نہ بنائیں گی۔

لیکن اس کی صورت کیا ہو؟ یہ مقصد کس طرح حاصل ہو؟ رسوم ورواج چار طرف سد راہ ہیں مقصد برآری کی کوئی سبیل نظر نہیں آرہی ہے۔ تقاضا یہی ہے کہ پیغام مرد کی طرف سے آئے

عورت کو ہاتھ نہیں بڑھانا چاہیے لیکن کیا حضرت خدیجہ بھی اس رواج کے سامنے سر خم کر دیں اور اپنی امیدوں اور آرزوؤں کو تباہ و برباد ہونے دیں۔ یا ایک انقلابی قدم اٹھا ہی لیں کہیں ایسا نہ ہو کہ محمدؐ کسی دوسرے کی قسمت میں پڑ جائیں اور ساری زندگی کی تمنائیں پامال ہو کر رہ جائیں۔

کافی غور و خوض کے بعد آپ نے یہ حل نکالا کہ خود ہی پیغام بھی دے دیں اور رسم و رواج کی مخالفت بھی نہ ہونے پائے چنانچہ آپ نے نفیسہ بنت منیہ کو چپکے سے بھیج دیا کہ وہ حضرت سے اس موضوع پر گفتگو کریں۔ اور ان کے سامنے خدیجہ کا خیال ظاہر کریں۔ شاید کوئی امید افزا اور تشفی بخش جواب مل سکے۔

ابھی نفیسہ اور آنحضرتؐ کی گفتگو تمام نہ ہوئی تھی کہ نفیسہ نے حضرت خدیجہ کو خوشخبری سنائی آپ کا پیغام کامیاب ہو گیا۔ ادھر حضرتؐ چچا کے پاس پہنچے اور انھیں یہ مبارک خبر سنائی۔ محفلِ عقد منعقد ہوئی، امام قریش، سردار عرب ابوطالب نے خطبہ پڑھنا شروع کیا:

الحمد للّٰہ الذی جعلنا من ذریۃ ابراھیم زرع اسماعیل و ضئضئی معد و عنصر مضر و جعلنا حضنۃ بیتہ وسواس حرمہ وجعل لنا بیتاً محجوجاً وحرماً امناً وجعلنا حکام الناس ثم ان ابن اخی ھذا محمد بن عبد اللّٰہ لا یوزن برجل الا رجح بہ شرفاً ونبلاً وفضلاً وعقلاً فان کان فی المال قل فان المال ظل زائل امر حائل وعاریۃ مسترجعۃ ومحمد قد عرفتم قرابتہ وقد خطب خدیجۃ بنت خویلد وبذل بہا ما آجلہ وعاجلہ کذا وھو واللّٰہ بعد ھذا لہ نبأ عظیم وخطر جلیل جسیم[1]

---

[1] السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۲۰۱ الحلبیہ ج ۱ ص ۱۶۵ فاطمہ بنت محمدؐ ص ۲۴ شرح النہج ج ۶ ص ۳۱۲ ابوطالب ص ۲ الحجۃ ص ۳۶ البحار ج ۶ ص ۱۳۵، تذکرۃ الخواص ص ۳۱۲، الغدیر ج ۷ ص ۲۷۱ اعجاز القرآن باقلانی ص ۲۳۴ اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۳ کامل ج ۳ ص ۱۱۱ وغیرہ،

اشکر ہے اس معبود کا جس نے ہمیں ابراہیمؑ کی ذریت، اسمٰعیل کی نسل، معد کا معدن، مضر کا جوہر، کعبہ کا نگران اور حرم کا محافظ بنایا، حرم و کعبہ کا ہمارے حوالے کرکے ہمیں تمام لوگوں کا حاکم بنایا ۔ یاد رکھو یہ میرا بھتیجا محمدؐ شرافت و نجابت، فضل وعقل کے اعتبار سے تمام دنیا سے بہتر ہے، یہ اگرچہ مالی اعتبار سے کمزور ہے لیکن مال کیا چیز ہے؟ ایک ڈھلتا ہوا سایہ ایک پلٹا کھاتی ہوئی شے، ایک واپس ہونے والی عاریت، تم لوگ محمدؐ کی قرابت سے واقف ہو، اب انھوں نے خدیجہ بنت خویلد کو پیغام دیا ہے اور مہر مقرر کیا ہے ۔ یاد رکھو ان سب باتوں کے علاوہ محمدؐ بڑا جلیل القدر اور عظیم المرتبہ الشان ہے ؎

اس خطبہ میں دو باتیں نمایاں طور پر نظر آرہی ہیں ۔ پہلے تو خطبہ کا آغاز ہی اس خدا کی حمد سے کیا گیا جس نے ابراہیمؑ کی نسل اور اسمٰعیل کی ذریت میں سے قرار دیا گیا نہ بُت پرستی قریب آنے پائی نہ جاہلیت کو راستہ ملا، سارا خاندان پورا سلسلہ ابتدا میں نورِ اوّل سے متصل اور آخر میں بقائے دوام سے ہمکنار، ابتدا و انتہا دونوں شرعیت ہی شریعت اور اسلام ہی اسلام !

یہی وہ صفت تھی جس نے اس حرم کا نگراں بنا دیا جس کو خلیل خدا نے تعمیر کیا تھا اور جس نے سارے عالم کی حکومت دیدی ۔

لیکن یہ تمام باتیں حضرت ابوطالب کی نظر میں صرف ایک مقدمہ کی حیثیت رکھتی تھیں اس لیے آپ نے فوراً بھتیجے کی معنویت پر روشنی ڈالنا شروع کردی یہ میزان معنویت میں سب سے گراں پلہ اور مستقبل میں سب سے زیادہ عظیم الشان اور جلیل القدر ہے یہ شان، یہ قدر کیا ہے؟ یہی نا کہ یہ جوان رسالت کا بار اٹھائیگا ۔ ہدایت بشر کا بوجھ سنبھالے گا، نبوت کے صفحات پر سنہری اور روپہلی تحریریں ثبت

کرے گا۔ گویا کہ حضرت ابوطالب اس مستقبل کو دیکھ رہے ہیں جس پر کسی کی بھی نظر نہیں ہے اور اس طرح پورے معاشرے کو اس عظمت کا عادی بنانا چاہتے ہیں جو عنقریب پورے جاہ وجلال کے ساتھ ظاہر ہوگی۔ ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ غفلت میں رہیں۔ اور نور جلالت ان کی نگاہوں کو خیرہ کردے!

صبحِ پیغام

وہ یتیم جو کل تک زمینیں قوم ابوطالب کی پناہ میں پرورش پا رہا تھا جس کیلئے ابوطالب نے اپنی نیند حرام کر دی تھی، آج اس کے ہاتھ مضبوط ہو چکے ہیں اس کی کلائیوں میں طاقت آچکی ہے، وہ ایک گھر کا مالک اور چند بچوں کا باپ بن چکا ہے۔ اب عیال و اطفال زندگی کے اسباب چاہتے ہیں، حالات فکر و ذکر کے تقاضے کر رہے ہیں یہ اور بات ہے کہ ان بچوں کے پاس قلت مال کے باوجود خیر و برکت اطمینان و سکون کی بے پناہ دولت موجود ہے۔

لیکن کیا اس گھرباری کے بعد ابوطالب کے فرائض ختم ہو گئے؟ کیا اس وصیت کی میعاد تمام ہو گئی جس پر ابھی تک عمل ہو رہا ہے؟ کیا اب وہ وقت آگیا ہے کہ ابوطالب اپنے بچوں کی بھی فکر کر سکیں؟ وہ بچے جو آج تک یتیم عبداللہ کی خاطر سختیوں میں زندگی گزار رہے تھے؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہو گا یہ اور بات ہے کہ اگر یتیم عبداللہ کے علاوہ کوئی اور بچہ ہوتا تو فرائض کب کے ختم ہو چکے ہوتے لیکن یہ بچہ تو وہ ہے جسے تاریخ کا رخ بدلنا ہے جسے کائنات کی تاریکیوں میں علم و عرفان کی شمعیں روشن کرنا ہیں)۔ اس کے فرائض اسی جگہ پر ختم نہیں ہوتے کہ یہ چند کھلی ہوئی کلیوں کا باپ کہا جانے لگا۔

بلکہ اس سلسلے میں ذمہ داریوں کا آغاز ہی درحقیقت آج ہو رہا ہے جبکہ اسکی عمر عزیز کے چالیس سال گزر چکے ہیں۔ یہی وہ دن ہیں جن کا انتظار حضرت عبدالمطلب کو تھا یہی وہ مطلع انوار ہے جس پر ایمان لانے کی تڑپ آنجناب کے دل میں تھی اور یہی وہ جوان ہے جس کے بارے میں زندگی کے آخری لمحات تک وصیتیں ہو رہی تھیں اب جو زندہ رہے اس پر ایمان لائے اس کا تحفظ کرے۔

اور اس کی عظمتوں سے استفادہ کرے۔

ابوطالب اس صبح منیر اور روز روشن کا بڑی بیتابی کے ساتھ انتظار کر رہے تھے ہر آن یہ خطرہ لگا ہوا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو بساط حیات لپیٹ دی جائے اور وہ صبح پیغام نمودار نہ ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ باپ کی طرح اجل آجائے اور وہ ایمان وتحفظ کی شرافت وعظمت حاصل نہ ہو سکے۔

خدا کا شکر کہ اس دن کا مبنس مکھ چہرہ ظاہر ہو گیا۔ ابوطالب کے چہرہ پر تبسم کی لہریں دوڑ رہی ہیں باچھیں کھلی جا رہی ہیں مسرت وفرحت کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں لگا ہوں کے سامنے وہ مبارک دن ہے جس کا آج تک انتظار تھا!

بھتیجا اپنے چچا عباس کے پاس یہ کہنے جا رہا ہے کہ اللہ نے مجھے اپنے امر کے ظاہر کرنیکا حکم دیدیا ہے لہٰذا آپ میری مدد کریں، میرا ہاتھ بٹائیں اور میرا بازو مضبوط کریں اور عباس اپنی مجبوریوں کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں "بیٹا! اپنے چچا ابوطالب کے پاس جاؤ وہ سب سے بزرگ ہیں وہ اگر مدد بھی نہ کر سکیں گے تو تمھارا ساتھ ہرگز نہ چھوڑیں گے۔

بھتیجا چچا کی مایوس کن تقریر سُن کر حضرت ابوطالب کے پاس آیا۔ ان کی زبان سے بیساختہ یہ جملے نکل پڑے "ارے! اس وقت تمھارے آنے کا کیا سبب ہے؟ کیا کوئی خاص خبر!"

یہ کہہ کر ابوطالب کی نظریں محمدؐ کے چہرے پر جم جاتی ہیں گویا اس خوردبین سے مستقبل کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں۔ اور اس آئینے میں انسانیت کی مکمل تصویر کا مشاہدہ کرنا چاہتے ہیں!

اس کے بعد وہ گفتگو کرتے ہیں جس سے محمدؐ کے دل میں طاقت وسکون اور بازوؤں میں قوت واستحکام کا احساس بڑھ جاتا ہے وہ سمجھ لیتے ہیں کہ اس حصن حصین قلعہ محکم کے ہوتے ہوئے کوئی بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

فرماتے ہیں "بھتیجے! جاؤ اعلان کرو، تمھاری منزل بلند، تمھاری جماعت محکم اور تمھارا نسب بہت ارفع واعلیٰ ہے خدا کی قسم اگر کسی کی زبان سے ایک ناسزا کلمہ بھی نکلا تو پھر تلواریں نکل

پڑیں گی۔ خدا کی قسم عرب تمھارا اسی طرح اتباع کریں گے جس طرح جانور اپنے پرورش کرنیوالے کا اتباع کرتے ہیں۔ میرے باپ نے ساری کتابیں پڑھی ہیں انھوں نے فرمایا ہے کہ میرے صلب سے ایک نبی ہوگا، کاش میں اس وقت تک باقی رہتا تو اس کے ہاتھ پر ایمان لے آتا خیر اب میری اولاد میں جو بھی رہ جائے اس کا فریضہ ہے کہ اس پر ایمان لائے![1]

ابوطالب نے چاہا کہ پہلے محمدؐ کی شرافت وسیادت کا تذکرہ کریں اور ان کا دل بڑھائیں تاکہ وہ اپنے اقدام میں کوئی کمی محسوس نہ کریں پھر اس مستقبل کا تذکرہ کریں جس میں سارے عالم عرب کی گردنیں جھک جائیں گی اور یہ جوان زعیم مطلق ہوگا۔

ایک مرتبہ ذہن میں جناب عبد اللہ کا خیال آگیا انھوں نے بھی مجھے اور میرے باپ کو وصیت کی تھی۔ اور اب جبکہ وہ دن آگیا ہے اور وہ نبی مبعوث ہو رہا ہے تو میرا فریضہ ہے کہ ایمان بھی لاؤں اور نصرت بھی کردوں تاکہ بابا کی روحِ پاک خوش ہو اور انکی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچے

ابوطالب کی یہ گفتگو درحقیقت ان کے ایمان کی ایک واضح دلیل ہے کہ اگر دنیا ان تمام کرامات وعلامات پر اعتماد نہ بھی کرے تو یہ آج کی گفتگو خود ایک مستقل برہان ہے اس استحکام عقیدہ، رسوخِ ایمان اور اطمینانِ قلب پر جن کے مجموعہ کا نام ابوطالب ہے۔

اگر عقیدہ کا یہ اتحاد واتفاق نہ ہوتا تو حضرت ابوطالب سب سے پہلے مخالفت کرتے۔ انقلاب کرتے اس لیے کہ یہ سب تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا، محمدؐ ان کی آغوش کا پروردہ تھا اور اس کا پیغام دنیا سے نرالا پیغام! ابھی تو کوئی قبول کرنے پر آمادہ بھی نہیں ہے ابھی تو نہ اس کی جڑیں قائم ہوئی اور نہ منکشف ہوا ہے کتنا آسان مرحلہ ہے کہ اسے روزِ اول ہی کچل دیا جائے۔ یا کم از کم بھتیجے کو اس حال ہی پر چھوڑ دیا جاتے نہ اس سے نصرت کا وعدہ کیا جائے اور نہ اس کا

---

[1] المناقب ج ۱ ص ۳۶، غایۃ المسئول ابراہیم حنبلی، طرائف ابن طاؤس ص ۸۶ شیخ الابطح ص ۱۲ العباس ص ۱۶ ۳۴۲ ص

دل بڑھایا جائے۔

لیکن تاریخ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ابوطالب ایمان کی طرف اس طرح لپکتے ہیں جیسے مدّت سے ہر ہر لمحہ اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حادثہ کوئی عجیب حادثہ یا یہ واقعہ کوئی نیا واقعہ نہ تھا!

یہی وجہ تھی کہ ابھی عباس کی گفتگو ختم نہ ہونے پائی تھی کہ ایک مرتبہ بھتیجے کو قیام کا حکم دیدیا۔ ظاہر ہے کہ اگر عقیدہ میں رسوخ اور ایمان میں پختگی نہ ہوتی تو گفتگو کا یہ انداز نہ ہوتا۔ ایک ضعیف انداز ہوتا اور ایک خفیف آواز۔ لیکن اسے کیا کیا جائے کہ ایمان کے جذبات اور اور اطمینانِ قلب کے محرکات نے اس صریحی اعلان پر مجبور کر دیا۔ انھوں نے دیکھا کہ بھتیجے کا یارا ہبت وزنی ہے لیکن مجھے کمک، دفاع اور نصرت سے باز نہ رہنا چاہیے۔ یہی تو وہ ہے جس کا ذکر بابا نے کتب سماویہ میں دیکھا تھا، اسی کے تذکرہ سے تو آسمانی صحیفے بھرے پڑے ہیں!

دعوتِ ذوالعشیرہ

اس کے بعد ایک وہ دن بھی آگیا جو ہدایت وجہالت کے اعتبار سے روزِ اوّل سے کم نہ تھا۔ یہ کونسا دن تھا؟ یہ وہ دن تھا جب آیتِ انذار نازل ہوئی اور رسولِ اکرمؐ نے مومنِ اوّل علیؑ کو حکم دیا کہ رؤساءِ قریش کو طلب کریں، ان کی دعوت ہو سب آئے پیغام سنایا گیا اور سب سن کر چل دئیے۔ دوسرے دن پھر بلائے گئے، پیغام سنایا گیا، اپنی ذمہ داریوں کا اظہار کیا گیا لیکن پھر کچھ نہیں۔ آخرکار ابوطالب کھڑے ہو گئے فرماتے لگے۔ فرمانے لگے تمھاری مدد کرنا تمھاری نصیحت کو قبول کرنا تمھاری باتوں کی تصدیق کرنا بہت اچھی چیز ہے۔ اگرچہ یہ سب ہی خاندان کے ہیں لیکن میں سب سے پہلے دعوت کو قبول کرتا ہوں۔ اب تم اپنا کام شروع کردو۔ خدا کی قسم میں تمھیں بچاؤں گا تمھاری حفاظت کروں گا پس میرا دل یہ نہیں چاہتا کہ عبدالمطلب کے دین کو ترک کردوں۔[1]

یہ سننا تھا کہ ابولہب اٹھ کھڑا ہوا کہنے لگا خدا کی قسم یہ ایک عار و ننگ ہے اس کو اسی وقت روک دو۔

حضرت ابوطالب نے فرمایا خدا کی قسم میں تاحیات اس کو بچاتا رہوں گا۔[2] یہ کہہ کر بھتیجے سے خطاب کیا میرے سردار اٹھیے جو چاہتے ہیں کہیے۔ اپنا پیغام پہنچائیے آپ صادق بھی ہیں اور صدیق بھی۔[3]

کیا کہنا اس ایمانی ہیبت کا جس نے چالیس افراد سے زیادہ کے مجمع میں ایک ابوطالب کو

۱: کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۲۴
۲: کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۲۴، السیرۃ الحلبیہ ج ۱ ص ۳۲۱
۳: شیخ الابطح ص ۲۲، الغدیر ج ۲ ص ۳۵۵،

تصدیق و ترغیب پر آمادہ کر دیا۔ جبکہ دوسرے لوگوں کا یہ عالم تھا کہ انھیں جاہلیت کے پردوں سے نور ایمان نظر ہی نہ آتا تھا۔

اب تو حضرت ابوطالب نصرت بھی کرینگے، نصیحت بھی قبول کرینگے اور باتوں کی تصدیق و تائید بھی کرینگے۔ ایمان کامل۔ اطاعت صادقہ اور حیائی تو بھی عقیدت اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے؟ سب سے پہلے دعوت قبول کرنا، بھتیجے کو پیغامبری کا حکم دینا، زندگی بھر امداد و حفاظت کا وعدہ کرلینا ایمان کے علاوہ اور کیا شے ہے؟

خدا کی قسم ابوطالب اگر ایمان و عقیدہ کی اس منزل پر نہ ہوتے تو ان کی گفتگو کا انداز کچھ اور ہوتا، ان کا موقف کسی اور طرز کا ہوتا۔ آخر ابولہب کا موقف ہمارے سامنے ہے اس کی تلخ کلامی بھی ہم نے دیکھ ہی لی ہے اس کی وہ گفت گو بھی ہمارے پیش نظر ہے جس کی بنا پر حضرت ابوطالب کو یہ کہنا پڑا تھا چپ رہ اے کانے، تجھ سے کیا تعلق ہے[1]؟

آپ بتائیں کیا ابوطالب اور ابولہب دونوں ہی چچا نہ تھے۔ پھر دونوں کے موقف میں اتنا شدید اختلاف کیسا؟ ایک طرف سے قربانی، تشجیع، کمک اور دوسری طرف سے معارضہ مقابلہ، تصادم، بدزبانی اور مسخرہ پن!

جب جناب ابوطالب نے ایمان و اخلاص کا اعلان کر دیا تو دیکھا کہ کچھ تیز و تند اور حسد آمیز نگاہیں بھی اٹھ رہی ہیں۔ چنانچہ آپ نے فوراً طے کرلیا کہ اپنے موقف کو مخفی کرلیا جائے۔ یہ طریق کار دعوت رسولؐ اور نصرت کامل کے لیے کچھ زیادہ مفید ثابت ہوگا۔

یہ سوچتے ہی آپ نے فرمادیا: "بس میرا دل عبدالمطلب کے دین کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتا" آخر یہ عبدالمطلب کا دین کیا تھا؟ کیا یہ دین ملت حنیفہ دین ابراہیم اور دعوت خلیل کا تسلسل

۱: بحار ج ۶ ص ۲۵، الغدیر ج ۷ ص ۳۵، شیخ الابطح ص ۳۲

نہ تھا کیا یہ دین ادیانِ سماویہ کا تتمہ و تکملہ نہ تھا؟ یقیناً تھا لیکن ابوطالب نے اسی پردہ میں اپنے موقف کو پوشیدہ کردیا۔ اور وہ بے بصیرت جاہلِ مطلق عرب کچھ نہ کرسکے۔

یہی وجہ تھی کہ جب ابولہب نے اس خاموشی سے فائدہ اٹھانا چاہا تو فوراً بگڑ کر کھڑے ہوگئے اور فرمایا "میرے سردار اٹھیے"؛ کیا یہ سرداری کا اعتراف ایمان کی دلیل نہیں ہے؟

ذرا غور تو کیجیے، سردار کا لفظ کون استعمال کررہا ہے اور کس کیلیے؟ ابوطالب جیسا عظیم انسان، جس نے تربیت کی ہے، پالا ہے، کفالت کی ہے، بزرگ ہیں، کبیرالسن ہیں۔ یہ لفظ تو خود محمدؐ کو استعمال کرنا چاہیے تھا۔ (اگر نبوت کا امتیاز نہ ہوتا)

لیکن رسالت کا حق ان تمام حقوق پر غالب آگیا۔ اب محمدؐ وہ سراج منیر ہے جس سے انسانیت بھولی ہوئی راہوں کو دریافت کریگی۔ اب تو اس کی منزل نسب، قرابت، تربیت، کفالت، سن و سال سب سے مافوق ہوگئی ہے۔

ابوطالب کے پیشِ نظر یہ تمام باتیں اسی وقت تھیں جب آپ سردار کہہ رہے تھے آپ یہ دیکھ رہے تھے کہ جب یہ بچہ رسول ہے تو میرا واجب الطاعت سردار اور قابلِ اتباع رئیس ہے، اس لیے بڑی آزادی سے کہہ دیا کہ آپ جو چاہیں کہیں اپنے پیغام کو پہنچائیں۔ آپ صادق بھی ہیں اور صدیق بھی۔ ظاہر ہے کہ جو ایسا صادق القول ہو کہ اگر پہاڑ سے لشکر کے نکلنے کی خبر دے تو کسی میں تاب شک و انکار نہ ہو۔ اس کے پیغام میں شبہہ کی گنجائش ہی کیا ہے!

ابوطالب نے دیکھا کہ چند آنکھوں سے شرارتیں جھلک رہی ہیں۔ کچھ لب حرکت میں آ رہے ہیں اور آپ کے کان تک ایک تمسخر آمیز جملہ پہنچ ہی گیا تو انھوں نے تو تم پکارے بیٹے

۱۔ ہمارے ہاں سن و سال کا کوئی معیار نہیں ہے ہم قلب و زبان کی آزمائش کرتے ہیں۔ سن کو معیارِ کمال وہی قرار دیتا ہے جو دیگر کمالات سے عاری ہوتا ہے۔ سن اسی وقت قابلِ احترام ہوتا ہے جب اس کے ساتھ دیگر فضائل و کمالات کا بھی امتزاج ہو۔ (جوادی)

کی اطاعت بھی واجب کردی[۱]۔ آپ نے یہ سن کر نہایت ہی اطمینان کے ساتھ کہہ دیا وہ جو کچھ کرے گا خیر ہی کرے گا۔

حضرت علیؑ نے حضرت ابوطالبؑ کی زبان سے یہ کلمہ پہلے پہل نہیں سنا تھا بلکہ اس محبّت بھرے جذبات آمیز جملے کو اس سے پہلے بھی اس وقت سن چکے تھے جب ابتدائے رسالت میں انھوں نے چپکے سے رسولِ اکرمؐ کی اقتدا میں نماز شروع کی تھی۔ اور اپنے باپ کے سوال کے جواب میں یہ کہا تھا "بابا جان! میں خدا اور رسولؐ پر ایمان لا چکا ہوں۔ رسولِ اکرمؐ کے احکام کی تصدیق کر چکا ہوں اور ان کے پیچھے نماز بھی پڑھ چکا ہوں"۔
اس پر حضرت ابوطالبؑ نے فرمایا تھا: "اسی طریقے پر باقی رہو اس لیے کہ یہ تمھیں خیر ہی کی دعوت دیں گے"[۲]۔

درحقیقت یہ کلمہ بڑے گہرے اطمینان و ایمان کی غمازی کرتا ہے۔ رسولؐ صرف خیر ہی کی دعوت دیں گے یعنی ہر عاقل کا فریضہ ہے کہ اُن کا اتباع کرے اور ان کے خیر و برکات سے مستفیض ہو۔
دراصل یہ کلمہ بھی انھیں بیشمار دلائل میں سے ایک دلیل ہے۔ ورنہ اگر حضرت ابوطالبؑ صاحبِ ایمان نہ ہوتے تو انھیں کیا ضرورت تھی کہ نبی کے نظام کی تائید و

۱: کامل ج ۲ ص۴۱ طبری ج ۲ ص۶۳ غایۃ المرام ص۷ ،۷۸، ۱۵۳، ۱۶۴، ۱۸۵، ۳۲۰، ۳۲۲، ۶۱۳۔ الغدیر ج ۲ ص۲۷۹ ۲۸۳ ج ۳ ص۲۰۹ اعیان الشیعہ ج ۲ ص۹ ۱۰۲ ج ۳۹ ص۱۶۴ رسائل جاحظ ص۳۱۔
۲: طبری ج ۲ ص۵۸ اصابہ ج ۴ ص۱۱۶ السیرۃ الشامیہ ج ۱ ص۲۶۴ النبویہ ج ۱ ص۱۷۶ الحلبیہ ج ۱ ص۳۰۶ شرح النہج ج ۳ ص۳۰۵ ینابیع المودہ ج ۲ ص۲۸ الریاض النضرہ ج ۲ ص۱۵۹ غایۃ المرام ص۵۰ ابوطالب ص۵۰ العباس ص۲۳ الغدیر ج ۷ ص۳۰۶ عیون الاثر ج ۱ ص۹۴ اسنی المطالب ص۱۰ رسائل جاحظ ص۵۱ صوت العدالۃ ص۳۵

ترویج کریں اور پھر اپنے فرزند کو بھی حکم دیں کہ وہ اسی قانون و نظام کو اختیار کرے۔

اگر وہ اس درجۂ کمالِ ایمان پر فائز نہ ہوتے تو اپنے فرزند کو اس پیغام کے قبول کرنے سے منع کرتے اور اسے اس وسیع راہ پر لے جاتے جو ایک کافر کی نظر میں سیدھی راہ ہوتی ہے۔

ان کی نظر میں محمدؐ کی دعوت میں خیر کے علاوہ کوئی اور احتمال ہوتا تو ان کا موقف آج کے طرزِ عمل سے مختلف ہوتا، وہ اپنے فرزند کو منع کرتے اور اسے اس غلط راستہ کو اختیار نہ کرنے دیتے۔

حضرت ابوطالبؑ کی تاریخ میں فقط یہی ایک سطر روشن نہیں ہے بلکہ آپ کی پوری تاریخ ایسے ہی روشن اور نورانی حروف سے لکھی گئی ہے۔ جناب امیرؑ فرماتے ہیں کہ میرے والد ماجد نے مجھ سے فرمایا "اپنے بھائی کے طریقے کو اختیار کرو وہ ہر قریب و بعید بختی سے بچائے گا۔ پھر اعلان کیا:

"اِنَّ الوثیقۃ فی لزوم محمد فاشدد بصحبۃ علی سیدیک"

"اے علیؑ محمدؐ کی متابعت میں اطمینان و سکون ہے لہٰذا انھیں کے ساتھ رہا کرو"[۱]

گویا کہ آپ کی نظر میں دینِ رسولؐ کا اتباع کرنا دنیا و آخرت کی سلامتی کا ضامن ہے اور درحقیقت روزِ جزا ایمان کا یہی جوہر ہے کہ انسان کی نظر میں ایک ایسا دن بھی ہو جب ہر شخص کو اس کے عمل کا بدلہ دیا جائیگا۔ اور ہر ایک کا حساب صاف کیا جائیگا۔

ایک مرتبہ آپ کی نظر رسولؐ کی نماز پر پڑ گئی۔ دیکھا کہ داہنی طرف علیؑ ہیں اور بائیں طرف خالی۔ فوراً جعفر کو آواز دی بیٹا جاؤ اور بائیں طرف کھڑے ہو جاؤ"[۲]

۱: شرح النہج ج ۳ ص۳۱۲ اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص۱۳۳ ہاشم و امیہ ص۱۶۳۔

۲: السیرۃ النبویہ ج ۱ ص۲۶۵ الحلبیہ ج ۱ ص۲۸۶ اصابہ ج ۴ ص۱۱۶ شرح النہج ج ۳ ص۳۱۴ الغدیر ج ۷ ص۳۵۶ اسد الغابہ ج ۱ ص۲۸۷ وغیرہ

یہ کہہ کر کچھ اشعار پڑھنا شروع کر دیے جن میں اپنے دونوں فرزندوں کی واقعی مدح اور ان کیلئے ایک دستور حیات بیان کر دیا:

"ان علیاً وجعفراً ثقتی عند ملمۃ الزمان والنوب لاتخذ لا وانصرا ابن عمکما اخی لامی من بینھم وابی واللہ لا اخذل النبی ولا یخذ لہ من بنی ذو حسب [1]

علیؑ و جعفرؑ مصائب زمانہ اور رشد اندر روزگار میں میرے معتمد علیہ ہیں۔ میرے بیٹو! اپنے بھائی کی کمک کرو یہ میرے حقیقی بھائی کا فرزند اور اس کی یادگار ہے خدا کی قسم نہ میں اسے چھوڑ سکتا ہوں اور نہ میری اولاد میں سے کوئی شریف اس کا ساتھ چھوڑے گا۔

ایک وقت وہ آتا ہے جب اپنے بھائی حضرت حمزہ کو آواز دیتے ہیں بھیا دین خدا کا اظہار کرو اور اس سلسلے میں مصائب برداشت کرو۔ صاحب شریعت کی حفاظت میں عزم محکم اور ارادۂ مستحکم سے کام لو۔ اس کے بعد حسب ذیل اشعار کے ذریعے اس تحریک کو آگے بڑھاتے ہیں:

فصبراً ابا یعلی علی دین احمد وکن مظھرا للدین وفقت صابرا
وحط من اتی بالحق من عند ربہ بصدق وعزم لا تکن حمز کافرا
فقد سرنی اذ قلت انک مومن فکن لرسول اللہ فی اللہ ناصرا

---

[1] شرح النہج ج ۳ ص ۳۱۲ ۲۷۲ الحجۃ ص ۵۱ دیوان ابوطالب۔ شیخ الابطح ص ۳۸ ایمان ابی طالب ص ۱۹ اعیان الشیعہ ج ۲ ص ۹ ج ۳۹ ص ۱۳۴ معجم القبور ج ا ص ۱۹۶ ۲۰۱ الغدیر ج ۷ ص ۳۵۶ رسائل جاحظ ص ۲۹

ونادِ قریشاً بالذی قد اتیتہ جہاراً وقل ماکان احمد ساحراً[1]

حمزہ دینِ احمد کا اعلان کرو اور صبر کرو، اللہ تمہیں صبر کی توفیق دے۔ صاحبِ شریعت حقہ کی صدق دل سے حفاظت کرو اور کافر نہ ہو مجھے بڑا بھلا معلوم ہوا کہ تم نے ایمان قبول کر لیا۔ اچھا فی سبیل اللہ اب رسول کی نصرت بھی کرو۔ قریش میں اپنے ایمان کا اعلان کر کے کہہ دو کہ محمد ساحر اور جادوگر نہیں ہے۔

درحقیقت ابوطالب اسلامی تحریک کا وہ قائد ہے جو ہر آن موقع کی تلاش میں رہتا ہے۔ ادھر موقع ملا اور ادھر مافی الضمیر کا اعلان شروع کر دیا۔

اس داعیٔ اول کو یہی بھلا معلوم ہوتا ہے کہ حمزہ اپنے کو مومن کہیں اور پھر رسول کی نصرت بھی کریں۔ وہ نصرت جس میں قربتِ الٰہی کا قصد ہو نہ خون کا خیال ہو نہ قرابت کا اس لیے کہ دین ہر شے پر مقدم اور عقیدہ ہر چیز سے مافوق ہوتا ہے۔

میرا دل چاہتا ہے کہ اس فصل کے خاتمہ میں علامہ برزنجی کا وہ قول بھی پیش کر دوں جو اس مقام سے بڑی حد تک مناسبت رکھتا ہے وہ فرماتے ہیں "اخبار متواترہ سے ثابت ہے کہ ابوطالب رسول اکرمؐ کو چاہتے تھے ان کی نصرت و حفاظت چاہتے تھے، ان کی نصرت و حفاظت کرتے تھے تبلیغ دین میں اُن کا ہاتھ بٹاتے تھے خود ان کے اقوال کی تصدیق کرتے تھے اور اپنے بیٹے علیؑ و جعفرؑ کو ان کے اتباع کا حکم دیا کرتے تھے۔

ان اخبار سے صحیح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ابوطالب کا سینہ نورِ ایمان و عقیدہ سے بالکل معمور و منوّر تھا۔[2]

۱: شرح النہج ج۳ ص۳۱۵ الحجۃ ص۱۰۷ مناقب ص۳۶ بحار ج۹ ص۲۵ عباس ص۳۲ ایمان ابی طالب ص۱۲ اعیان الشیعہ ج۳۹ ص۱۲۶ مجمع البیان ج۷ ص۳۷ (قدرے اختلاف کے ساتھ) ۲: الغدیر ج۷ ص۳۵۸ اسنی المطالب ص۹ و ص۱۰۔

جہاد

حضرت ابوطالب جیسے محافظ و شفیق کی برکت تھی کہ رسول اسلام کی دعوت میں ایک کیف پیدا ہو گیا۔ اس کی شعاعیں عالم میں پھیل گئیں اس لیے کہ ابوطالب نے اپنے بھتیجے کی نصرت اور اسکے دین کی حفاظت کا عہد کر لیا ہے ان کا ارادہ ہے کہ اس دین اور مبلغ کی راہ میں ہر قربانی پیش کر دیں، خواہ وہ اپنے نفس کی قربانی ہو یا اپنے پارۂ جگر کی!

رسول نے بھی اس نصرت و حفاظت پر اعتماد کر کے انتہائی کیف و نشاط کے ساتھ اپنی تبلیغ شروع کی ہے۔ اب نہ بیان میں جھجک ہے نہ اعلان میں خوف و ہراس۔ اب ان کے پاس ایک ایسی بنیاد ہے جس پر اعتماد کر سکتے ہیں اور ایک ایسا سایہ ہے جس کے دامن میں آرام لے سکتے ہیں۔

یہاں سے حضرت ابوطالب کی تاریخ کے روشن صفحات کا آغاز ہوتا ہے۔ اس تاریخ حیات کا ہر صفحہ دوسرے صفحہ سے زیادہ نورانی اور اسکی ہر سطر دوسری سطر سے زیادہ نور آمیز ہے اس کے ایک صفحہ پر ایمان محسوس کی تصویر ہے تو دوسرے صفحہ پر جہاد مستقل اور حیات کاملہ کی تمثیل۔ یہ وہ صفحات ہیں جن پر حمایت، قربانی، دفاع اور تبلیغ حق کی تحریریں ہیں۔ یہ وہ صفحات ہیں جن پر جہاد صادق اور دفاع محکم کے نقوش ہیں اور ظاہر ہے کہ انسانی زندگی بھی بقول شوقی "عقیدہ و جہاد کے امتزاج کا نام ہے"۔ یہاں تو ایمان کامل عقیدہ راسخ بھی ہے اور جہاد مسلسل و دفاع متصل بھی زبان کا بیان بھی ہے اور نوک سناں بھی چمکتی تلواریں بھی ہیں اور مضبوط بازو بھی، تلواروں کو کند کرنے والے ارادے بھی ہیں اور پتھر کو پاش پاش کر دینے والے عزائم بھی!

دعوتِ توحید اور تبلیغِ مذہب میں وہ کیف ہے کہ قریش کو یہ خطرہ لاحق ہوگیا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمام انسان وحدہٗ لاشریک کی عبادت کرنے لگیں اور اپنے خود تراشیدہ پتھر دھرے کے دھرے ہی رہ جائیں، وہ پتھر جو نہ دیکھتے ہیں نہ سنتے ہیں، نہ ان کا کوئی فائدہ ہے نہ نقصان، بشریت ان کے سامنے دست بستہ کھڑی ہوتی ہے۔ انسانیت ان کی بارگاہ میں اپنی حریتِ فکر اور آزادیٔ ضمیر کھو بیٹھتی ہے عقلیں مغلوب، رسوم و تقالید غالب، احساس مفقود، شعور معدوم، اب انسان گوشت و پوست کا انسان ہے اور عقل و شعور کا جمود

تبلیغ میں نشاط آ گیا، مومنین کی تعداد بڑھتی رہی یہاں تک کہ رسول اعظم نے اپنا اعلان عام کر دیا۔ مصنوعی خداؤں کی حیثیت واضح کر دی۔ حالات پر تنقیدی تبصرہ کر کے لوگوں کو جہالت و ضلالت سے نکل کر صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے کا پیغام دے دیا۔

لیکن افسوس! کسی اندھے کو کیا خبر کہ نور کیا ہے؟ چمگادڑ کو کیا معلوم کہ آفتاب کی شعاعوں میں کیا چمک دمک ہوتی ہے!

قریش کو یہ بات کھل گئی کہ محمدؐ ان کے خداؤں پر اتنا کھلا ہوا تبصرہ کریں لیکن ان کے پاس ابوطالبؑ سے زیادہ انصاف پسند کوئی انسان بھی نہیں ہے۔ چنانچہ چند اشرافِ قبیلہ آپ کے پاس یہ شکایت لیکر پہنچے کہ آپ کے بھتیجے نے ہمارے خداؤں کو بُرا بھلا کہا ہے۔ ہمارے دین کی مذمت کی ہے۔ ہماری عقلوں کو ضعیف اور ہمارے بزرگوں کو گمراہ قرار دیا ہے۔ آپ یا تو انھیں روک دیں یا پھر ہمارے حوالے کر دیں۔ ہم ان سے اپنا حساب خود چکا لیں گے۔ آخر آپ بھی تو ہمارے ہی ہم خیال ہیں[1]۔

---

[1] یہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابوطالبؑ نے تقیہ کیوں کیا تھا؟ یاد رکھیے اگر آج ان کا ایمان ظاہر ہوگیا ہوتا تو قریش شکایت لیکر نہ آتے بلکہ جنگ کرنے آتے۔ اور اس طرح تبلیغ اسلام کا وہ انجام ہوتا جو آج تصور سے بھی باہر ہے۔ (جوادی)

حضرت ابوطالبؑ نے انھیں سمجھا بجھا کر واپس کر دیا۔ اور رسولؐ پھر اپنی تبلیغ میں مصروف ہو گئے۔ پھر وہی اعلانِ توحید اور پھر وہی مذمّتِ اصنام!

جب قریش نے یہ دیکھا کہ ہماری آواز صدا بصحرا ہو گئی ہے اور ہماری طلب پر کوئی نتیجہ بر آمد نہیں ہوا تو دوبارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے:

"اے ابوطالبؑ! آپ بزرگ، باشرف اور مُسن آدمی ہیں۔ ہم نے آپ سے کہا کہ اپنے بھتیجے کو روک دیجیے لیکن آپ نے کچھ نہیں کیا۔ ہم اس سب و شتم اور تمسخر و استہزا پر صبر نہیں کر سکتے۔ لہٰذا یا تو آپ روک دیں یا پھر ہم سے مقابلے پر آمادہ ہو جائیں"

اب ابوطالبؑ یہ بات سن کر عجیب کش مکش میں گرفتار ہو گئے۔ نہ ایسی جنگ کا اعلان کر سکتے ہیں جس میں سارے خاندان کو کٹوا دیں اور نہ رسولؐ ہی کا ساتھ چھوڑ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ اُن سے بھی نصرت کا وعدہ کر چکے ہیں اور اپنے باپ کی وصیت کا خیال بھی دامنگیر ہے۔

آخر کار آپ نے کچھ سوچ کر بھتیجے کو بُلایا، لوگوں کا پیغام سنایا اور چاہا کہ اس طرح بھتیجے کی صحیح رائے کا اندازہ کر لیں۔ فرمانے لگے بیٹا! اپنے اور ہمارے اوپر رحم کرو۔ ناممکن چیز کا بار نہ اٹھاؤ۔

لیکن آپ نے دیکھا کہ بھتیجے کے چہرے سے سوائے قوت، عزم، ارادہ، استقلال کے کسی اور شے کے آثار نمایاں نہیں ہوتے۔ زبان پر یہ کلمات ہیں:

"چچا! اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ پر آفتاب اور بائیں ہاتھ پر ماہتاب رکھ دیں تو بھی اس پیغام کو ترک نہ کروں گا، اب یا میں ہلاک ہو جاؤں گا یا پیغامِ الٰہی غالب آجائے گا"

ابوطالبؑ نے دیکھا کہ بھتیجا رنجیدہ ہو کر گھر سے جانا چاہتا ہے۔ بعض مؤرخین کے

خیال کی بنا پر صرف اس لیے کہ اس کی نظر میں چچا کی ہمدردیاں ختم ہو گئی ہیں اور اب وہ مدد کرنا نہیں چاہتے ۔ چنانچہ آپ کی آنکھوں سے چند قطراتِ اشک بھی گرے[1] ابوطالبؑ نے جب دیکھا تو خونِ حمیت جوش کھانے لگا ۔ عزم محکم نے کروٹیں لیں اور آپ نے یہ طے کر لیا کہ مجھے اس بچے کی مدد کرنا ہے چاہے سارا قریش بلکہ پورا عالمِ عرب ہی کیوں نہ مخالف ہو جائے ، جہاد میرا ایک فریضہ ہے مشیتِ الٰہی نے مجھے اپنے پیغام کا محافظ اور اپنے مبلغ کا نگران و مربی بنایا ہے ۔ چنانچہ یہ سوچ کر فرمایا کہ بیٹا ادھر آؤ ۔ رقت و شفقت کے ڈھلے ہوئے الفاظ نے لقا۔۔ اضطراب کے سلسلے کو توڑا ، خاموشی کا قلعہ ٹوٹا اور فرمانے لگے ۔ بیٹا جو چاہو کہو ، خدا کی قسم میں تمہیں ان کے حوالے نہیں کر سکتا[2] ۔ اس کے بعد جوشِ محبت میں یہ اشعار پڑھنا شروع کر دیے :

واللہ لن یصلوا الیک بجمعہم حتی اوسد بالتراب دفینا

فاصدع بامرک ما علیک غضاضۃ وابشر بذاک وقر منک عیونا

ودعوتنی وعلمت انک ناصحی ولقد صدقت وکنت ثم امینا[3]

۱: ہم رسول اکرمؐ کی طرف سے اس بدظنی کو قبول نہیں کر سکتے ہمارے خیال میں یہ قطراتِ اشک اس مستقبل کے تصور سے تھے جس میں چچا کو مبتلائے مصائب و مشاکل ہونا تھا۔

۲: طبری ج ۲ ص ۶۶ ، ۶۷ النبویہ ج ۱ ص ۹۶ الحلبیہ ج ۱ ص ۳۲۲ ہشامیہ ج ۱ ص ۲۸۳ ، ۲۸۵ شرح نہج البلاغہ ج ۲ ص ۳۰۵ ، ۳۰۶ ابوطالب ص ۶۱ ہاشم و امیہ ص ۱۶۶ اعیان الشیعہ ۳۹ ص ۱۲۷ الغدیر ج ۷ ص ۳۲۳

۳: شرح النہج ج ۳ ص ۳۰۶ النبویہ ج ۱ ص ۸۵ ، ۱۹۷ ثمرات الاوراق ج ۲ ص ۷ العباس ص ۲۲ ، ۱۲ ہاشم و امیہ ص ۱۶۷ الکشاف ج ۱ ص ۴۴ ج ۲ ص ۱ تذکرۃ الخواص ص ۹ معجم القبور ص ۱۸۶ مناقب ص ۳۴ دیوان ابوطالب ص ۷ اعیان الشیعہ ۳۹ ص ۱۲۸ الحلبیہ ج ۱ ص ۲۲ اصابہ ج ۴ ص ۱۱۶ الحجہ ص ۲۳ بلوغ الارب ص ۲۰ الغدیر ج ۷ ص ۳۳۴ (تھوڑے تھوڑے اختلاف کے ساتھ)

ولقد علمت بان دین محمد من خیر ادیان البریۃ دینا

خدا کی قسم جب تک میں زندہ ہوں تمھیں کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا۔
تم نہایت ہی اطمینان کے ساتھ اپنے امر کا اعلان و اظہار کرو
تمھاری دعوت صادق تم خود ناصح کامل اور امین معتمد ہو،
میں بخوبی جانتا ہوں محمدؐ کا دین تمام ادیان سے بہتر ہے۔

ہم ان اشعار کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ بلکہ ہمیں ان کے مفاہیم میں غور و تامل سے کام لینا ہوگا۔ ان میں ایمانِ ابوطالب کے وہ دلائل دیرِ نہین پوشیدہ ہیں جن میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

حضرت ابوطالب جب کفار قریش کا پیغام پہنچا کر رسول اکرمؐ کو اطمینان دلا چکے روشن ضمیر، مدبرؔ عقل اور شفیق دل کے ڈھالے ہوئے اشعار سنا چکے تو آپ نے چاہا کہ اپنی واقعی حیثیت کا اظہار بھی کر دیں اور اپنے اس عہد کی تجدید بھی کر دیں جس پر روزِ اول سے عمل کر رہے ہیں۔ آپ کے اشعار اسی حقیقت کا اظہار کر رہے تھے پہلے اپنے جاہ و جلال کا اظہار کرتے ہیں کہ جب تک میرے دم میں دم ہے اور روئے زمین پر زندہ ہوں کسی کی مجال نہیں کہ آنکھ اٹھا کر دیکھ سکے۔ اس کے بعد رسولِ اکرمؐ کو اعلانِ توحید کا حکم دیتے ہوئے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ تمھیں کوئی اندیشہ کوئی تردد نہیں ہونا چاہیے ابھی تو ابوطالب جیسا معین و مددگار موجود ہے۔

آخر کے اشعار میں اپنے ایمان و عقیدہ کی بات بھی واضح کر دی۔
میرا ایمان، معرفت، تحلیل، تحقیق اور تجزیہ کا ایمان ہے۔ یہ تقلید اور رسم و عادات کا ایمان نہیں ہے۔
پھر آخری شعر میں تو یہاں تک بتا دیا کہ میری بصیرت تمام ادیانِ عالم کا جائزہ لے رہی ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ عالم کے ان بیشمار ادیان میں محمدؐ کا دین سب سے بہتر ہے۔

بظاہر آپ کے آخری شعر میں کلمہ من سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی نظر میں محمدؐ کا دین اچھے دینوں میں سے ہے لیکن یہ غلط ہے اس لیے کہ اس مقام پر اس کلمہ کا استعمال صرف ضرورتِ شعریہ کی بنا پر ہوا ہے۔ ورنہ آپ کی بصیرت واقعیت و حقیقت کا جائزہ لینے میں معراجِ کمال پر تھی۔

"خدا بھلا کرے اس ضرورتِ شعریہ کا اس کی وجہ سے کتنے اچھے مطلب برباد اور کتنے برے مفاہیم اچھے بن جاتے ہیں۔

جب خواہش اور نفس پرستی نے دیکھ لیا کہ حضرت ابوطالب کے ان اشعار سے ایمانِ کامل اور عقیدۂ راسخہ کا اظہار ہوتا ہے اور ہمارے تمام ہفوات و خرافات پامال ہوئے جا رہے ہیں تو فوراً اس بات پر کمر باندھ لی کہ ان ایمان افروز عقیدہ پرور اشعار کو تباہ و برباد کیا جائے تاکہ حضرت ابوطالب کا ایمانِ محکم اور عقیدۂ مستحکم کسی نہ کسی طرح مشکوک بن جائے۔

چنانچہ ایمان کی نورانیت، عقیدہ و افکار کی عظمت کو بے رونق بنانے کے لیے ایک پانچویں شعر کا بھی اضافہ کر دیا گیا:

لولا الملامۃ او حذاری سبۃ لوجدتنی سمحاً بذاک مبینا

(اگر مجھے مذمت و ملامت کا ڈر نہ ہوتا تو میں اس پیغام کو کھل کر قبول کرتا)

آپ غور کریں گے تو آپ کو گزشتہ اشعار اور اس ایک شعر کے درمیان طرز ادا، اسلوب فکر کے اعتبارات ایک عظیم فرق نظر آئے گا۔ السید احمد زینی دحلان نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے: "بعض حضرات کا خیال ہے کہ اس شعر کو ابوطالب کے کلام میں داخل کر دیا گیا ہے اور یہ ان کا نہیں ہے۔"[۱]

۱: الغدیر ج ۷ ص ۳۳۴ میں یہ حیلہ اسنی المطالب سے نقل کیا گیا ہے لیکن افسوس کہ انھیں زینی صاحب نے سیرت نبویہ میں اس شعر کو بھی نقل کر دیا ہے اور وہاں کوئی تردید مذکور نہیں خدا جانے ان تناقضات کا منشا کیا ہے۔ اسنی المطالب کے بیانات و مطالب کچھ اور ہیں اور سیرت کا انداز کچھ اور ہے۔

لیکن اس کے باوجود اگر ہم ان غرضمند، خواہش پرست افراد کا ساتھ دینا بھی چاہیں تو ہمیں یہی نظر آئیگا کہ تیر نشانہ سے خطا کر گیا ہے اور مقصد حاصل نہیں ہو سکا اس لیے کہ اس شعر میں ایمان کے کھلم کھلا اعلان کی نفی کی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ ایمان کا قبول نہ کرنا اور ہے اور اس کا علی الاعلان اظہار نہ کرنا اور۔

جب قریش نے رسول اکرمؐ اور رسالت عظمیٰ کے بارے میں حضرت ابوطالب کے موقف کو دیکھ لیا اور دیکھ لیا کہ ان کے ہوتے ہوئے کوئی اسکیم کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ان سے کہا گیا کہ اپنے بھتیجے کو روک دیں، نہیں روکا۔ پھر کہا گیا کہ ہمارے حوالے کر دیں لیکن بجائے سپردگی کے اس کی ہمت بڑھانے لگے، اس کا دل بڑھانے لگے اور اس کی طرف سے جہاد و دفاع پر آمادہ ہو گئے۔

اب یہ طے پایا کہ عمارہ بن ولید جیسے حسین و جمیل جیسے جوان رعنا کو فدیہ قرار دیکر اپنا مقصد حاصل کریں۔ چنانچہ اسے لیکر حضرت ابوطالب کے پاس آئے اور کہنے لگے اے ابوطالب یہ عمارہ عرب کا خوبصورت شکیل اور شاعر جوان ہے اسے لیکر اپنا بیٹا بنالو اور محمدؐ کو ہمارے حوالے کر دو ہم انھیں ختم کر دیں اس لیے کہ انھوں نے تمھارے دین کی مخالفت کی ہے۔ تمھارے باپ دادا کے دین کی مذمت کی ہے اور تمھاری جماعت میں تفرقہ ڈالا ہے۔

حضرت ابوطالبؑ اگر موقع شناس اور موقف کی نزاکت سے واقف نہ ہوتے تو اس بات پر ایسا قہقہہ لگاتے کہ ساری فضا گونج جاتی۔ لیکن کیا کہنا اس نباضِ فطرت انسان کا کہ اس نے نہایت ہی متانت سے جواب دیا:

"خدا کی قسم بڑا خراب معاملہ ہے میں تمھارے بچے کی پرورش کروں اور تم میرے بچے کو قتل کر دو۔ خدا کی قسم یہ تو کبھی نہیں ہو سکتا!"

انحطاطِ فکر، ضعفِ کلام اور ظلم و جفا کی یہ بے نظیر مثال ہے جس سے رائے کی پستی فکر کی کمزوری، موازین کی خرابی اور اقدار کی تباہی کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

جب مطعم بن عدی بن نوفل بن عبد مناف کو یہ خبر ملی تو کہنے لگا اے ابوطالب! قوم نے تمھیں محمدؐ سے بچانے کی بہترین راہ بتائی ہے میرا خیال ہے اسے قبول کر لینا چاہیے۔

آپ نے جواب دیا "خدا کی قسم یہ قوم ناانصاف ہے اور تم نے تو اور بھی غضب کر دیا۔ اچھا اب جو چاہو کر لو"۔[1]

اس مقام پر حضرت ابوطالب نے ایک قصیدہ کہا ہے جس میں مطعم کے اس انحراف کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد عبد مناف کی تمام اولاد پر تعریض فرمائی ہے اور آخر میں سارے قریش کا تذکرہ کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

الا قل لعمرو والولید ومطعم	الا لیت حظی من حیاطتکم بکر
من الخور حبحاب کثیر رغاؤہ	یرش علی الساقین من بولہ قطر
تخلف خلف الورد لیس بلاحق	اذا ما علا الفیفاء قیل لہ وبر
اری اخوینا من ابینا وامنا	اذا سئلا قالا الی غیرنا الامر
بلی لھما امر ولکن تجرجما	کما جرجمت من راس ذی علق صخر
اخص خصوصا عبد شمس ونوفلا	ھما نبذانا مثل ما ینبذ الجمر
ھما اغمزا للقوم فی اخویھما	فقد اصبحا منھم اکفھم صفر
ھما اشرکا فی المجد من لا ابا لہ	من الناس الا ان یرس لہ ذکر
وتیم ومخزوم وزھرۃ منھم	وکانوا لنا مولا اذا بغی النصر

۱۔ طبری ج ۲ ص ۶۷، السیرۃ الحلبیہ ج ۱ ص ۳۲۳، النبویہ ج ۱ ص ۱۹۷، الشامیہ ج ۱ ص ۲۸۶، الحدیدی ج ۳ ص ۳۰۳، ابوطالب ص ۶۱-۶۳، بحار ج ۶ ص ۲۴۲، تذکرۃ الخواص ص ۱۹، الغدیر ج ۷ ص ۳۴۶، اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۴۹۔

فواللّٰہ لاتنفک منا عداوۃ ... ولا منہم ما کان من نسلنا شفر

فقد سفہت احلامہم وعقولہم ... وکانوا کجعفر بئس ما صنعت جعفر

وما ذالک الا سؤدد خصنا بہ ... الٰہ العباد واصطفانا لہ الفخر

رجال تمالوا حاسدین وبغضۃ ... لاہل العلی فبینہم أبداً وتر

"ولید" ابوہ کان عبد أبعدنا ... الی علجۃ زرقاء جال بہا السحر

کوئی عمرو ولید مطعم سے کہدے کہ کاش میرے ساتھ تمھاری ہمدردیاں اسی مقدار میں ہوتیں جس طرح وہ اونٹ کا بچہ ہوتا ہے جو انتہائی ضعیف، لاغر پستہ قد اور متواتر پیشاب کرنیوالا ہوتا ہے۔ قافلہ کا ساتھ دینے سے عاجز ہوجاتا ہے اور بالکل بلی کے برابر معلوم ہوتا ہے۔ افسوس ہمارے خاندان کے لوگ ہم سے بے تعلقی کا اظہار کر رہے ہیں حالانکہ ان کو ہم سے ربط ہے یا انسانیت کے درجہ سے اس طرح گر گئے ہیں جس طرح پہاڑ سے پتھر۔ میں بالخصوص عبد شمس اور نوفل کو کہتا ہوں کہ ان دونوں نے ہمیں چنگاری کی طرح پھینک دیا ہے۔ انھوں نے دوسروں کیلئے ہم سے علیحدگی اختیار کرلی ہے اور اب ہم سے خالی ہاتھ ہوگئے ہیں۔ انھوں نے بے شرف لوگوں کو ہمارے برابر کردیا ہے۔ وہ لوگ جو اپنے شرف کا تذکرہ چپکے چپکے کرتے ہیں۔ یہ بنی تیم و مخزوم اور زہرہ کل تک ہمارے متبع و خدام تھے حقیقتاً یہ ہمارے عزیز موقوف ہیں انھوں نے ہم سے واقعہ جفر کی طرح غداری کی ہے۔ یہ سب کیوں ہے؟ اس لیے

۱: ابن ہشام نے اپنے اس قصیدہ کو اپنی سیرت کے ج ۱ ص ۲۸۶ پر نقل کیا ہے لیکن یہ آخری تین شعر ترک کر دیے ہیں۔ علامہ امینی مدظلہ نے الغدیر ج ۷ ص ۳۴۱ پر یہ اشعار نقل کیے ہیں اور فرمایا ہے کہ ان اشعار کے ترک کر دینے سے ابن ہشام کا مقصد بالکل واضح ہے۔

کہ اللہ نے ہمیں سرداری دیکر قابلِ فخر بنادیا ہے۔ یہ عبد الشمس وغیرہ سب مل کر ہم سے بغض وحسد کرتے ہیں اور اب تو یہ عداوت باقی رہے گی۔ یہ ولید کیا ہے اس کا باپ مغیرہ تو ہمارے حلہ کا غلام تھا۔

جب حضرت ابوطالبؑ نے اپنی رائے کا اعلان کرکے قریش کے موقف کا جائزہ لے لیا تو اب آپ نے مناسب یہ خیال کیا کہ قریش کے ہر مقابلے کے لیے تیاری شروع کردیں ظاہر ہے کہ اس وقت آپ کے پیش نظر سوائے بنی ہاشم اور بنی عبد المطلب کے کوئی ایسا نہ تھا جو ان مشکلات کا مقابلہ کرسکے اور ایسے نازک موقع پر رسول اکرمؐ کے تحفظ کا بار اٹھاسکے چنانچہ آپ نے بنی ہاشم کے بہادروں کو اس امر خیر کی طرف دعوت دی اور سب نے قبول بھی کرلیا۔ صرف ایک سرپھرا بھائی الگ رہ گیا یعنی ابولہب۔ ابوطالب جب بنی ہاشم کے جوانوں کی شان دیکھتے تھے تو چہرہ پر تبسم کے آثار نمودار ہوجاتے تھے۔ دل کو اطمینان فکر کو قرار اور قلب کو سکون حاصل ہوجاتا تھا کہ اب میرا رسول تمام اشرار سے محفوظ رہے گا اس کے ساتھ ہی ان بہادروں کے شکریے اور ان کی مدح میں رطب اللسان ہوجاتے تھے ان کی تشجیع وتائید کرتے تھے اور ان کیلئے ایک ایسا سرمایۂ ذکر مہیا کرتے تھے جو آئندہ نسلوں کی زبان پر جاری ہو اور جسے آنے والا زمانہ بھی سُنے!

ظاہر ہے کہ ایسے جوانوں کے تذکرہ میں اس محمدؐ کا تذکرہ بھی انتہائی ضروری تھا جس پر وفاکاری کے لیے یہ سب آمادہ ہوئے تھے جو اس شرافت کا مخزن اور اس بزرگی کا مرکز تھا جس کے کردار کی نہ اولین میں کوئی نظیر تھی نہ آخرین میں۔ چنانچہ آپ کے بعض اشعار یہ ہیں:

اذا اجتمعت یوماً قریش لمفخر	فعبد مناف سرها وصميمها
فان حصلت اشراف عبد منافها	ففی هاشم اشرافها وقديمها
وان فخرت یوماً فان محمداً	هو المصطفیٰ من سرها وكريمها

حدتت قریش غشا وسمینها ۔ علینا فلم تظفر وطاشت حلومها
وکنا قدیما لانقر ظلامة ۔ ان ماثنوا صعر الخدود نقیمها
ونحمی حماها کل یوم کریهة ۔ ونضرب عن احجارها من یرومها
بنا انتعش العود الذواء وانما ۔ باکنافنا تندی وتنمی ارومها

اگر قریش میں کوئی بات قابل فخر ہے تو وہ عبد مناف ہیں،
اور اگر عبد مناف میں کوئی بات ہے تو وہ بنی ہاشم میں ہے
اور اگر بنی ہاشم میں کوئی شے ہے تو وہ محمد مصطفیٰ میں ہے
قریش نے ہم پر ہر قسم کے حملے کیے لیکن کامیاب نہ ہو سکے ان کی فکریں خطا کر گئیں
ہم نے کبھی ظلم برداشت نہیں کیا جب بھی کسی نے تکبر سے کام لیا ہم نے اسے فوراً سیدھا کیا
ہم فضیلتوں کا تحفظ کرتے ہیں اور انکی طرف سے دفاع کرتے ہیں۔
خزاں دیدہ شاخوں میں بہار ہم سے آتی ہے جڑوں کی نشوونما ہمارے کرم سے ہوتی ہے
رسول اکرمؐ کی شوکت بڑھتی گئی۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ بنی ہاشم اور قریش کا اختلاف وسیع تر ہوتا گیا۔ اب ابوطالب کو ہر آن کفار قریش سے ایک نئے خطرہ کا اندیشہ ہے، وہ نہیں چاہتے کہ محمدؐ ایک آن کیلئے بھی انکی نظروں سے اوجھل ہوں اس لیے کہ یہ غیبت ان کے قلب نازنین میں ایک قلق و اضطراب اور ان کے خیالات میں ایک طوفان برپا کر دیتی ہے۔

---

(۱) السیرۃ الہشامیہ ج ۱ ص ۲۸۵ السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۲۰ الحلبیہ ج ۱ ص ۳۳ الحجۃ ص ۱۰۹ ۔ ۸۰ اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۴۱ (قدرے اختلاف کے ساتھ) الغدیر ج ۷ ص ۳۶۲ ۔ ۳۶۳ پر صاحب اسنی المطالب کا یہ قول بھی مذکور ہے کہ یہ اشعار حضرت ابوطالب کا وہ شاہکار ہیں جن سے ان کے ایمان و تصدیق پر روشنی پڑتی ہے۔ صاحب شیخ الابطح نے بھی ص ۳۷ پر ان اشعار کا ذکر کرنے کے بعد اس قول کو درج کیا ہے۔

اتفاقاً ایک دن محمدؐ ابوطالب کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ تلاش کیا نہ ملے۔ اب کیا تھا ابوطالب کے دل میں اضطراب و تشویش کے ساتھ ہی انتقام و مقابلے کے جذبات کروٹیں لینے لگے۔ اس لیے کہ انھوں نے یہ بھی سن پایا کہ قریش محمدؐ کو دھوکے سے قتل کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔

چنانچہ آپ نے جوانانِ بنی ہاشم کو بلایا اور سب کو حکم دیا کہ کپڑوں کے اندر اسلحہ چھپا کر ایک ایک سردار قریش کے پاس کھڑے ہو جائیں پھر ان کے لیے ایک اشارہ بھی معین کر دیا کہ اگر اب بھی محمدؐ نہ مل سکے تو ان کا خون رائیگاں نہ جانے پائیگا بلکہ ان سب سے ان کا انتقام لیا جائیگا اسلیے کہ ایک یہ خون تمام قریش کے خون پر بھاری ہے۔

جوانان بنی ہاشم تلواریں سونت کر آمادہ ہو گئے ہر ایک اپنی ڈیوٹی پر پہنچ گیا اور حضرت ابوطالب نے تلاش شروع کر دی۔ کیا دیکھا کہ ایک مقام پر محمدؐ صحیح و سالم موجود ہیں آپ نے انھیں ساتھ لیا اور قریش سے خطاب کر کے فرمایا "تمھیں خبر ہے کہ اس وقت ہمارا ارادہ کیا تھا۔ یہ کہہ کر اپنے جوانوں کو حکم دیا کہ چمکتی تلواریں سامنے ظاہر کر دیں تاکہ قریش کو بھی اس اہتمام و انصرام کا اندازہ ہو جائے اور انھیں معلوم ہو جائے کہ محمدؐ کی حمایت پر کتنی تلواریں اور کس قدر اسلحے ہیں۔ تلواروں کا چمکنا تھا کہ چہرے اتر گئے۔ ہوائیاں اڑنے لگیں اور ابوجہل تو ہکا بکا رہ گیا۔

پھر آپ نے اعلان کیا اگر آج تم نے محمدؐ کو قتل کر دیا ہوتا تو تم میں سے کوئی ایک بھی باقی نہ رہتا[۱]

اس کے بعد آپ نے وہ اشعار پڑھنا شروع کر دیے جن میں محمدؐ کی عظمت کے ساتھ اپنی وفاداری اور نصرت کا بھی اعلان تھا۔

۱: الحجۃ ص۹۱ الغدیر ج ۷ ص۳۴۹ ۳۵۳ شیخ الابطح ص۲۶ ۲۷ اثبات الوصیۃ ص۹۶ ابوطالب ص۶۷ ۶۸

الا ابلغ قریش حیث حلت | وکل سرائرٍ منها غرور
فانی والصوابح عادیات | وما تتلوا لسفافرة الشہور
لآل محمد راع حفیظ | وود الصدر مِنّی والضمیر
فلست بقاطع رحمی وولدی | ولو جرت مظالمہا الجزور
ایأمر جمعہم ابناء فہر | بقتل محمد؟ والامر زور
فلا وابیک لا ظفرت قریش | ولا امت رشادا اذ تشیر
بنی اخی ونوط القلب منّی | وابیض ماؤہ عذق کثیر
ولیشرب لبعدہ الولدان ریا | واحمد قد تضمنتہ القبور
ایا ابن الانف الف بنی قصی | کان جبینک القمر المنیر[1]

قریش جہاں بھی ہوں انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے سب اسرار محض فریب اور دھوکا ہیں۔

دوڑتے ہوئے گھوڑے اور علماء کے صحیفے گواہ ہیں
کہ میں دل وجان سے آل محمد کا نگراں اور محافظ ہوں
کتنے ہی مظالم کیوں نہ پیش آئیں میں ان سے قطع تعلق نہیں کر سکتا
یہ فہر کی اولاد محمدؐ کے قتل کا ارادہ کر کے بہت برا کر رہی ہے
تمھاری جان کی قسم قریش کامیاب نہ ہوں گے نہ انکا ارادہ کوئی عقلمندی ہے
میرا بھتیجا، میرا رشتۂ حیات اور میرا فیاض وکریم بیٹا وہ ہے
جس کے مرنے کے بعد بھی آئندہ نسلیں اس سے سیراب ہوتی رہیں گی۔
اے قصی کے خاندان کی آبرو اے محمدؐ تیری پیشانی تو چمکتے چاند کی مانند ہے۔

۱: الغدیر ج ۷، صفحہ ۳۵۵ ۔ اعیان الشیعہ ج ۳ صفحہ ۱۱۹

اسی قسم کا ایک واقعہ اور ہے کہ جب حضرت ابوطالب نے اپنے غیظ و غضب کا اظہار کرتے ہوئے تمام قریش کو چیلنج کر دیا تھا وہ وقت وہ تھا جب رسول اکرمؐ نماز میں مشغول تھے۔ عبد و معبود میں راز و نیاز ہو رہے تھے۔ عالمِ بالا کی سیر تھی اور قریش نے یہ طے کیا تھا کہ ان کی نماز میں خلل دیا جائے۔ ان کی عبادت کا مذاق اڑایا جائے ابن زبعری کو اس کام کے لیے منتخب کیا گیا تھا اس نے بخوشی اس خدمت کو قبول کر لیا تھا۔ اور جب رسول اکرمؐ سجدے میں تھے تو اس ملعون نے کافی غلاظت جمع کر کے سر پر ڈال دی تھی۔ ظاہر ہے کہ آپ کے قلب پر اس اذیت کا اثر تمام تکالیف سے زیادہ ہوا ہوگا۔ اس لیے کہ اس میں ایک استہزا و تمسخر کا پہلو بھی تھا۔ لیکن آپ کے پاس سوائے ابوطالب کے تھا کون؟ آئے چچا کے پاس۔ دل مضطرب، آنکھوں میں آنسو، چچا نے جیسے ہی یہ منظر دیکھا رگِ حمیت پھڑکی، تلوار کاندھے پر رکھی، غصے کے عالم میں گھر سے نکلے۔ قوم نے جیسے ہی یہ عالم دیکھا ایک مرتبہ فرار کا ارادہ کیا۔ آپ نے دور ہی سے آواز دی۔ اگر قدم آگے بڑھے تو سر نہیں ہے۔ اکھڑے ہوئے قدم جم گئے، بھاگنے والے بدحواس ہو کر ٹھہر گئے۔ آپ رسول اکرمؐ کو لیے ہوئے قریب پہنچے۔ بیٹا! یہ کس نے کیا ہے؟ حضرت نے ابن زبعری کی طرف اشارہ کیا۔ آپ نے پہلے تو اس کی ناک کو زخمی کیا اور پھر غلاظت منگا کر تمام قوم کے چہروں پر مل دی اور نہایت آرام کے ساتھ رسولؐ سے خطاب کیا۔ کیوں بیٹے خوش ہو گئے؟ ارے تم عبداللہ کے لال، شریف النسب اور عظیم المرتبت ہو، اچھا اے قریش والو! اب اگر کچھ کرنا چاہتے ہو تو اٹھو، میں بھی موجود ہوں اور تم تو مجھے پہچانتے ہی ہو[۱]۔ یہ کہہ کر اشعار شروع کر دیے:

۱: الغدیر ج ۷ ص ۳۵۹، شیخ الابطح ص ۲۸، الحجہ ص ۱۰۲، ۱۰۸ ثمرات الاوراق ج ۲ ص ۱۰۴، ابوطالب ص ۲۰۳، مناقب ص ۳۵

انت النبی محمد	قوم اغر مسوّد
لمسودین اکارم	طابوا وطاب المولد
نعم الارومة اصلها	عمرو الخطیم الاوحد
هشم الربیکة فی الجفان	وعیش مکة انکد
فجرت بذالک سنة	فیها الخبیزة تثرد
ولنا السقایة للحجیج	بها یماث العنجد
والماء زمان وما حوت	عرفاتها والمسجد
أنیّ تضام ولم امت	وانا الشجاع العربد
وبطاح مکة لا یری	فیها نجیع اسود
وبنوا ابیک کانهم	اسد العرین توقد
ولقد عهدتک صادقاً	فی القول لا تتزید
مازلت تنطق بالصواب	وانت طفل امرد[1]

تم نبی محمدؐ ہو، تم بزرگ روشن پیشانی اور سردار ہو

تمہارے بزرگ بھی طیب وطاہر اور باعظمت تھے

اس خاندان کی اصل "حضرت عمرو" یگانۂ روزگار تھے

انھوں نے مکہ کی زبوں حالی میں لوگوں کو روٹیاں توڑ توڑ کر کھلائی تھیں۔

ان کے بعد سے یہ طریقہ سنّتِ مستمرہ بن گیا تھا،

اسی خاندان میں حاجیوں کی وہ سقایت ہے جس میں زمزم کی کشمش ڈالی جاتی ہے

عرفات، مشعر اور منیٰ کے درمیان کی بستیاں اس وقت تک مطمئن ہیں

جب تک مجھ جیسا بہادر و زور آور زندہ ہے

۱: شرح النہج ج ۳ ص ۳۱۵ الحجہ ص ۱۰۳ شیخ الابطح ص ۲۰ ہاشم وامیہ ص ۱۲۳ دیوان ابوطالب ص ۱۲ اعیان الشیعہ ج ۳ ص ۱۲۳ الغدیر ج ۷ ص ۳۳۶۔

اب مکہ کی وادیوں میں سیاہ گھاس نظر نہیں آئے گی ،

اور تمہارے خاندان والے تو شیر بیشۂ شجاعت ہیں۔

میں نے تم کو بہت زیادہ صادق القول پایا ہے۔

آج ہی نہیں بلکہ بچپنے سے تمھیں سچا ہی پایا ہے

حضرت ابوطالب نے اس قصیدہ کے شروع میں نبوت کا وہ کھلا ہوا اعلان کیا ہے جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے بھلا کیا فرق ہے اشھد ان محمدا رسول اللہ میں اور امنت النبی محمدؐ میں ؟!

حقیقت یہی ہے کہ دونوں نبوت کے اعترافات ہیں اور دونوں میں سرمو فرق نہیں ہے۔ لیکن کیا کیا جائے پست اغراض، سیاہ دل اور مُردہ ضمیر کا کہ اس کی منطق، عقل وواقعیت کی منطق سے بالکل الگ ہے۔

آپ نے پہلے حضرت ہاشم کے اس جود وکرم کا تذکرہ کیا جس سے مکّہ کا قحط برطرف ہوا۔ حاجی سیراب ہوئے، زندگی خوشحال ہوئی، دل مطمئن ہوئے پیٹ کو سکون ہوا اور سینوں کی آگ بجھی۔

اس کے بعد بھتیجے کو اطمینان دلاتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ میری زندگی میں کسی اذیت وآزار کا تصور نہیں ہو سکتا، میں کوئی بزدل نہیں ہوں۔ میرے اطراف میں شیران بیشۂ شجاعت موجود ہیں۔

مقطع کلام میں پھر ایمان واعتراف کا اعلان کر دیا تاکہ ابتدا وانتہا کی یکسانیت محفوظ رہے۔ مقطع میں نبی کریمؐ کی اس صداقت کا اعلان ہے جس کا تجربہ حضرت ابوطالب نے ابتدائے عمر سے آج تک کیا ہے اور جس پر انھیں مکمل اعتماد ہے۔

ظاہر ہے جو معمولی معمولی باتوں میں صداقت سے کام لے گا وہ حق کے خلاف نہیں کہہ سکتا۔ یا یوں کہا جائیگا کہ جو دنیا کی مخلوق پر افترا نہیں کریگا وہ خالق عالم پر بھی

بہتان نہیں رکھ سکتا

یہی وہ بات ہے جس کو خلاصۂ ایمان کہا جا سکتا ہے ۔ یعنی محمدؐ وہ امانتدار انسان ہے جس نے الٰہی پیغام میں نہ کوئی خیانت کی ہے اور نہ غلط بیانی یہی اصل ایمان و جوہر عقیدہ ہے ۔

اس قصیدہ کے آخری اشعار میں نبوت کی تصدیق کے ساتھ ساتھ رسول اکرمؐ کی تائید و تشجیع کا عنوان بھی نمایاں طور پر نظر آرہا ہے اس لیے ان پر پھر ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہے ۔ علامہ ابن ابی الحدید ان اشعار سے پہلے دو شعر اور نقل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان اشعار کو حضرت ابوطالب نے رسول اسلام کا دل بڑھانے اور انھیں قوت پہنچانے کے لیے پڑھا تھا ۔

لا یمنعک من حق تقوم بہ　　اید تصول ولی سلق باصوات

فان کفک کفی ان ملیت بہم　　ودون نفسک نفسی فی الملمات

آپ اپنی تبلیغ میں نہ کسی بات کا خیال کریں اور نہ کسی کے ہاتھ کا میں آپ کے ساتھ ہوں اگر فائدہ ہے تو آپ کا اور اگر قربانی کی ضرورت ہے تو میری جان کے لیے ،

اس عظیم فداکاری اور اس انتہائی جود و کرم کا کیا کہنا کہ انسان مصیبت کے اوقات میں جان تک دینے پر آمادہ ہو جائے ۔

یہ یاد رہے کہ حضرت ابوطالب کی نصرت کا تعلق محمدؐ کی ذات سے نہیں تھا بلکہ

۱: الحدید ج ۳ ص۳۱۵ الغدیر ج ۷ ص۳۴۳ الحجۃ ص۷۷ ابوطالب ص۲۳ دیوان ابوطالب اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص۱۵۰

آپ ابتدائے امر سے رسالت کی امداد و حمایت کر رہے تھے۔ اس لیے آپ ہر اس شخص کی امداد کریں گے جو اس رسالت کا اعتراف کرے اور اسے اپنے دل میں جگہ دے۔

چنانچہ آپ کی زندگی کے اوراق پر ایسے عنوان بھی نمایاں ہیں جہاں آپ نے مسلمانوں کی امداد کی ہے اور چاہنے والوں کی جان بچائی ہے۔ جب کفار قریش نے دیکھا کہ عثمان بن مظعون جمحی نے تاریکئ کفر کو ترک کر کے نور ایمان کو اختیار کر لیا ہے اور پیغمبر اکرمؐ کی دعوت پر لبیک کہہ کر اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے ہیں تو انھیں گمراہ کرنے کے لیے طرح طرح کی اذیتیں دینا شروع کر دیں۔ حضرت ابوطالب کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے غصے میں یہ اشعار پڑھے :

امن تذکر دھر غیر مامون — اصبحت مکتئبا تبکی کمحزون

امن تذکر اقوام ذوی سفه — یغشون بالظلم من یدعوا الی الدین

الا ترون اذل الله جمعکم — انا غضبنا لعثمان بن مظعون

ونمنع الضیم من یبغی مضیمتنا — بکل مطرد فی الکف مسنون

ومرهفات کان الملح خالطها — یشفی بها الداء من هام المجانین

حتی تقر رجال لا حلوم لها — بعد الصعوبة بالاسماح واللین

او تؤمنوا بکتاب منزل عجب — علی نبی کموسیٰ او کذی النون[1]

اے عثمان کیا اس ناقابل اعتماد زمانے کے خیالات سے آپ محزون و رنجیدہ ہو گئے ہیں
کیا آپ کو ان احمقوں کا خیال ہے جو ہر دعوت الی الحق والے انسان پر ظلم کرتے ہیں
اے قریش والو! خدا تمھیں ذلیل کرے کیا تمھیں اس کی خبر نہیں کہ ہم عثمان کے ساتھ ہیں

۱: الحدیدی ج ۳ ص ۳۱۳ الحجة ص ۸۵ الغدیر ج ۷ ص ۳۲۵ ہاشم و امیہ ص ۱۲۶ شیخ الابطح ص ۳۰
دیوان ابوطالب ص ۹ اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۲۴۲،

اور ہم ہر پناہ گزین کی کمک کرتے ہیں۔ کبھی چمکتے ہوئے دھاردار نیزوں سے
اور کبھی چمکتی ہوئی نمک آلود تلواروں سے جو ان حماقتوں کا صحیح علاج کر سکیں
اور جن سے یہ تشدد پسند بے عقل لوگ نرمی کی راہ پر آ لگیں۔

اب تم اس کتاب عجیب پر ایمان لے آؤ جو موسیٰ اور ذوالنون جیسے نبی پر نازل ہوئی ہے۔
مجھے کوئی بتائے کہ اس آخری شعر میں "کتاب عجیب" سے کیا مراد ہے جس کا
لانے والا موسیٰ و یونس جیسا نبی ہے کیا یہ قرآن کریم کے علاوہ کوئی اور کتاب ہے۔ کیا
اسے ایمان بالقرآن کے علاوہ کوئی اور نام دے سکتے ہیں؟

یہی نہیں اس شعر سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوطالب سابقہ ادیان پر
ایک مبسوط علم رکھتے تھے اور اسی لیے آپ نے اس کتاب کو عجیب اور اس نبوت کو گزشتہ
نبوتوں کے تسلسل سے تعبیر کیا ہے۔

اسی پر اکتفا نہیں بلکہ کفار قریش کو بھی اسی دعوت کے قبول کرنے پر مجبور کرتے
ہیں اور صاف صاف کہہ دیتے ہیں کہ اب دو ہی راستے ہیں یا ایمان یا تلواریں!

قرآن کو عجیب کہنا کوئی نئی بات نہیں بلکہ اس کی مثال خود قرآن کریم میں مومنین
جنات کی زبانی موجود ہے انا سمعنا قرآناً عجباً یہدی الی الرشد فآمنا بہ۔

وہ مومنین جو قریش کے پنجۂ استبداد میں گرفتار تھے اور طرح طرح کی اذیتیں
برداشت کر رہے تھے ان میں سے ایک ابوسلمیٰ بن عبدالاسد المخزومی بھی تھے ان کی
نظر میں بھی حضرت ابوطالب کے سوا کوئی ایسا نہ تھا جو انھیں قریش کے شدائد و مصائب
سے بچا سکے چنانچہ وہ بھی حضرت ابوطالب ہی کی پناہ میں آ گئے۔

جب بنی مخزوم کو معلوم ہوا کہ حضرت ابوطالب نے ایک مخزومی کو پناہ دے
دی ہے تو وہ ایک وفد لے کر پہنچ گئے اور کہنے لگے اے ابوطالب آپ نے اپنے بھتیجے

کو بچا لیا خیر۔ اب یہ ہمارے قبیلے والے سے کیا تعلق ہے۔ آپ نے فرمایا یہ میرا بھانجا ہے اس نے پناہ مانگی ہے۔ ظاہر ہے کہ بھانجے اور بھتیجے میں کیا فرق ہے!

یہ سننا تھا کہ ایک شور و غوغا برپا ہو گیا۔ ہنگامہ و طوفان کے آثار نمایاں ہو گئے۔ وفد نے انجام کی خرابی پر نظر کی اور فوراً ناکامی کے بعد واپس ہو گیا۔[1] (ابو سلمہ کے بھانجے ہونے کا راز یہ تھا کہ جناب ابوطالب کی مادر گرامی مخزومیہ تھیں۔)

جناب ابوطالب نے اس واقعے میں یہ بھی دیکھا کہ ابولہب نے آپ کی حمایت کی ہے چنانچہ آپ کے دل میں تبلیغی جذبات ابھرنے لگے۔ اور آپ نے چاہا کہ یہ بھی ہمیشہ میری طرح نبوت کی نصرت و امداد کرتا رہے یہ سوچکر چند شعروں میں اسے دعوت توحید دی

وان امراً ابو عتبة عمه ... لفی روضة ما ان یسام المظالما

اقول له واین منه نصیحتی ... ابا معتب! ثبت سوادک قائما

کیف نیتم و بیت اللہ تبری محمداً ... ولما تروا یوما لدی الشعب قائما![2]

سچ یہ ہے کہ جس کا ابو عتبہ جیسا چچا ہو اسے تمام مظالم و مصائب سے مطمئن ہونا چاہیئے مگر افسوس کہ ابولہب میری بات نہیں سنتا، کاش یہ اپنی حیثیت کو قائم رکھتا، ہم نے شعب میں محمدؐ کو تنہا نہیں چھوڑا تو اب کیا چھوڑیں گے؟

حضرت ابوطالب کا جہاد فقط رسولؐ اسلام اور بیکس مسلمانوں ہی سے دفاع ہی میں منحصر نہ تھا۔ بلکہ آپ کے مجاہدات کا ایک پہلو اور بھی ہے جو ان مادی زحمات سے کہیں زیادہ معنویت و منزلیت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ آپ اسلام کے ایک عظیم مبلغ

۱: شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ج ۳ ص ۳۰۶، السیرۃ الہشامیہ ج ۲ ص ۱، السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۲۵۶، اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱

۲: الحدیدی ج ۳ ص ۳۰۶، السیرۃ الہشامیہ ج ۲ ص ۱، الحجہ ص ۱۰، الغدیر ج ۷ ص ۲۹۳، ص ۳۹۴۔

اور پیغمبری مشن کے ایک بڑے کارکن تھے۔

کبھی آپ رسول اکرمؐ کی شخصیت کو اجاگر کرتے تھے کبھی اسلام کی عظمت کو ظاہر کرتے تھے۔ اور کبھی کفار قریش کو اسلام قبول نہ کرنے کے عواقب و نتائج سے ڈرایا کرتے تھے کہ شاید وہ اسی طرح اسلام کے حلقہ بگوش بن جائیں۔

انہی باتوں کو اپنے اشعار میں نظم فرماتے تھے تاکہ آئندہ نسلیں ان سے آشنا رہیں قریش سے مختلف قسم کی اذیتیں، طرح طرح کی صعوبتیں سہنے کے بعد مسلمانوں نے حبشہ کا رخ کیا۔ سردار قافلہ حضرت جعفر ابن ابیطالبؑ تھے۔ جعفر کی ہجرت کے وہ اسباب نہیں تھے جن کی بنا پر عام طور سے ترکِ وطن کیا جاتا ہے۔ ان کی عظمت و اہلیت کیلئے اتنا کافی تھا کہ وہ ابوطالب کے دلبند اور بنی ہاشم کے لال ہیں کس کی مجال تھی کہ انھیں آنکھ بھر کر دیکھ سکتا۔

درحقیقت حضرت جعفرؑ کی ہجرت کا ایک اہم مقصد تھا۔ آپ یہ سوچ رہے تھے کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمان غیر ملک میں جاکر اپنی ثقافت اور اپنا تمدن بھول جائیں۔ لہٰذا ان کے ساتھ ایک ایسے شخص کو ہونا چاہیے جو وقتاً فوقتاً انھیں ان کا پیغام یاد دلاتا رہے۔

خدا برا کرے ذلتِ نفس اور کورئی دل کا کہ قریش نے فوراً عمرو بن عاص اور عمارہ بن ولید کو حبشہ کی طرف روانہ کر دیا تاکہ جس غداری، عیاری اور مکاری سے بھی ممکن ہو سکے قریش کے مقصد کو پورا کریں۔

حضرت جعفر کی بصیرت، دوراندیشی اور سلیم الفکری نے اس سازش کو فوراً تاڑ لیا اور قریش کا تیر انہی کی طرف پلٹا دیا۔

حضرت ابوطالب کو اس سازش کا علم ہوا آپ نے فوراً چند شعر لکھ کر بادشاہ حبشہ نجاشی کے پاس روانہ کئے اور ان میں جعفر کی تعظیم و تکریم کی سفارش کرتے ہوئے عمرو عاص جیسے بے ایمان، مکار اور افترا پرداز لوگوں کی بات نہ سننے کی طرف توجہ دلائی

آپ کے اشعار یہ تھے:

الا لیت شعری کیف فی الناس جعفر	وعمرو واعداء النبی الاقارب
وھل نال احسان النجاشی جعفرا	واصحابہ ام عاق عن ذالک شاغب
تعلیم ابیت اللعن انک ماجد	کریم فلا یشقی علیک المجانب!
تعلم بان اللہ زادک بسطۃ	واسباب خیر کلھا بک لازب

خدا جانے جعفر۔ عمرو اور بدبخت دشمنان نبی کس عالم میں ہیں؟

نہیں معلوم جعفر اور ان کے اصحاب کے ساتھ نجاشی نے اچھا سلوک کیا یا

فریبی بیچ میں حائل ہو گئے۔

اے نجاشی تو بزرگ اور کریم ہے اب یہ بدمعاش تجھے خراب نہ کر دیں۔

تجھے اللہ نے وسعت دی ہے تمام اسباب خیر تیرے پاس موجود ہیں

ابوطالب کے یہ اشعار نجاشی تک پہنچے اور وہ فرط مسرت سے مدہوش ہو گیا اس لیے کہ حضرت ابوطالب سے اس قسم کی تعریف کی کوئی توقع نہیں کی تھی اس نے یہ طے کیا کہ اس احسان کا بدلہ صرف یہی ہے کہ ان قافلے والوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے اور ان کے اعزاز واکرام میں اضافہ کر دیا جائے۔

حضرت ابوطالب کو نجاشی کے اس ردّ عمل کی اطلاع بھی نہ ملی تھی کہ فوراً دین اسلام کا دعوت نامہ نجاشی کے نام روانہ کر دیا۔

أتعلم ملک الحبش ان محمدا	نبی کموسیٰ والمسیح ابن مریم
اتی بالھدیٰ مثل الذی اتیا بہ	فکل بامر اللہ یھدی ویعصم
وانکم تتلونہ فی کتابکم	بصدق حدیث لاحدیث الترجم
فلا تجعلوا للہ ندا واسلموا	فان طریق الحق لیس بمظلم
وانک تاتیک منا عصابۃ	لفضلک الا ارجعوا بالتکرم

بادشاہ حبشہ کیا تجھے خبر نہیں ہے کہ محمدؐ بھی موسیٰؑ و عیسیٰؑ ابن مریم کی طرح نبی ہیں
یہ بھی اللہ کی طرف سے ہادی ہیں اور یوں بھی سارے انبیاء اسی کی طرف سے ہدایت
کرتے ہیں۔

ان کا ذکر تم نے اپنی کتاب میں بھی پڑھا ہے یہ کوئی خیالی بات نہیں ہے۔
خدارا شرک کو چھوڑ کر مسلمان بنو اس لیے کہ راہ حق بالکل واضح ہے۔
اور دیکھو جب ہماری کوئی جماعت تمھارے پاس آئے تو اس کا اکرام ضرور کرنا!

ان اشعار سے صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ حضرت ابوطالبؑ اسلام کے مبلغ اکبر
اور داعیٔ اعظم تھے اسی لیے آپ نے دین اسلام قبول کرنے اور نبی اکرمؐ کی تصدیق کرنے
کے لیے دعوت نامہ بھیج دیا۔ اس کے علاوہ یہ اشعار آپ کے کمال علم و اطلاع پر بھی دلالت
کرتے ہیں کہ آپ نے نبی اکرمؐ کے تذکرہ کا حوالہ دیا آپ کی شریعت کا حضرت عیسیٰؑ و موسیٰؑ
کی شریعت سے موازنہ کیا۔ اور تمام انبیاءؑ کی نبوتوں کی تصدیق کی نجاشی کو اسی کا انجیل کے حوالہ سے
بتایا کہ حضرت مسیح ایک ایسے نبی کی بشارت دینے آئے تھے جس کا نام احمد ہوگا۔

اب اس کے بعد کتنی بڑی سفاہت و حماقت ہے کہ حضرت ابوطالب کو غیر مسلم کہا جائے
وہ انسان جو تمام دنیا کو مسلمان بنائے کفر و جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر نور اسلام میں
لے آئے، باطل کے راستے سے ہٹا کر صراط مستقیم پر لگائے، وہ خود کفر و جہالت کی تاریکیوں
میں رہ جائے۔ (العیاذ باللہ) یہ تو محض جہالت اور خالص گمراہی کی باتیں ہیں۔

حضرت ابوطالب کے اس ایمان محکم اور عقیدۂ راسخہ کے علاوہ معجزات کی تصدیق بھی

۱: الحجۃ ص۱۱۵ بحار ج ۶ ص۱۲۱ ایمان ابیطالب ص۱۸ شیخ الابطح ص۸ مجمع البیان ج ۷ ص۳۷ الحیات ص۲۲
الغدیر ج ۷ ص۳۳۱ اعیان ج ۱۷ ص۱۱۹، (قدرے اختلاف کے ساتھ)

کیا کرتے تھے۔

معجزہ تو ایک ایسی دلیل ہے جس پر ضعیف العقل اور سادہ لوح عوام بھی ایمان لا سکتے ہیں۔ چہ جائیکہ ابوطالب جیسا کامل العقل، راجح الفہم، مدبر و مفکر انسان۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک مرتبہ ابوجہل ایک پتھر لے کر پیغمبر اکرمؐ کے قریب آیا کہ حالت سجدہ میں آپ پر پھینک دے لیکن شانِ خدا کہ وہ پتھر اس کے ہاتھ میں چپک گیا اور مٹھی اس طرح بند ہو گئی جس طرح سوئی پر کسی بخیل کی مٹھی! بلکہ اس سے بھی بدتر۔ اب تو دل پریشان ہو گیا۔ ہمت پست ہو گئی، حواس اڑ گئے، ارادہ متزلزل ہو گیا آنکھوں کے نیچے اندھیرا آ گیا۔ قدم ڈگمگانے لگے اور دماغ معطل ہو گیا۔

حضرت ابوطالب نے صفحۂ تاریخ پر اس عناد و عداوت کے انجام کا مطالعہ کیا اور یہ طے کر لیا کہ اگر قوم کی یہی حالت رہے گی تو ایک دن یہ بھی قوم صالح کی طرح ہلاک و برباد ہو جائیں گے۔ چنانچہ آپ نے قوم کو ان خطرات کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرمایا:

افیقوا بنی عمنا وانتھوا عن الغی فی بعض ذا المنطق[1]

والا فانی اذا اخاف بوائق فی دارکم ستلتقی

تکون لغابرکم عبرۃ ورب المغارب والشرق

کما ذاق من کان قبلکم ثمود وعاد فمن ذا بقی

غداۃ اتتھم بھا صرصر وناقۃ ذی العرش اذ تستقی

فحل علیھم بھا سخطۃ من اللہ فی ضربۃ الازرق

غداۃ یعض بعرقوبھا حسام من الھند ذو رونق

واعجب من ذاک فی امرکم عجائب فی الحجر الملصق

بکف الذی قام فی جنبہ الی الصابر الصادق المتقی

۱۔ الحجۃ ص۲۲ الدرجات ج ۴ ص۱۱۲ الغدیر ج ۷ ص۳۲۶ اعیان ج ۳۹ ص۱۴۲ دیوان ابوطالب ص۹ (قدرے اختلاف کے ساتھ)

فأثبته الله فی کفه علی رغمہم ذالخائن الاحمق

قوم والو! ہوش میں آؤ، اپنی یہ جاہلانہ منطق ترک کردو

ورنہ مجھے تمہارے سروں پہ بلائیں منڈلاتی نظر آتی ہیں

خدارا گزشتہ واقعات سے عبرت حاصل کرو

آخر تم سے پہلے قوم عاد و ثمود پر عذاب نازل ہو چکا ہے اب ان میں کون رہ گیا

اس دن جب تیز و تند ہوائیں چلتی تھیں اور جب ناقہ کی سیرابی کا سوال اٹھا تھا،

تو آخر ان لوگوں پر عذاب الہی نازل ہو گیا تھا،

جب ان لوگوں نے اس ناقہ کے پیر کاٹ ڈالے،

اس سے زیادہ تعجب خیز یہ ہے کہ پتھر ہاتھ میں چپک کر رہ گیا۔

اس کے ہاتھ میں جو ایک صابر، صادق، متقی انسان کے پہلو میں اسے مارنے کیلئے کھڑا ہوا تھا،

اس خائن و احمق کے علی الرغم اللہ نے اسے اسی کے ہاتھ میں چسپاں کر دیا،

اس قصیدہ میں حق و صداقت کی ترجمانی کے علاوہ ایک شفقت و رحمت کا انداز بھی نظر آتا ہے، گویا آپ چاہتے ہیں کہ قوم اپنی گمراہیوں سے نکل آئے اور عذاب میں مبتلا نہ ہو اور یہ وہ انسانی ہمدردی ہے جو ہر ایک کے دل میں نہیں ہوتی۔ آپ اپنے کلام کو دلنشین بنانے کیلئے قوم صالح کی مثال دیکر بتاتے ہیں کہ نبی کی مخالفت کرنے سے سب کے سب تباہ ہو گئے۔ اب اگر یہ بھی ایسا کریں گے تو ان کا بھی یہی انجام ہوگا اس لیے کہ اللہ نے نبی کا معجزہ ظاہر کر دیا ہے اور احمق کے ہاتھ میں پتھر چپک چکا ہے

حضرت ابوطالب کی شان تحفظ دعوت اسلام کا انتشار، معاشرہ کے بستے کا حلقہ بگوش اسلام ہو جانا، مسلمانوں کا جان و مال کی قربانی کیلئے آمادہ ہونا، تحفظ دین کے لیے مختلف اذیتیں طرح طرح کی مشقتیں اور رنگ برنگ کے زحمات قبول کرنے پر تیار رہنا یہی وہ

باتیں تھیں جنھوں نے مشرکین کی نیند حرام کر دی تھی۔

مسلمانوں کا یہ عالم تھا کہ نعمت کو رنج و الم پر، عزت پر ذلت و خواری کو اور سایہ پر تمازت آفتاب کو ترجیح دے رہے تھے۔ کوئی کلمہ ایسا زبان پر نہیں آتا تھا جس سے مشرکین کی ڈھارس ہو۔ وطن ترک ہو رہے تھے مکان چھوڑے جا رہے تھے احباب کا فراق گوارا کیا جا رہا تھا صرف اس لیے کہ دین سالم رہ جائے۔

ظاہر ہے کہ ان حالات میں قریش کی کیا کیفیت ہو گی۔ ساری فکریں، تمام تدبیریں اور کل حیلے اسی بات میں صرف ہو رہے تھے کہ اسلام کی بساط لپیٹ دی جائے اس کی آواز دبا دی جائے اور دلوں سے اس کے جذبات نکال دیے جائیں لیکن یہ سب ہو تو کیسے؟ اب تک کی تدبیریں، اب تک کے حیلے بیکار ہو چکے ہیں اب وہ کون سی صورت ایسی ہو جس سے خود ساختہ خداؤں کی مخالفت کا سلسلہ ختم کیا جائے کونسی تدبیر ایسی ہو جس سے اپنے دل کی پیاس بجھائی جا سکے مصیبت بالائے مصیبت یہ ہے کہ اسلام کے انتشار کے ساتھ ہی ساتھ اپنی قدیم ریاست و قیادت بھی ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے جس قدر اس شعلے کو دبانا چاہتے ہیں لپٹ بڑھتی جا رہی ہے جتنا اس کی آواز کو خاموش کرنا چاہتے ہیں گونج میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے جس قدر بھی اس شجرۂ طیبہ کو خزاں رسیدہ بنانا چاہتے ہیں برگ و بار بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔

حالت یہ ہو گئی ہے کہ اگر ایک ہاتھ بڑھ جائے تو ہزار ہاتھ مقابلے کے لیے اٹھ جائیں گے۔ اگر ایک خون بہہ جائے تو اس کے ہر قطرہ سے ہزار تلواریں پیدا ہو جائیں گی ایک اقدام ہو جائے تو سینکڑوں جذبات برانگیختہ ہو جائیں گے۔

خونریزی اس لیے مناسب نہیں ہے کہ نبی کے چاہنے والے اس داستان کو اور بھی رنگین بنا دیں گے۔ اسلام کو مظلومی کے نام پر پروان چڑھائیں گے، موقف سخت، معاملہ نازک اور حالات بہت زیادہ خطرناک ہو چکے ہیں آخر کیا جائے؟!

ابھی یہ فکر باقی تھی کہ ایک ابلیس کا مشورہ آگیا۔ ان مسلمانوں کو اقتصادی مار ماری جائے، ان کی زندگی تلخ کر دی جائے، ان کا دانہ پانی بند کر دیا جائے یہی وہ سرد جنگ ہوگی جس میں جان و مال کی تباہی نہ ہوگی۔ اور مسلمان مشکلات سے گھبرا کر یا اسلام ترک کر دیں گے یا کم از کم محمدؐ کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ اور اس طرح محمدؐ کی جان ایک منہ کا نوالہ بن جائیگی۔

یہ طے ہوگیا عہد نامہ لکھ دیا گیا۔ دفعات یہ ہیں کہ بنی ہاشم و مطلب کے مقابلے میں سب متحد رہیں، ان سے صلح نہ کریں، ان سے شادی بیاہ نہ کریں، ان سے خرید و فروخت نہ کریں۔ ان پر کسی قسم کی رحمدلی اور سہولت کا اظہار نہ ہونے دیں۔ یہاں تک کہ محمدؐ ہمارے حوالے کر دیے جائیں اور ہمارا منصوبہ کامیاب ہو جائے۔

کاغذ مرتب ہوگیا مہر لگائی گئی اور اس کا ایک نسخہ خانۂ کعبہ میں معلق کر دیا گیا۔ (یہ واقعہ بعثت کے سات سال بعد ماہ محرم میں پیش آیا)

ابو طالب کے کان میں یہ آواز پہنچی انھیں قریش کی اس پستی، سفالت اور وحشیت و بربریت کا علم ہوا اور زبان پر اشعار جاری ہونے لگے۔ آپ نے چاہا کہ قریش کو ان کے اس عمل کا انجام بتا دیں اور انھیں ان آنے والے واقعات سے مطلع کر دیں جن سے وہ بالکل بے خبر ہیں۔ آپ نے ایک مکمل قصیدہ انشاء کیا جس کے بعض اشعار یہ ہیں:

یرجون منا خطة دون نیلها	ضراب وطعن بالوشیج المقوم
یرجون ان نسخی بقتل محمد	ولم تختضب سمر العوالی من الدم
کذبتم وبیت اللہ حتی تفلقوا	جماجم تلقی بالحطیم وزمزم
وتقطع ارحام وتنسی حلیلة	حلیلا ویغشی محرم بعد محرم
علی ما مضی من مقتکم وعقوقکم	وغشیانکم فی امرکم کل مأثم
وظلم نبی جاء یدعو الی الهدی	وامر اتی من عند ذی العرش قیم

فلا تحسبونا مسلمیه فمثله   اذا کان فی قوم فلیس بمسلم[1]

قریش کا مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ شمشیر و سناں
درمیان میں نہ آجائیں۔

یہ چاہتے ہیں کہ ہم محمدؐ کو ان کے حوالے کر دیں حالانکہ ابھی نیزے خون سے رنگین
نہیں ہوئے ہیں۔ خدا کے گھر کی قسم یہ خیال غلط ہے جبتک کہ سر شگافتہ نہ ہو جائیں
اور قرابت کا خیال ختم نہ ہو جائے اور عورتوں اور شوہروں میں جدائی نہ ہو جائے
اس وقت تک یہ کچھ نہیں ہوگا۔

یہ سب کیوں ہوگا ان عداوتوں، نافرمانیوں اور مکاریوں کی بنا پر
جن سے صاحب ہدایت، رسول خدا، انسان پر ظلم کیا گیا ہے

یاد رکھو ہم محمدؐ کو تمھارے حوالے نہیں کریں گے بھلا کوئی قوم ایسے انسان کو
بھی موت کے منہ میں دے سکتی ہے؟

اس قصیدہ میں حضرت ابوطالب نے جس تحدّی اور چیلنج سے کام لیا ہے وہ کسی طرح
محتاجِ بیان نہیں۔

آخری دو شعروں کے پہلے شعر میں ایمان کی روشنی اور عقیدہ کی ضوباری ہے۔ محمدؐ نبی
ہیں، ان کی دعوت ہدایت ہے اس کا حکم قیم ہے اور مستحکم۔ ان کا بھیجنے والا صاحب عرش ہے
اور دوسرے شعر میں دفاعی قوت کا مظاہرہ، حفاظتی تدابیر کی فراوانی ہے جس قوم
میں محمدؐ جیسا انسان موجود ہو وہ کیونکر اس عزّت و شرف سے دستبردار ہو سکتی ہے!
مسلمانو! سچ بتاؤ اگر ان عقائد کے بعد بھی ابوطالب کافر ہیں تو اسلام کے معنی کیا ہیں؟

۱: النہج الحدیدی ج ۳ ص ۳۱۲ الحجۃ ص ۳۷ الغدیر ج ۷ ص ۳۲۳ ایمان ابیطالب ص ۱۳ ہاشم و امیہ
ص ۱۷۱ اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۴۱ ۔

کیا تمھارے اسلام میں ان عقائد کے علاوہ کوئی اور شے بھی داخل ہے۔ کیا اعتراف رسالت کا اس سے بہتر بھی کوئی عنوان ہو سکتا ہے؟

اس کے بعد حضرت ابوطالب نے وہ تدبیریں شروع کر دیں جن سے مسلمانوں کی جان بچائی جا سکے۔ اور کچھ سوچ کر جوانان بنی ہاشم و مطلب کو بلایا اور مشورہ دیا کہ سب شعب عبدالمطلب میں پناہ لیں[1]۔ اور قریش کے شر سے اپنی حفاظت کریں سب نے بسر و چشم اس مشورہ کو قبول کیا اور شعب کی طرف روانہ ہو گئے صرف ایک بدبخت ابولہب رہ گیا جس نے قریش کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔

دن گزرتے رہے اب نہ اُمید کی کوئی کرن نظر آتی ہے اور نہ آسائش کی کوئی شعاع، تلخیاں ہیں، شدائد ہیں، مصائب ہیں، بھوک ہلاک کرنے پر آمادہ ہے فلاکت، چہرہ سے جھلک رہی ہے، قریش کسی رحم پر آمادہ نہیں اور نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ درختوں کے پتوں پر گزارہ ہو رہا ہے[2]۔

ان تمام شدائد و مصائب کے علاوہ حضرت ابوطالب کی شب بیداری کا عالم یہ ہے کہ تمام رات جاگ کر گزارتے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ بھتیجے کے خلاف کوئی سازش ہو گئی ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کوئی بدبخت، بدطینت انسان اس سراج منیر کو خاموش کر دے ادھر رات ہوئی تاریکی چھائی سونے کا وقت آیا ادھر محافظ شب بیدار اٹھا بھتیجے کو ایک بستر پر لٹایا بیٹے کو دوسرے بستر پر، تھوڑی رات گزری بستر تبدیل کیا اور بیٹے کو

۱: معجم البلدان ج ۵ ص ۲۷ (ج ۳ ص ۳۴۷)

۲: الطبری ج ۲ ص ۳۴۷ کامل ج ۲ ص ۵۹ السیرۃ الہشامیہ ج ۱ ص ۳۷۵ النبویہ ج ۱ ص ۲۷۳ الحلبیہ ج ۱ ص ۳۳۷ الحدیدی ج ۳ ص ۳۰۶ الغدیر ج ۷ ص ۳۶۳

بھتیجے کی جگہ پر لٹا دیا۔ تاکہ اگر کوئی حملہ ہو جائے دشمن شبخون مارے تو بیٹا قربان ہو جائے اور صاحبِ رسالت بچ جائے۔

دشمنوں سے حضرت ابوطالب کا یہ جہاد مسلسل اور یہ دفاع پیہم نہ دیکھا گیا تو آخر کار یہ افسانہ تراش لیا کہ یہ تمام قربانیاں قرابت کی بنا پر تھیں۔

میں پوچھتا ہوں کہ کیا ابوطالب کا رشتہ محمدؐ سے علیؑ کی نسبت زیادہ قوی و قریب تھا کہ علیؑ کو محمدؐ کا فدیہ بنا رہے تھے؟

کیا دنیائے عقل و ہوش کی نظر میں دین کا رشتہ قرابت سے زیادہ مضبوط اور مستحکم نہیں ہوتا کیا مذہب کی خاطر اعزا و اقارب کو ترک نہیں کیا جاتا۔ اگر ایسا ہے تو پھر حضرت ابوطالبؑ نے محمدؐ کے رشتے کا خیال و لحاظ کیوں کیا اور انھیں کفار کے حوالے کیوں نہ کر دیا۔

کیا ہمارے سامنے ابولہب کی مثال نہیں ہے جس نے اپنے عقیدہ کے تحفظ کے سامنے محمدؐ کی قرابتداری کا کوئی پاس و لحاظ نہیں کیا۔

کیا تاریخ میں ان مسلمانوں کا تذکرہ نہیں ہے جنھوں نے صرف اختلافِ مذہب کی بنا پر اپنے باپ یا بیٹے کو تہ تیغ کرنے کا قصد کر لیا تھا۔

ایک رات کا واقعہ ہے کہ حضرت ابوطالبؑ نے حضرت علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر حضرت محمدؐ کے بستر پر لٹانا چاہا تو آپ نے عرض کی بابا اب تو میں قتل ہو جاؤں گا حضرت ابوطالب نے دلاسہ دیا اور کہا بیٹا موت تو انسان کی ترقی کا پہلا زینہ ہے میں نے تمھیں محمدؐ کا فدیہ قرار دیا ہے لہٰذا صبر کرو:

اصبرن یا بنی! فاصبر احجی ۔۔۔ کل حی مصیرہ لشعوب

فقد بذلناک والبلاء شدید لفداء الحبیب وابن الحبیب
لفداء الاغر ذی الحسب الثاقب والباع والکریم النجیب
ان تصبک المنون فالنبل تبری فمصیب منها وغیر مصیب
کل حی وان تملی بعمر آخذ من مذاقها بنصیب

بیٹا! صبر کرو، صبر زیادہ مناسب ہے اور مرنا تو سب ہی کو ہے۔
میں نے تم کو سختیوں میں اپنے محبوب بھائی کے لال کا فدیہ قرار دیا ہے
یہ فرزند روشن پیشانی، صاحب حسب اور کریم و نجیب ہے
اگر تمہیں موت بھی آجائے تو کیا؟ تیر دل کا خاصہ ہی یہ ہے کہ بعض خطا کر جاتے ہیں
اور بعض نشانے پر بیٹھ جاتے ہیں۔
انسان کتنی ہی مدت کیوں نہ زندہ رہے آخر موت کا مزا چکھنا ہے۔
یہ سننا تھا کہ حضرت علیؑ کی رگِ شجاعت پھڑک اٹھی۔ عرض کی بابا جان:

اتامرنی بالصبر فی نصر احمد ووالله ما قلت الذی قلت جازعا
ولکننی احببت ان تری نصرتی وتعلم انی لم ازل لک طائعا
ساسعی لوجه الله فی نصر احمد نبی الهدی المحمود طفلا ویافعا

آپ مجھے محمدؐ کی نصرت میں صبر کا حکم دیتے ہیں میں نے یہ بات خوف سے تھوڑی کہی تھی
میں نے تو اپنی نصرت کا اظہار کیا تھا تاکہ آپ مجھے اپنا فرمانبردار خیال کریں۔
میں رسول خدا محمد مصطفےؐ کی نصرت میں برابر سعی کرتا رہوں گا اس لیے ان کا ماضی
حال سب روشن اور پسندیدہ ہے۔

۱: شرح النہج ج ۳ ص ۳۱۰ مناقب ج ۱ ص ۶۴ الحجۃ ص ۸۰ الغدیر ج ۷ ص ۳۵۹ اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۲۱
السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۲۶۶ الحلبیہ ج ۱ ص ۲۳۸ ابوطالب ص ۳۲ دیوان ابوطالب ص ۹ (قدرے اختلاف کے ساتھ)

شعب ابوطالب میں جناب ابوطالب کی زندگی کا ایک مزید مشغلہ یہ بھی تھا کہ جب جذبات برانگیختہ ہو جاتے تھے، غم و الم فکری ہیجان پیدا کرتے تھے تو کچھ غم انگیز اور ولولہ خیز قسم کے اشعار نظم فرمایا کرتے تھے:

الا ابلغا عنی علی ذات بینھا — لویا وخصا من لوی بن کعب

الم تعلموا انا وجدنا محمدا — نبیا کموسی خط فی اول الکتب

وان علیہ فی العباد محبۃ — ولا حیف فی من خصہ اللہ بالحب

وان الذی رقشتم فی کتابکم — یکون لکم یوما کراغیۃ السقب

افیقوا افیقوا قبل ان تحفر الزبی — ویصبح من لم یجن ذنبا کذی ذنب

ولا تتبعوا امر الغواۃ وتقطعوا — اواصرنا بعد المودۃ والقرب

وتستجلبوا حربا عوانا وربما — امر علی من ذاقہ حلب الحرب

فلسنا وبیت اللہ نسلم احمداً — لعزاء من عض الزمان ولا کرب

ولما تبن منا ومنکم سوالف — وایدٍ اترت بالمھندۃ الشھب

بمعترک ضنک تری کسر القنا — بہ والضباع العرج تعکف کالشرب

کأن مجال الخیل فی حجراتہ — ومعمعۃ الابطال معرکۃ الحرب

الیس ابونا ہاشم شد ازرہ — واوصی بنیہ بالطعان وبالضرب

ولسنا نمل العرب حتی تملنا — ولا نشتکی مما ینوب من النکب

ولکننا اہل الحفائظ والنھی — اذا طار ارواح الکماۃ من الرعب[1]

۱: النہج الحدیدی ج ۳ ص ۳۱۳ السیرۃ الشامیہ ج ۱ ص ۳۷۴ الحجۃ ص ۲۹۰ ہاشم و امیہ ص ۱۳۳ ایمان ابی طالب ص ۱۵
مناقب ج ۱ ص ۶۱ شیخ الابطح ص ۳۰ الغدیر ج ۷ ص ۳۳۳ اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۴۱–۱۴۵
(سب قدرے اختلاف کے ساتھ)

(ارے میرا یہ پیغام لوی اور بالخصوص بنی کعب تک پہنچا دو۔

کیا تمھیں نہیں معلوم کہ محمدؐ بھی موسیٰ کی طرح نبی ہیں اور ان کا ذکر سالقہ کتب میں موجود ہے

ان کی محبت لوگوں کے دل میں ہے اور یہ اللہ کا عطیہ ہے اسمیں کیا جائے دم زدن ہے۔

یہ جو تم نے معاہدہ لکھا ہے یہ ایک دن سخت مصیبت بن جائے گا۔

ہوش میں آؤ ہوش میں آؤ ایسا نہ ہو کہ گنہگاروں کے ساتھ بیگناہ بھی پس جائیں۔

ان گمراہوں کے چکر میں نہ آؤ اور اپنی محبت اور قرابتداری کو قطع نہ کرو۔

دیکھو مسلسل جنگ کا انتظام نہ کرو اس لیے کہ جنگ کا مزا بہت تلخ ہوتا ہے۔

خدا کے گھر کی قسم ہم محمدؐ کو زمانہ کے ہاتھوں نہیں دیں گے

ابھی نہ تو گردنیں کٹی ہیں نہ چمکتی تلواروں کے اٹھانے والے ہاتھ اٹھے ہیں

ابھی نہ گھمسان کی جنگ ہوئی ہے اور نہ بجوؤں نے مقتولین کی لاشوں پر اجتماع کیا ہے

ایسا معرکہ جسمیں گھوڑوں کی دوڑ ہو اور بہادروں کا شور وغوغا

کیا ہمارے بزرگ جناب ہاشم نے اس کی تائید نہیں کی ہے اور کیا انھوں نے

اپنی اولاد کو حرب وضرب کی وصیت نہیں کی ہے ؟

یاد رکھو ہم نہ تو جنگ کرنے سے خستہ ہوتے ہیں اور نہ زمانہ کے مشکلات

کی شکایت کرتے ہیں۔

ہماری فکر اس وقت بھی کام کرتی ہے جب پہلوانوں کے ہوش اڑے ہوتے

ہوتے ہیں۔)

ہمارے مدعا کے اثبات کے لیے اس قصیدہ کے ابتدائی اشعار بہت کافی ہیں جن

سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت ابوطالب کو شریعت محمدیہ سے پہلے کی شریعتوں پر بھی مکمل

عبور حاصل تھا اور اسی لیے آپ نے رسول اکرمؐ کے کتب سابقہ میں تذکرہ کا حوالہ دیا ہے

اس قصیدہ میں اس قسم کے مختلف نکات پائے جاتے ہیں جن سے آپ کے کامل

ایمان اور راسخ عقیدہ پر روشنی پڑتی ہے لیکن ہمارا مقصد ان تمام نکات وجہات کا تذکرہ نہیں ہے۔ ہمارا دل یہ چاہتا ہے کہ اس مقام پر آپ کے ایک دوسرے عقیدہ کا اقتباس پیش کریں جو بظاہر اسی محاصرہ کے دوران لکھا گیا ہے:

ألم تعلموا أن القطيعة مأثم ... وأمر بلاء قاتم غير حازم
وأن سبيل الرشد يعلم في غد ... وأن نعيم الدهر ليس بدائم
فلا تسفهن أحلامكم في محمد ... ولا تتبعوا أمر الغواة الأشائم
تمنيتم أن تقتلوه؟ وإنما ... أمانيكم هذي كأحلام نائم
وإنكم والله! لا تقتلونه ... ولما تروا قطف اللحى والغلاصم

زعمتم بأنا مسلمون محمداً ... ولما نقاذف دونه ونزاحم
من القوم مفضال أبيّ على العدى ... تمكن في الفرعين من آل هاشم
أمين حبيب في العباد مسوم ... بخاتم رب قاهر في الخواتم
يرى الناس برهاناً عليه وهيبة ... وما جاهل في قومه مثل عالم
نبي أتاه الوحي من عند ربه ... ومن قال: لا، يقرع بها سن نادم[1]

کیا تمھیں خبر نہیں کہ یہ بائیکاٹ غیر عاقلانہ اور ایک اچھی خاصی مصیبت ہے
کیا تمھیں نہیں معلوم کہ کل سیدھا راستہ معلوم ہو جائیگا اسلیے کہ دنیا کو بقا نہیں ہے،
دیکھو! محمدؐ کے بارے میں بیوقوفی نہ کرو اور ان منحوس گمراہوں کا ساتھ چھوڑ دو
تمھاری یہ تمنا کہ محمدؐ کو قتل کر دیں ایک خوابیدہ انسان کے خواب سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی

---

(۱) الحدید ج ۳ ص ۳۱۲، الحجۃ ص ۲۳۸، شیخ الابطح ص ۳۲، الغدیر ج ۷ ص ۳۳۲، ایمان ابی طالب ص ۱۴۰، اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۴۱۔

خدا کی قسم محمدؐ اس وقت تک قتل نہیں ہو سکتے جب تک کہ سر اڑتے ہوتے نظر نہ آئیں
تمھارا خیال ہے کہ ہم بغیر کسی جنگ وجدال کے محمدؐ کو تمھارے حوالے کر دینگے
یہ غلط ہے۔ محمدؐ حق پرست، صادق القول اور بنی ہاشم کا نجیب الطرفین انسان ہے
یہ امین ہے محبوب خلق ہے، اللہ کی طرف سے مہر نبوت کا حامل ہے۔
یہ وہ باہیبت انسان ہے جس کی صداقت کا برہان واضح ہے اور ظاہر ہے
کہ جاہل و عالم برابر نہیں ہوتے۔
یہ وہی نبی ہے جس کے پاس وحی آتی ہے آج جو اس کا انکار کریگا اسے ندامت
کا منہ دیکھنا پڑے گا۔

اس کلام میں پہلے آپ نے اس بائیکاٹ کے انجامی صورت حال سے آگاہ کیا اور پھر اس کے بعد ان تمام نتائج کو واضح کر دیا جو اس قطع تعلق پر مترتب ہونیوالے تھے۔

"ہدایت کا راستہ واضح ہے، اس کے ثمرات کل روز حساب معلوم ہونگے
دُنیا کی نعمتیں فانی ہیں ان کیلئے بقاء، دوام نہیں۔ زندگی کا راستہ کتنا ہی طولانی
کیوں نہو آخرکار ایک دن اپنی آخری منزل تک پہنچتا ہے لہٰذا ان لوگوں کو
جہالت و ضلالت سے باز آجانا اور ہدایت کے راستے پر گامزن ہوجانا چاہئے"

درمیان کلام میں آپ نے رسول کے بارے میں یہ اعلان کیا کہ وہ اس وقت تک تمھارے سپرد نہیں ہو سکتے جب تک کہ سر نہ اڑ جائیں، خون نہ بہہ جائیں اور ایک قتل گاہ تشکیل نہ پا جائے۔ یہ انسان کریم، نجیب، صادق اور شریف ہے۔

اور آخر میں اپنی ذاتی رائے کا بھی اظہار کر دیا کہ یہ اللہ کی طرف سے فرستادہ رسول ہیں۔ اگر کوئی آج ان کی رسالت کا انکار کر دے گا تو قیامت کے دن پشیمان ہوگا وہ ایک ایسا دن ہوگا جب ندامت کا کوئی حربہ کارگر نہ ہوگا۔

مسلمانو! کیا یہ اقرار نہیں ہے؟ کیا ایمان و تسلیم و اعتراف کا کوئی اور مفہوم بھی ہے؟

کیا محمدؐ رسول اللہ اور محمدؐ نبی یا تیہ الوحی من عند ربہ میں کوئی فرق ہے
کہ پہلے کلمہ کا قائل مسلمان ہوا اور دوسرے کا مشرک ؟ خدایا گواہ رہنا کہ یہ صرف جہالت
ضلالت اور نفسانیت ہے ۔

شعب ہی کے قصائد میں یہ اشعار بھی ملتے ہیں جن میں آپ نے قریش کو اس
بے رحمی، فرقہ پرداری اور تفرقہ اندازی کے انجام سے آگاہ کیا ہے اور انھیں ان کے
پست اغراض اور احمقانہ خواہشات پر تنبیہہ کی ہے ۔

جزی اللہ عنا عبد شمس و نوفلا و تیما و مخزوما عقوقاً و مأثما

تفریقہم من بعد ود و الفۃ جماعتنا کیما ینالوا المحارما

کذبتم و بیت اللہ نبزی محمداً و لی تروبوماً لدی الشعب قائما

خدا ہماری طرف سے عبدالشمس، نوفل، تیم اور مخزوم کو اس نافرمانی کی سزا دے
ان لوگوں نے ہماری اچھی خاصی جماعت کو اپنے مقصد کیلئے متفرق کر دیا ہے
تمھارا خیال غلط ہے کہ ہم محمدؐ کو تنہا چھوڑ دیں گے ۔ ہم نے تو شعب میں
انھیں اکیلے نہیں چھوڑا ۔

گردش زمانہ کو تین سال گزر گئے ۔ ہاشمیین اذیتوں پر اذیتیں اور تکلیفوں پر
تکلیفیں برداشت کر رہے ہیں حضرت ابوطالبؑ کمال حزن و الم کا علاج اپنے دلسوز
اشعار سے کر رہے ہیں ۔ ایک دن جبریل امین رسول اکرمؐ کی خدمت میں آ کر یہ خوشخبری
سناتے ہیں کہ قریش کے عہدنامہ کو دیمک چاٹ گئی ہے اور اب اس میں صرف اللہ کا
نام باقی رہ گیا ہے ۔ رسول اکرمؐ یہ خبر مسرت اثر اپنے چچا کو سناتے ہیں حضرت ابوطالبؑ
کے چہرے پر سرخی دوڑنے لگتی ہے ، دل مطمئن ہو جاتا ہے ۔ قلق و اضطراب اپنی بساط

سمٹنے لگتے ہیں۔ ایک مرتبہ کمال اطمینان کا جذبہ ابھرتا ہے اور پوچھتے ہیں بیٹا کیا یہ خدائی خبر ہے؟ عرض کی جی ہاں۔ فرمایا سچ ہے تو نے تو آج تک کوئی غلط بات کہی ہی نہیں یہ کہہ کر حضرت ابوطالب ہاشمیین کے ایک جھرمٹ میں شعب سے باہر نکلے، مسجد حرام کے باہر پہنچے۔ قریش نے خیال کیا کہ اب اذیتوں سے عاجز آکر محمدؐ کو حوالے کرنے آئے ہیں سب بڑھے۔ حضرت ابوطالب نے نہایت ہی پرسکون لہجے میں آواز دی۔

اے قریش والو! اب تو عہدنامہ سے بھی زیادہ باتیں ہونے لگی ہیں۔ اچھا اب اسے لے آؤ شاید صلح کی کوئی صورت نکل آئے!

کیا کہنا اس حسن تدبیر کا۔ آپ نے سوچا کہ اگر اصل واقعہ کی اطلاع ابھی دے دی جائیگی تو کاغذ کو وہیں کھول کر دیکھ لیں گے اور سامنے لانے سے انکار کر دیں گے لہٰذا مطلب کو مبہم طریقے سے بیان کیا۔ لوگ خوشی خوشی دستاویز لے آئے۔ انھیں یہ خبر ہی نہیں تھی کہ اپنے دام میں آپ ہی اسیر ہو گئے ہیں اور اپنی ہلاکت خود ہی بلا کر لائے ہیں۔ ابھی تک یہی حسن ظن ہے کہ ابوطالبؑ محمدؐ کو ہمارے سپرد کر دیں گے اور ہم آج تک کا انتقام لے لیں گے۔

ایک مرتبہ حضرت ابوطالبؑ کی یہ آواز کان میں آئی۔ اب وہ وقت آگیا کہ تم اپنے اقدامات سے باز آجاؤ۔

یہ اُس وقت ہوا جب دستاویز سامنے آگئی اور مُہر توڑنے کا انتظام شروع ہوا۔ سکون و اطمینان کا عادی، عقیدہ و ایمان کا مجاہد، مستقبل کا بصیر، نبوت کا معتقد صداقت کا معترف الشان نہایت ہی پُروقار انداز میں فرماتا ہے:

"میں تمھارے درمیان انصاف کیلئے آیا ہوں میرے بھتیجے نے خبر دی ہے کہ اللہ نے تمھاری دستاویز پر دیمک کو مسلط کر دیا ہے اور اس نے نام خدا کے سوا سب صاف کر دیا ہے۔ یہ جھوٹ کا خوگر نہیں ہے لہٰذا اگر اس

کا کلام صحیح ہے تو اب ہوش میں آ جاؤ! جب تک ایک ہاشمی بھی باقی ہے
ہم اسے تمھارے حوالے نہیں کریں گے۔ ہاں اگر یہ غلط کہتا ہے تو یہ
تمھارے حوالے ہے چاہے قتل کرو یا زندہ رکھو!

معاملہ طے ہو گیا، صحیفہ کھولا گیا، برہان واضح، دلیل روشن اور مطالب صاف ہو چکے تھے۔ لیکن خدا بُرا کرے عناد و عداوت کا، کہنے لگے یہ تمھارے بھتیجے کا جادو ہے!

حضرت ابوطالبؑ نے دیکھا کہ موقع غنیمت ہے۔ محمدؐ کی صداقت ظاہر ہو چکی ہے اب بات کہی جا سکتی ہے۔ ایک مرتبہ بگڑ کر بولے آخر ہم کس بات پر محصور ہیں۔ اب مطلب بالکل صاف ہو چکا ہے اب تو تم سے قطع تعلق ہونا چاہیے۔ یہ کہہ کر کعبہ کے پردہ کو تھاما اور دعا کیلئے ہاتھ بلند کر دیے۔ خدایا ہمیں غلبہ عنایت کر، ان لوگوں نے ہم سے قطع رحم کر لیا ہے۔ ہمارے لیے حرام کو حلال کر لیا ہے اب تُو ہماری نصرت کر۔
یہ سُننا تھا کہ قریش کی ایک جماعت دستاویز کی مخالفت پر آمادہ ہو گئی حصار ٹوٹا، زندگی پلٹی اور بھوک اور پیاس کا دور گزر گیا![1]

حقیقت امر یہ ہے کہ اس مقام پر حضرت ابوطالبؑ کے کلام کا ہر فقرہ ایمانِ کامل، عقیدۂ راسخہ اور اطمینانِ مستقل کی دلیل ہے۔ رسول اکرمؐ دیمک کے تسلط کی خبر دیتے ہیں اور آپ فوراً سوال کرتے ہیں کیا وحی نازل ہوئی ہے؟
یہ سوال کیوں؟ تاکہ ایمان استدلالی ہو، تقلید پر اس کا دارومدار نہ ہو یہی وہ ایمان ہے

۱: السیرۃ النبویہ ص ۲۷۰، الحلبیہ ص ۳۸۱، الشامیہ ج ۲ ص ۱۶۷، کامل ج ۲ ص ۳۵، الحجۃ ص ۲۱، الغدیر ج ۷ ص ۳۶۲، بحار الانوار ج ۶ ص ۲۲۵ / ۵۲۳، حلبی بر حاشیہ السیرۃ ج ۳ ص ۹۴، اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۳۱-۱۳۲۔

جس کا تذکرہ حضرت ابراہیمؑ کے قصے میں ملتا ہے أولم تؤمن قال بلی ولکن لیطمئن قلبی۔

یہی وجہ تھی کہ ادھر رسول اکرمؐ کا جواب تمام ہوا اور ادھر حضرت ابوطالبؑ نے اپنی تصدیق اور اپنے ایمانِ کامل کا اعلان کر دیا!

یہی ایمان وعقیدہ تھا جس نے قریش سے اتنے سخت مقابلے پر آمادہ کر دیا کہ اب محمدؐ کو سپرد کر دینے پر بھی تیار ہو گئے۔ حالانکہ زندگی بھر اس مطالبے کی مخالفت کرتے چلے آئے ہیں اور یہ ساری زحمتیں اسی مخالفت کے نتیجہ میں برداشت کرتے رہے ہیں۔

اگر ہم یہ تسلیم بھی کر لیں کہ حضرت ابوطالبؑ کو معاذ اللہ رسولِ اکرمؐ کی خبر پر اعتماد نہ تھا تو کیا اس واضح معجزہ دیکھنے کے بعد بھی اطمینان پیدا نہ ہو گا؟ استغفر اللہ!

حقیقت یہ ہے کہ اس واقعہ میں اسلام وایمان، عقیدہ واطمینان کے دلائل انتہائی واضح طور پر نظر آ رہے ہیں۔ اور ان تمام دلائل میں اہم نکتہ آپ کا وہ مباہلہ ہے جو ایمان کی آخری منزل پر ہوا کرتا ہے۔ جس کے بعد واضح سی بات یہ ہے کہ اگر یہ سچے ہیں تو نبی کی نصرت ایک اسلامی فریضہ ہے جس سے تا آخر حیات اعراض نہیں کیا جا سکتا اور اگر معاذ اللہ غلط گو ہیں تو انھیں قتل ہونا چاہیے اس لیے کہ اللہ پر افترا کرنے والے کی سزا قتل ہے۔

یاد رکھیے اگر حضرت ابوطالبؑ کی یہ ساری نصرت و امداد قرابت کی بنا پر ہوتی تو ہرگز ہرگز سپردگی پر آمادہ نہ ہوتے اس لیے کہ قرابت صدق و کذب کے تابع نہیں ہوتی اس کے اصول اصولِ شریعت سے الگ ہوتے ہیں، وہاں جھوٹ سچ سے کوئی تعلق نہیں بلکہ مقصد برآری سے کام ہوتا ہے۔

حصارِ شعب ٹوٹا۔ شعب سے قافلہ باہر آیا اور حضرت ابوطالبؑ نے موقع سے فائدہ اٹھانے کی ٹھان لی۔ آپ نے دیکھا کہ ہماری صداقت اور دشمن کا کذب واضح و آشکار ہو چکا

ہے لہٰذا کوئی انتظام ایسا کر دیا جائے جس سے یہ شانِ فتح ہمیشہ کیلئے تاریخ پر ثبت ہو جائے چنانچہ آپ نے فوراً چند اشعار نظم کر دیے:

وقد کان فی امرالصحیفۃ عبرۃ — متی یخبر غائب القوم یعجب

محا اللہ منہا کفرہم وعقوقہم — وما نقموا من ناطق الحق معرب

فاصبح ما قالوا من الامر باطلا — ومن یختلق ما لیس بالحق یکذب[۱]

یہ دستاویز کا قصہ بھی ایک عبرت بن گیا۔ قوم کو خبرِ غیب سے بڑا تعجب ہوا

لیکن اللہ نے اس کے کفر، نافرمانی اور مخالفتِ حق کے کلمات کو مٹا کر رکھ دیا

ان کی بات باطل ہو کر رہ گئی، کیوں نہ ہو؟ جو خلافِ حق کہے گا جھوٹا بنے گا۔

یہ تینوں اشعار اس مکمل قصیدہ کا ایک حصہ ہیں جن کے بعض اشعار سابق میں نقل کیے جا چکے ہیں

حضرت ابوطالبؑ نے ان اشعار میں دستاویز کی تباہی کو ایک ایسی عبرت قرار دیا ہے جس سے انسان حیرت میں پڑ جائے اور اس کے دل پر ظلم و تعدی، کفر و نافرمانی کے جذبات ایمان باللہ سے بدل جائیں بلکہ اگر تعصب درمیان میں حائل نہ ہو تو ایمان باللہ لازمی و ضروری حیثیت اختیار کرلے۔

چنانچہ آپ نے دوسرے شعر میں دیمک کے تسلط اور تحریر کے محو ہو جانے کو ایک خدائی امر قرار دیا ہے جس سے عبرت و حیرت ناگزیر چیزیں ہیں۔ آپ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ان کی مخالفتوں سے حق چھپ نہیں سکتا۔ اس لیے کہ اس کی طبیعت ہی ظہور پذیر ہوتی ہے اور چونکہ ان کی مخالفت حق کے مقابلے میں ہے اس لئے فضیحت و رسوائی بھی لازمی اور ضروری ہے

۱: کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۶۱، الحجۃ ص ۴۵-۴۶، بحار ج ۶ ص ۵۲۳، اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۲۱، ایمان ابوطالب ص ۱۵، مناقب ج ۱ ص ۶۴، الغدیر ج ۷ ص ۳۶۲، مجمع البیان ج ۷ ص ۳۴

جناب ابوطالبؑ نے اس دستاویز کے بارے میں ایک قصیدہ اور بھی ارشاد فرمایا ہے جس میں اپنے ماضیٔ قدیم اور روشن حال کی عکاسی کی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ اس قصیدہ کے بعض اشعار بھی اس مقام پر نقل کر دیے جائیں۔ آپ فرماتے ہیں:

ألاهل أتى بحريّنا صنع ربّنا ... على نائهم؟ والله بالناس ارود

فيخبرهم ان الصحيفة مزقت ... وان كل مالم يرضه الله مفسد

تراوحها إفك وسحر مجمّع ... ولم يلف سحر آخر الدهر يصعد

تداعى لها من ليس فيها بقرقر ... فطائرها في رأسها يتردد

کاش کوئی حبشہ کے دور افتادگان کو خدائی کرم کی اطلاع کر دیتا اور خدا تو بڑا کریم ہے ہی۔

کوئی انھیں بتاتا کہ دستاویز پارہ پارہ ہو گئی اور اللہ کی مرضی کے خلاف کام فاسد ہی ہوتا ہے۔

یہ دستاویز جعلسازی اور جادوگری کا مجموعہ تھی۔ ظاہر ہے کہ جادو ہمیشہ نہیں چلتا۔ اس دستاویز پر اچھے اچھے لوگوں کی نظر ہے بہر حال اب اس کے سر پر طائر نحوست منڈلا رہا ہے۔

فمن ينش من حضار مكة عزه ... فعزتنا في بطن مكة اتلد

نشأنا بها والناس فيها قلائل ... فلم ننفك نزداد خيرا ونحمد

ونطعم حتى يترك الناس فضلهم ... اذا جعلت أيدي المفيضين ترعد

اگر یہ لوگ مکہ میں تازہ عزیز بنے ہیں تو ہماری عزت بہت قدیم ہے۔

ہم یہیں پیدا ہوئے اور ہمیشہ خیر و خوبی کے ساتھ بڑھتے رہے۔

ہم اس وقت بھی کھلا دیتے ہیں جب اچھے اچھے کرمیوں کے ہاتھ لرز جاتے ہیں۔

الا ان خیر الناس نفساً و والداً ۔۔۔ اذا عد سادات البریة احمد
نبی الاله و الکریم باصله ۔۔۔ و اخلاقه و ھو الرشید المؤید
جری علی جری الخطوبة کانه ۔۔۔ شھاب بکفی قابس یتوقد
من الاکرمین من لوی بن غالب ۔۔۔ اذا سیم خسفاً وجھه تربد
طویل النجاد خارج نصف ساقه ۔۔۔ علی وجھه یسقی الغمام و یسعد
عظیم الرماد سید ابن سید ۔۔۔ یحض علی مقری الضیوف و یحشد
و یبنی الابناء العشیرة صالحاً ۔۔۔ اذا نحن طفنا فی البلاد و یمھد[1]

یاد رکھو دنیا میں حسب نسب کے اعتبار سے سب سے بہتر ذات محمدؐ کی ہے
یہ نبیؐ خدا، کریم الاصل، جید الاخلاق، ہوش مند اور موید من عند اللہ ہیں
حوادث کو اس طرح واضح کر دیتے ہیں جیسے کسی شخص کے ہاتھ میں شعلہ روشنی دے رہا ہو
یہ لوی بن غالب کے بزرگ خاندان کے ایک فرد ہیں، ذلت کے تصور سے ان
کے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے
ایک قدآور آدمی ہیں بادل انھیں کے نام پہ پانی برساتے ہیں
سخی، سردار ابن سردار ہیں اور مہمان نوازی میں یگانۂ روزگار ہیں
جب ہم بچوں کو چھوڑ کر سفر میں چلے جاتے ہیں تو یہ ان کی تربیت کر کے انھیں
صالح بناتے ہیں۔

ذرا ابو طالب کی زبان سے رسول اکرمؐ کی شخصیت کا جائزہ لیجیے۔ دنیا کے سادات
اور بزرگوں میں حسب و نسب کے لحاظ سے سب سے بہتر، اللہ کا نبی، کریم الاصل، جید الاخلاق

---

[1]: السیرة الشامیہ ج ۲ ص ۱۹۰۔ استیعاب ج ۲ ص ۹۲۔ الغدیر ج ۷ ص ۳۶۵۔ دیوان ابی طالب ص ۱۔
اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۳۴۔

وقتِ احتضار

وہ شجرۂ مبارکہ جس کے سایہ میں اسلام رسول اسلامؐ نے پناہ لی تھی آج رو بزوال ہو رہا ہے۔ شاخیں جھک چکی ہیں۔ سرچشمۂ حیات منقطع ہو چکا ہے، پتے زرد ہو رہے ہیں اور موت کی رنگت سارے اجزا پر چھائی جا رہی ہے۔

یعنی وہ انسان جس نے ساری طاقت، پوری قوت اور تمام انسانی کوشش اسلام کی خدمت میں صرف کر دی تھی۔ اپنے تھکے ہوئے اعصاب، ستم رسیدہ روح اور الم دیدہ نفس کو راحت دینا چاہتا ہے۔

اب وہ وقت آگیا ہے کہ باپ کی وصیت پر عامل، اسلام کا خادم، نبوت کا محافظ عقیدہ کا مجاہد انسان اپنی نعمتوں کا ثمرہ حاصل کرے اور اپنی کاوشوں کا بدلہ پائے۔ لیکن کیا کہنا حضرت ابوطالبؑ کا کہ ایسے سخت وقت میں بھی اپنے گرد جمع شدہ خاندان والوں پر ایک نظر ڈالتے ہیں اور وہی وصیت دہراتے ہیں جو باپ نے اپنے آخری وقت میں خود انھیں کی تھی۔ چاہتے یہ ہیں کہ جس بار کو تنہا اٹھایا تھا اسے سارے خاندان والے مل کر اٹھائیں۔ جس کام کو اکیلے سنبھالا تھا اسے ایک جماعت مل کر پروان چڑھائے۔ اجتماع کی طاقت اور اتحاد کی قوت کچھ اور ہی ہوتی ہے۔

اسی خاندان کے ایک فرد مومنِ اوّل اور ناصر وحید علیؑ ہیں جو باپ کے فریضہ کی تکمیل کریں گے۔ اور رسولؐ کی نصرت میں اپنا سرمایۂ حیات تک لٹا دیں گے۔

یہ ہیں حضرتِ ابوطالبؑ! حیات کا شعلہ خاموش ہو رہا ہے، زندگی کی شمع بجھ رہی ہے لیکن ایک ضعیف، نحیف اور پرہیبت آواز میں قریش کے حاضرین کو خطاب کر رہے ہیں

تاکہ اسلام کی نصرت کی وصیت ان سے بھی متعلق کر جائیں۔ شاید اللہ انھیں کسی طرح ہدایت کر دے!

"اے گروہِ قریش تم اللہ کے برگزیدہ بندے ہو، تم عرب کی جان ہو، تم میں قابل اطاعت سردار اور معرکہ گیر شجاع موجود ہیں۔ یاد رکھو تمھارے پاس عرب کی کوئی فضیلت ایسی نہیں ہے جو موجود نہ ہو۔ تم سب سے افضل اور سب تمھارے محتاج ہیں۔ لوگوں نے تم سے متفقہ طور پر جنگ کا ارادہ کر لیا ہے لہٰذا تمھارا فریضہ ہے کہ خانۂ کعبہ کی تعظیم کرو اسی میں اللہ کی مرضی، معاش کی وسعت اور قدم کا ثبات پوشیدہ ہے، صلۂ رحم کرو قطع تعلق نہ کرو، صلۂ رحم سے عدد میں ترقی اور زندگی میں اضافہ ہوتا ہے، ظلم و نافرمانی کو ترک کرو۔ اس سے قومیں ہلاک ہو چکی ہیں۔ سائل کا سوال رد نہ کرو، طالب کی طلب کو پورا کرو، اسی میں حیات و ممات کا شرف ہے، سچ بولو، امانت داری سے کام لو، اس میں خصوصی محبت اور عمومی کرامت ہے۔ دیکھو میں تمھیں محمدؐ کے ساتھ نیکی کی وصیت کرتا ہوں، یہ قریش میں امین اور عرب میں صدیق ہیں، ان کا پیغام ایسا ہے جسے دل نے قبول کر لیا ہے یہ اور بات ہے کہ خوف اختلاف سے زبان پر نہیں آسکا!

خدا کی قسم میں دیکھ رہا ہوں کہ عرب کے فقراء و مساکین و ضعفاء و بیچارگان اس کے دین کو قبول کر کے اس کی عظمت بڑھا رہے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں قریش کے رؤساء و زعما پست ہو رہے ہیں، ان کے گھر برباد ہو رہے ہیں، ان کے بزرگ محتاج نظر آرہے ہیں، عرب اس محمدؐ کے دوست ہوئے جا رہے ہیں اور اس کی قیادت تسلیم کر رہے ہیں، اے قریش! یہ تمھارے خاندان کا فرد ہے، اس کا ساتھ دو، اس کی حمایت کرو۔ خدا کی قسم اس کا متبع رشید اور اس کا تابع نیک بخت ہے، اگر اب بھی میری حیات میں کچھ اضافہ ہو جاتا تو میں اس کی طرف سے تمام

مصائب و مشکلات کا مقابلہ کرتا[1]۔

کیا کہنا اس عظمتِ ایمان اور جلالت عقیدہ کا! خدا کی قسم اگر حضرت ابوطالبؑ کے ایمان کیلئے اس وصیت کے علاوہ کوئی اور دلیل نہ بھی ہوتی تو بھی آپ کے ایمان کا اعتراف لازم و واجب ہوتا۔ اس وصیت کا ہر کلمہ اور ہر فقرہ ایک واضح ایمان اور راسخ عقیدہ کا اعلان کر رہا ہے۔

وصیت کا یہ حصہ ایمان کا ایک ایسا جزو ہے جو اہلِ غرض اور بے ایمان لوگوں کی لرزتی ہوئی زبانوں کو بند کرنے کیلئے پوری حد تک کافی و وافی ہے۔ یہ وہ وصیتیں ہیں جو ایک مومنِ کامل کے علاوہ کسی کی زبان پر آ ہی نہیں سکتیں۔ مومن بھی ایسا جو شریعت کے ظاہر و باطن سے واقف، احکام کے اسرار پر مطلع اور مستقبل میں آنے والے حالات کی پوری بصیرت رکھتا ہو۔ حال کے کثیف پردوں کو ہٹا کر مستقبل کا روشن چہرہ دیکھ سکتا ہو۔

خانۂ حق کی تعظیم کی وصیت ہو رہی ہے۔ اس لیے کہ تعظیم کعبہ شعورِ ایمانی اور احساسِ مذہبی کی دلیل ہے۔ یہی رضائے الٰہی کا باعث ہے اور ظاہر ہے کہ جب اللہ راضی ہوگا تو معاشیات کی اصلاح بھی کریگا۔ قدموں کو بھی ثبات دے گا اور قول میں استقامت بھی عطا کرے گا۔

صلۂ رحم کا حکم ہو رہا ہے اس لیے کہ یہ درازیٔ عمر کا باعث ہے۔ بساطِ حیات کشادہ ہو جاتی ہے۔ عدد میں اضافہ ہو جاتا ہے اور قطع رحم سے اس کے برعکس اثرات پیدا ہوتے ہیں۔

جب ہم اس کے بعد اسلامی تشریع و احکام کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہاں بھی یہی حکم موجود اور یہی علت مذکور ہے۔ ظلم و نافرمانی کی ممانعت ہو رہی ہے۔

۱: السیرۃ النبویہ ص۸۶ الحلبیہ ج ۱ ص۳۹۱ ثمرات الاوراق ج ۲ ص۱۲ شیخ الابطح ص۳۹ اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص۲۹ الغدیر ج ۷ ص۳۶۷ العباس ص۲۱ صوت العدالۃ ج ۱ ص۹۵ (قدرے اضافہ کے ساتھ)

اس لیے کہ یہ معاشرت کیلئے ایک ایسا تیشہ ہے جو انسانیت کے ایوان کو تباہ کر دیتا ہے۔ بشریت کے آثار کو محو کر دیتا ہے۔ طالب کی طلب پر لبیک اور سائل کے سوال پر عطا کا حکم ہو رہا ہے اس لیے کہ اس میں دنیا و آخرت کا شرف ہے۔ لبیک کہنے سے نام کی بقا، ذکر کا دوام، مدحت کی پائداری اور اسوۂ حسنہ کی تکمیل ہوتی ہے، مال عطا کرنے سے مکمل بدلہ اور نیک جزا ملتی ہے۔

صداقت و امانت کا حکم دیا جا رہا ہے اس لیے کہ یہ انسانیت کے امتیازی جوہر اور بلندیٔ نفس و پاکیزگیٔ ضمیر کے دلائل و براہین ہیں۔

درحقیقت یہی وہ انسانی قوانین ہیں جن کی ترویج کے لیے رسول اکرمؐ مبعوث ہوئے تھے گویا کہ حضرت ابوطالبؑ اسلامی احکام کے سرچشمہ سے پورے طور پر مطلع تھے۔ اور یہ فیاضی اسی چشمے سے ہو رہی تھی۔

آپ نے آخری وقت قریش کے سامنے یہ وصیتیں اور یہ انسانی تعلیمات پیش کر کے انھیں اس بات کی طرف متوجہ کر دیا کہ اب اگر محمدؐ انھیں تعلیمات کو زبانِ وحی پیش کریں تو یہ سمجھ لینا کہ ان کا دین دینِ الٰہی اور ان کا پیغام پیغام فلاحِ انسانی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ان تمام احکام و تعلیمات کا تذکرہ کرنے کے فوراً بعد بیان کا رُخ بدل دیتے ہیں اور رسول اکرمؐ کے بارے میں وصیت شروع کر دیتے ہیں اور اس وصیت میں یہ فقرہ خاص طور سے ذکر کرتے ہیں کہ محمدؐ ان تمام تعلیمات کا جامع اور ان تمام احکام کا مرکز و مخزن ہے وہ اس رسالتِ کبریٰ کا حامل ہے جس کا مقصد ہی تکمیلِ اخلاق و تہذیبِ انسانیت ہے

حضرت ابوطالبؑ کے آخری کلمات میں آپ کے ایمانِ کامل کا ایک بڑا احساس نکتہ پایا جاتا ہے۔ آپ نے رسول اکرمؐ کو تمام قریش میں امین کے لقب سے یاد فرمایا ہے۔ مقصد یہ ہے جو شخص امین ہو گا وہ اللہ سے خیانت نہیں کرے گا۔ پھر آپ نے

انھیں عرب کا صدیق قرار دیا جس کا مطلب یہ ہے کہ صدیق کسی وقت بھی خداوند عالم کے خلاف جھوٹ نہیں بول سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ قریش نے اعلان رسالت کے بعد سے رسول اکرمؐ سے اس لقب کو سلب کر لیا۔ اور انھیں ساحر و کذاب کہنے لگے۔ انھیں بخوبی معلوم تھا کہ صداقت و امانت کا اعتراف انکار نبوت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ حضرت ابوطالب کا امانت و صداقت کا اعتراف ہی ان کے ایمان کے اثبات کیلئے کافی ہے لیکن حضرت ابوطالبؑ نے چاہا کہ بات کو اور بھی واضح کر دیا جائے۔ عقیدہ کو اعلان کی آخری منزل تک پہنچا دیا جائے۔ اس لیے فرمایا کہ محمدؐ کے پیغام کو دل نے قبول کر لیا ہے لیکن زبان سے ظاہر نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ وقت کی مصلحت یہی ہے، موقف کی نزاکت، پیغام کی اہمیت، فریضہ کی ادائیگی اور رسالت کی نصرت اسی بات کی مقتضی ہے۔

اس کے بعد آپ نے ایک دوررس اور پردہ شگاف نظر اٹھائی اور دور تک مستقبل کا جائزہ لیتے چلے گئے۔ کیا دیکھا کہ محمدؐ کی محبت دلوں میں جگہ پا رہی ہے ان کی بارگاہ میں سر جھک رہے ہیں، ان کے دست قوت و عظمت کے منازل پر فائز ہو رہے ہیں اور ان کے دشمنوں کے سر سے تاج اتر کر نعلِ قدم بن رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ چاہا کہ لوگوں کو ان کے اتباع کی دعوت دیں تاکہ یہ ان کی نصرت و حمایت کریں، ان کے دین کی رعایت و حفاظت کریں، ان کے انوار سے ضیا حاصل کریں، ان کی ہدایت سے استفادہ کریں اور اس طرح سعادت کی آخری منزلوں پر فائز ہو جائیں۔

ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ ایک مرتبہ نظر اپنے حال کی طرف مڑ گئی۔ افسوس میں اب نہ رہوں گا ورنہ میں تو پوری پوری مدد کرتا، تیز و تند ہواؤں سے بچاتا۔ طوفانوں اور آندھیوں سے محفوظ رکھتا، سرکشوں کے شر سے محفوظ رکھتا اور اس طرح

ہر قسم کی تکلیف و اذیت سے بچاتا رہتا۔

حقیقت امر یہ ہے کہ یہ وصیت ایمانِ عمیق اور جذبۂ فداکاری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے ایک ایسے سخت وقت میں جب انسان کے ہوش و حواس بجا نہیں ہوتے آپ کو اگر کوئی فکر ہے تو دینِ اسلام کی۔ چاہتے ہیں کہ تاریخ اس وصیت کو ثبت کر لے تاکہ آئندہ افترا پرداز خود رسوا ہو جائیں اور اُن کا منصوبہ کامیاب نہ ہو سکے۔

حضرت ابوطالب نے اس وصیت میں تمام قریش کو اس لیے شامل کر لیا کہ انھیں اس بات کا اندازہ ہو جائے کہ ابوطالبؑ کے بارے میں ہمارا خیال غلط تھا کہ یہ ہمارے دین پر نہیں ہیں یہ محمدؐ کی دعوت قبول کر کے ان کے دین میں داخل ہو چکے ہیں۔

اس کے بعد آپ نے بنی عبد المطلب اور بنوہاشم کو بالخصوص خطاب کر کے انھیں رسول اکرمؐ کے اتباع کی دعوت دی، اس لیے کہ اسی اتباع میں نجات، خیر، سعادت اور رشد و فلاح ہے[1]۔

اے بنی ہاشم محمدؐ کی اطاعت اور ان کی تصدیق کرو اس میں فلاح بھی ہے اور عقلمندی بھی!"

اس کے بعد بنی ہاشم میں سے چار آدمیوں کو منتخب کیا:

اوصی بنصر نبی الخیر اربعۃ	ابنی علیاً و عم الخیر عباسا
وحمزۃ الاسد المخشی صولتہ	وجعفراً ان تذودوا دونہ الناسا
کونوا فدا لکم امی وما ولدت	فی نصر احمد دون الناس اتراسا
بکل ابیض مصقول عوارضہ	تخالہ فی سواد اللیل مقیاسا

---

(۱) السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۲۰۸، الحلبیہ ج ۱ ص ۳۹۱، ابوطالب ص ۹۱، الغدیر ج ۷ ص ۳۶۵۔

"میں پیغمبر خیر و برکت کی نصرت کیلئے اپنے بیٹے علیؑ ۔ عباس
شیر بیشۂ شجاعت حمزہ اور جعفر کو وصیت کرتا ہوں، ان کا فرض ہے کہ ان کا
دفاع کریں۔
میرے پیارو! میں تم پر قربان! تم محمدؐ کیلئے ایک محکم سپر کے مانند بن جاؤ۔
تمھارے ہاتھ میں ایسی چمکدار تلواریں ہوں جو تاریکی شب میں مشعل راہ معلوم ہوں"۔

کیا یہ بھی عقل میں آنے والی بات ہے کہ محمدؐ کے پیغام کو فلاح، رشد، خیر اور سعادت قرار دے کر دنیا کو اس کے اتباع کی دعوت دینے والا انسان خود ہی اس کا مخالف ہو۔ خدا کی قسم یہ بات عقل کے خلاف ہے، انسان کسی کی بات کو عقلمندی، فلاح و خیر ماننے اور پھر اس کا منکر ہو ہدایت کا اعلان کرے اور پھر گمراہی پر باقی رہے۔ معاذاللہ، استغفراللہ!

حضرت ابوطالبؑ کے صحیفۂ حیات کی یہی وہ آخری سطریں ہیں جن میں ایمان کی چمک عقیدہ کی مہک اور جہاد و فداکاری کی تحریریں پائی جاتی ہیں۔

اللہ اکبر! کتنا بڑا مومن ہے یہ انسان۔ کیسا مددگار و محافظ ہے یہ مجاہد امین!!

۱: الغدیر، ج۷ ص۳۴۲ ۲۔ ایمان ابی طالب ص۱۷ ۔ الحجۃ ص۹۱ مناقب ج۱ ص۳۵ اعیان الشیعہ ج۳۹ ص۱۲۰
مجمع البیان، ص۳۷ (قدرے قدرے اختلاف کے ساتھ)

جزوِ دوم

تاریخ کی ذمّہ داریاں؟

بعدِ موت

بھلا کیونکر ممکن تھا کہ وہ رسول جو عدالت و انصاف اور وفاداری کے لیے نمونۂ عمل تھا کسی منعم کے کرم یا کسی محسن کے احسان کو فراموش کر دیتا۔ یہی وجہ تھی کہ ابوطالب کے مرنے کا غم دل کی گہرائیوں سے گزر کر چہرے کے خطوط تک آگیا۔ خیال یہ تھا کہ اصحاب سے مقابلہ سخت اور تبلیغ اسلام میں بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے

عبید اللہ ابن ابی رافع کہتے ہیں کہ ادھر علیؑ نے رسول اکرمؐ کو اپنے والد بزرگوار کے انتقال کی خبر دی، ادھر آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری ہو گیا، تھوڑی دیر کے بعد آنسو روکے اور دل کو سنبھالا، ایک خفیف و غم انگیز لہجے میں علیؑ سے خطاب کیا "جاؤ باپ کو غسل و کفن دیکر دفن کرو، خدا ان پر رحمت نازل کرے۔[1] اور انھیں بخش دے"

مسلمانو! کیا اسلام ابوطالب پر اس سے بہتر بھی کوئی دلیل ہو سکتی ہے کہ رسول جیسا ذمہ دار انسان علیؑ جیسے مسلمان کو ابوطالب کی تجہیز و تکفین کا حکم دے جبکہ شریعت اسلامیہ میں کافر کی تغسیل و تکفین حرام ہے!

یہی نہیں بلکہ خود رسول بھی دعائے مغفرت اور سوالِ رحمت سے یاد کرے۔ جبکہ وہ مومنین پر رحیم اور کافرین پر شدید و غضب ناک ہیں۔ علیؑ گئے، تجہیز و تکفین سے فارغ ہوئے، اسلام کے ناصر اول کا جنازہ مسلمانوں کے کاندھوں پر اٹھا۔ علیؑ نے دوڑ کر رسول اکرمؐ کو خبر پہنچائی اور حضورؐ جنازہ کی مشایعت کو پہنچ گئے، نہ آگے آگے جنازہ اور پیچھے پیچھے اسلام کا پیغامبر ناصر اسلام کا قصیدہ پڑھتا ہوا۔

۱: السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۲۰۳ العدیر ج ۳ ص ۹۹ ج، ص ۳۰۰ شیخ الابطح ص ۱۲ الحجۃ ص ۱۲۲ عمم القیوس ج ۱ ص ۲۰۶ تذکرۃ الخواص ص ۱۰ ایمان ابیطالب ص ۱۰ اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۶۱ ۔

"چچا آپ نے صلۂ رحم کیا، خدا آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ نے مجھے پالا، میری ذمہ داری لی اور بڑا ہونے کے بعد بھی میری نصرت کی اور میرا ہاتھ بٹایا"[1]

جنازہ آگے بڑھا قبر کے قریب پہنچا۔ رسولؐ کی زبان پر کلمات جاری ہوئے:

"خدا کی قسم میں استغفار بھی کروں گا اور شفاعت بھی۔ چچا ایسی شفاعت جس سے جن و انس دونوں متحیر رہ جائیں"[2]

ابھی رسول اکرمؐ کا یہ مرثیہ ختم نہیں ہوا تھا کہ شور و شین اور آہ و بین کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ "وا ابتاہ! وا ابا طالباہ واحزناہ علیک یا عماہ" (چچا آخر کس طرح صبر کروں، آپ نے بچپنے سے پالا، بڑا ہونے کے بعد محبت و شفقت سے سلوک کیا۔ میں تو آپ کی آنکھوں کا نور اور آپ کیلئے روح رواں تھا)[3]

"میں آنکھوں کا نور تھا!" کیا جس کی آنکھوں کا نور رسول اکرمؐ جیسا ہادی و مرشد ہو وہ بھی تاریکیوں میں رہ سکتا ہے؟ "میں جسم کیلئے روح رواں تھا" وہ روح جس پر زندگی کا دار و مدار اور حیات کا انحصار ہوتا ہے، وہ روح جو احساس کا مرکز، شعور کا مصدر اور انسانیت کا جوہر اوّل ہے۔ وہ روح جس کے بعد جسم عنصری بوسیدہ لکڑی کی مانند اور قبر کی تاریکیوں میں پوشیدہ کر دینے کے قابل ہو جاتا ہے۔

کیا اس درجۂ اتحاد کے بعد بھی انکار رسالت کے امکانات پائے جاتے ہیں؟ بھلا کائنات میں وہ کونسا جسم ہے جس کی روح رواں رسالت ہو؟ عالمین میں وہ کونسا

۱: الحدیدی ج ۳ ص ۳۱۴ بحار ۳۵ ص ۵۲۳، ۵۲۹، شیخ الابطح ص ۳۳ الغدیر ج ۷ ص ۳۷۴، ۳۸۷، الحجۃ ص ۶۶ ابوطالب ص ۹۶ معجم القبور ج ۱ ص ۱۹۱، ۲۰۴ تذکرۃ الخواص ص ۱۰ ایمان ابیطالب ص ۱۰

۲: معجم القبور ج ۱ ص ۲۰۱ ایمان ابیطالب ص ۱۰ اور تاریخ سابق الذکر حوالے

۳: شیخ الابطح ص ۴۳ اصابہ ج ۷ ص ۱۱۳

پیکر ہے جس کا شعور رسالت کے ادراک سے خمیر ہوا ہو۔

لیجئے وہ رسالت کا حصن حصین، تبلیغ کا مستحکم قلعہ منہدم ہوگیا۔ بیشہ ہاشمی کا شیر قبر میں جا سویا، زمین رسولؐ اور اس کے ناصر حقیقی کے درمیان حائل ہوگئی۔

قریش کے وحوش اٹھنے لگے۔ اس لیے کہ اب شیر کی دہاڑ سنائی نہیں دیتی۔ راستہ صاف ہوگیا ہے، زمین ہموار اور فضا سازگار ہوگئی ہے مختلف قسم کی اذیتوں، طرح طرح کی زحمتوں اور تمسخر و اہانت کی تیاریوں کا وقت آگیا ہے۔

بھلا محال ہے کہ ایسے وقت میں رسول اکرمؐ کے ذہن سے ابوطالبؑ کا خیال نکل جائے! ہرگز نہیں۔ اب تو ہر مصیبت اپنے ساتھ ابوطالبؑ کی یاد لیکر آتی ہے۔ اور ہر شدت و زحمت کے ساتھ ابوطالبؑ کے تذکرے ہوتے ہیں۔

گھر میں داخل ہوتے ہیں۔ عالم یہ ہے کہ مشرکین نے سارے سر پر خاک ڈال دی ہے۔ بیٹی پریشان و اشکبار ہوکر دوڑ پڑتی ہے۔ باباجان یہ کیا؟ "بیٹا روؤ نہیں اللہ تمھارے باپ کی حفاظت کرے گا۔"

یقیناً کہیں اور خیال ماضی میں کھو گیا۔ اگر آج میرا چچا زندہ ہوتا تو کس طرح اس ظالم کو سزا دیتا، اگر آج میرا مددگار حیات ہوتا تو کس طرح اس بے شعور کو جرأت ہوتی۔ یہ سوچا اور زبان پر کلمات آگئے: "قریش نے کوئی اذیت اس وقت تک نہیں پہنچائی جب تک کہ ابوطالبؑ کا انتقال نہیں ہوگیا۱۔"

۱: السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۴۱۶، ۲۰۱ الحلبیہ ج ۱ ص ۴۹۱ الشامیہ ج ۲ ص ۴۱۴ طبری ج ۲ ص ۳۴۴ ابن اثیر ج ۲ ص ۶۳ مناقب ج ۱ ص ۶۳ بحار ج ۱۹ ص ۳۰ ۵۲۸ شیخ الابطح ص ۴۵ معجم القبور ج ۱ ص ۲۰۱ ابوطالب ص ۹۱ الغدیر ج ۷ ص ۳۷۳ صوت العدالۃ ج ۱ ص ۸۵ اعیان الشیعہ ۳۹ ص ۱۲۷ (تھوڑے اختلاف کے ساتھ)

یہی نہیں بلکہ جب بھی کوئی وقت پڑ گیا جب بھی نصرت کی ضرورت ہو گئی تخیل میں معاً ابو طالبؑ کی تصویر کھنچ گئی۔ زبان بیان کی یاد تازہ ہو گئی۔ ہائے چچا کتنی جلد آپ سے جدائی ہو گئی! [illegible]

[illegible]

[illegible] مشیت الٰہی کا تقاضا یہ تھا کہ رسولؐ کا سخت امتحان لیا جائے۔ چنانچہ چند دنوں کے بعد آپؐ پر دو ایسی مصیبتیں پڑ گئیں جن میں سے ہر ایک بنیادی قوتوں کو زائل کر دینے اور دل کو پاش پاش کر دینے کے لیے کافی تھی۔ [illegible]

[illegible] ایک طرف ابو طالب کا فراق جن کی رعایت و حمایت، حفاظت و شفقت کی بنا پر قریش کو مقابلہ کی تاب نہ تھی اور دوسری طرف خدیجہ کا انتقال جن کا مال و منال اخلاص و جذبۂ تبلیغ، مصائب کے علاج، سختیوں کے مقابلہ اور زخم ہائے دل کے مرہم کیلئے کافی تھا۔

اب وہ دونوں ہی رخصت ہو گئے۔ کتنا سخت وقت آگیا۔ دنیا تنگ اور عالم نظر میں تاریک ہے صرف اللہ پر اعتماد اور اسی کا سہارا ہے۔ آہ! یہ دونوں کتنی سختیاں جھیل کر دنیا سے گئے ہیں۔ شعب کی زندگی میں کتنے مصائب انھوں نے برداشت کیے وہ اسّی برس سے زیادہ کا ضعیف انسان اور وہ اعمال۔ جب کارنامے نمایاں ایسے ہوں تو نتائج کو بھی اتنا ہی اہم، تذکرہ کو اتنا ہی دائم اور آثار کو اسی طرح باقی رہنا چاہیے۔[1]

---

[1] حضرت ابو طالب کی وفات کے بارے میں چند قسم کے اختلافات ہیں: پہلا اختلاف مہینہ کے سلسلے میں ہے۔ بعض کے نزدیک آپ کا انتقال رجب میں ہوا۔ بعض کے نزدیک رمضان میں۔ بعض شوال لکھتے ہیں اور بعض ذیقعدہ۔ دوسرا اختلاف سنہ کے بارے میں ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ آپ کا انتقال بعثت کے بعد سنہ ۹ میں ہوا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ سنہ ۱۰ میں۔ ایک دوسرا اختلاف یہ ہے کہ جناب ابو طالب و حضرت خدیجہ میں پہلے کس کا انتقال ہوا ہے۔ ایک بحث یہ بھی ہے کہ دونوں کے سانحۂ ارتحال کے درمیان فاصلہ کس قدر تھا؟ [illegible]

ایک وقت وہ بھی آیا جب حامی کے تصور سے دل بھر آیا۔ غم و الم کے جذبات اُمڈ آئے اور زبان پر کچھ کلمات جاری ہو گئے۔ کیسے کلمات جن میں خالق پر اعتماد، صاحبِ قوت سے امید، قضائے الٰہی پر صبر، اللہ کی بارگاہ میں شکوہ اور اذیت و ایذا سے فریاد کا ایک طوفان تھا۔ خدایا! میری قوت کم، میری تدبیریں کمزور اور میں لوگوں کی نظروں میں ذلیل و حقیر ہوا جا رہا ہوں۔ خدایا! اے ارحم الراحمین تو ضعیفوں کا پروردگار اور میرا مالک ہے۔ آخر مجھے کس کے حوالے کیا ہے؟ کیا کسی غیر کے حوالے کیا ہے یا دشمن کو مسلط کر دیا ہے۔ خیر اگر تو غضب ناک نہیں ہے تو کوئی پرواہ نہیں ہے۔ تیری عافیت میرے لیے کافی ہے۔ اے ظلمات کو روشن کرنے والے، اے عالمین کی اصلاح کرنے والے تیری پناہ تیرے ہی عذاب اور تیری ہی ناخوشی سے، تیری ہی رضامندی کی امید ہے تیرے علاوہ قوت ہی کس کے پاس ہے![1]

اس قلعۂ مستحکم کے منہدم ہونے، اس پناہ گاہ کے مٹ جانے اور اس مددگار کے مر جانے کے بعد اب مکہ میں رہ ہی کون گیا ہے؟ اب تو شدائد ہی شدائد اور مصائب ہی مصائب ہیں۔ یہی فکر، یہی سوچ اور یہی اضطراب کا عالم تھا۔ کہ ایک مرتبہ ملک سا حکیم ایزدی لیکر پہنچ گیا — محمدؐ! مکہ سے باہر نکل چلو، اب تمہارا کوئی نہیں رہا ہے۔[2]

۱: الطبری ج ۲ ص ۸۱ ۔ ابن الاثیر ص ۶۴ ۔ السندی ج ۲ ص ۳۲۲ الحلبیہ ج ۱ ص ۳۵۳ النبویہ ج ۱ ص ۲۸۶ البشامیہ ج ۲ ص ۶۱ مناقب ج ۱ ص ۳۰ بحار ج ۶ ص ۵۲۹ ۔ شیخ الابطح ص ۵۲ علی ہامش السیرۃ ج ۳ ص ۱۴۹ ۔ محمد النبی العربی ص ۶۵ (قدرے اختلاف کے ساتھ)

۲: شرح النہج ج ۱ ص ۱۰ الحجۃ ۱۷ - ۶۴ - ۱۰۳ ۔ بحار ج ۶ ص ۵۴۳ شیخ الابطح ص ۵ نجم الثاقب ج ۱ ص ۱۹۱ اعیان الشیعہ ج ۲ ص ۶ قسم اول ج ۳۹ ص ۱۲۸

عطر یار تذکرے!

ظاہر ہے کہ ابوطالبؑ کے موقف ایسے نہ تھے جو رسولِ اکرمؐ کے ذہن سے محو ہو جاتے یا جس کی تصویر آنحضرتؐ کی آنکھوں میں نہ پھرا کرتی!

یہی وجہ ہے کہ آپ کسی وقت بھی اس یاد سے غافل نہ ہوتے تھے بلکہ ہمیشہ اپنے تذکروں اور اپنی یادِ دل سے ان مواقف، محاسن اور الطاف و کرم کا شکریہ ادا کیا کرتے تھے۔

بھلا یہ کیونکر ممکن تھا کہ رسولؐ جیسا معلم اخلاق اپنے محسنِ اعظم کو بھلا دے۔ رسولؐ کو ان احسانات کا تذکرہ دو جہتوں سے کرنا چاہیے تھا۔ ایک اپنی ذاتی جہت سے حضرت ابوطالبؑ کے احسانات کے صلے کے طور پر اور ایک رسالت کی جہت سے دنیا کو تعلیم دینے کیلئے اور یہ بتانے کیلئے کہ ہر شخص کو اپنے محسن کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرنا چاہیے جیسا سلوک میں چچا کے ساتھ مرنے کے بعد کر رہا ہوں۔

ایک اعرابی آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، چہرے سے غم و الم کے آثار نمایاں اور آنکھوں سے امید و آس کی روشنی جھلک رہی تھی عرض کرنے لگا یا رسول اللہ اب نہ جانور رہ گئے ہیں نہ اطفال، قحط و خشک سالی نے بالکل تباہ و برباد کر دیا ہے یہ کہکر کچھ اشعار پڑھے جنہیں اپنے حالات کی صحیح عکاسی تھی:

اتیناک والعذراء یدمی لبانہا	وقد شغلت ام الصبی والطفل
والقی بکفیہ الصبی استکانۃ	من الجوع ضعفا ما یمر ولا یحلی
ولا شیٔ مما یاکل الناس عندنا	سوی الحنظل العامی والعلہز الفسل
ولیس لنا الا الیک فرارنا	واین فرار الناس الا الی الرسل

یارسول اللہ اس وقت آیا ہوں جب قحط نے سینے زخمی کر دیے ہیں اور عورتوں نے بچوں کو چھوڑ دیا ہے۔

اب تو بھوک کے مارے بچے بھی تلخ و غیر شیریں غذا کھانے پر آمادہ ہو گئے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ہمارے پاس کھانے کے لیے حنظل جیسی چیز پیلو کے سوا اور کچھ نہیں رہ گیا ہے۔

اب آپ کے پاس آئے ہیں اس لیے کہ رسولوں کے علاوہ اور کوئی جائے پناہ بھی تو نہیں ہے۔

یہ سنا تھا کہ حضرت اٹھے۔ چہرہ پر غم کے آثار نمودار، دل بے چین، عبا دوش پر ڈالی منبر پر تشریف لے گئے۔ حمد و ثنائے الٰہی کے بعد دست بدعا ہوئے:

"خدایا پانی برسا دے تاکہ خشک زراعتیں سرسبز ہو جائیں، جانوروں کے تھنوں میں دودھ پیدا ہو جائے اور زمین پھر سے شاداب ہو جائے"

ابھی دعا ختم نہ ہوئی تھی کہ آسمان پر بجلیاں دوڑنے لگیں اور زمین پر رحمت کی بارش ہونے لگی۔ ایسی موسلادھار کہ لوگ فریاد کرنے لگے۔ یارسول اللہ! اب ڈوبے، اب ڈوبے!

یہ سنتا تھا کہ ہاتھ پھر اٹھ گئے، وہ ہاتھ جن کی دعا رد نہیں ہوتی۔ لبوں کو پھر جنبش ہو گئی، وہ لب جن کی امید ناامید نہیں ہوتی۔ "اب ہم پر نہیں بلکہ اطراف و جوانب پر۔" زبان پر یہ کلمات جاری ہوتے اور گھرے ہوئے بادل چھٹنے لگے۔ رسول اکرمؐ کے لبوں پر تبسم کھیلنے لگا اور دفعتہً خیال ماضی میں کھو گیا، ابوطالبؑ کی یاد نے تڑپا دیا۔ خدا بھلا کرے ابوطالبؑ کا۔ اگر آج زندہ ہوتے تو کس قدر خوش ہوتے ایسے کوئی مجھے ان کے شعر سنائے:

ابا ہیب کا جانشین، رسالت کا محافظ اٹھ کھڑا ہوا۔ یارسول! شاید آپ کی مراد یہ شعر ہے

وابیض یستقی الغمام بوجهہ ثمال الیتامی عصمۃ للارامل

رسول اکرمؐ نے تائید کی اور علیؑ نے باقی اشعار دہرانا شروع کر دیے۔ اب حضرتؐ ہیں کہ مسلسل اپنے چچا کے لیے منبر سے استغفار کرتے چلے جا رہے ہیں یہاں تک کہ ایک مرتبہ بنی کنانہ کا ایک شخص کھڑا ہو گیا اور یہ اشعار پڑھنا شروع کر دیے:

لک الحمد والحمد ممن شکر سقینا بوجہ النبی المطر
دعا اللہ خالقہ دعوتہ الیہ واشخص منہ البصر
فلم یک الا کالقاء الردا واسرع حتی رأینا الدرر
دفاق العزالی جم البعاق اغاث بہ اللہ علیا مضر
فکان کما قالہ عمہ ابو طالب ابیض ذو غرر
بہ اللہ یسقیہ صوب الغمام وھذا العیان لذاک الخبر

خدایا تیرے شکرگزاروں کی طرف سے تیری حمد، تو نے نبی کریمؐ کے واسطے سے ہمیں سیراب کر دیا۔

نبی اکرمؐ نے اپنے خالق سے دعا کی اور اس کے بعد نظریں جھکائیں۔

ابھی کوئی وقفہ نہ گزرا تھا کہ بارش شروع ہو گئی۔

ایسی لگاتار موسلا دھار بارش جس سے قوم مضر کی جان بچ گئی

سچ کہا تھا ابو طالبؑ نے یہ رسول بابرکت اور کریم ہے

انہی کے وسیلے سے بارش ہوتی ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ وہ قول خبر تھا اور آج اس کا مشاہدہ بھی ہو گیا۔

سوال یہ ہے کہ حضرت ابو طالبؑ کے انتقال کے بعد بھی ہر ہر موقع پر ان کا ذکر خیر کیوں ہے؟ کیا یہ ان احسانات کا بدلہ نہیں ہے جو رسول اکرمؐ کی یاد سے کسی وقت بھی جدا نہیں ہو سکتے تھے۔

خدا ابوطالبؑ کا بھلا کرے ۔ یہ وہ کلمہ ہے جس میں مدح و ثنا کی خوشبو کے ساتھ اعتراف و اقرار کی طراوت بھی ہے ۔ رسول کریمؐ جانتے ہیں کہ اگر آج ابوطالبؑ زندہ ہوتے تو اس واقعہ کو دیکھ ضرور خوش ہوتے ۔

خدا ابوطالبؑ کا بھلا کرے کس کی طرف سے ؟ رسولِ اسلامؐ کی طرف سے جس کیلئے غیر مستحق کی مدح ناجائز بلکہ خلاف شان ہے ۔ یہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ استغفار کا بھی ضمیمہ ہو جاتا ہے ۔ کیسا استغفار ؟ وہ استغفار جو رسولِ اکرمؐ کی زبان پر غیر مومن کیلئے آ ہی نہیں سکتا ۔

حضرت ابوطالبؑ کے احسانات کا ایک بدلا یہ بھی تھا کہ ان کی اولاد کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے ۔ اس لیے کہ یہ اسلام کا ایک قانون ہے اور رسولؐ سے بہتر اپنے قوانین و احکام پر عمل کرنے والا کون ہوگا ؟

چنانچہ آپ نے ایک دن حضرت علیؑ سے خطاب کیا :

"میری جگہ کا تم سے زیادہ حقدار کوئی نہیں ہے ۔ تم اسلام میں سابق مجھ سے قریب ، فاطمہؑ کے شوہر ہو اور ان سب سے پہلے یہ کہ تمھارے باپ ابوطالبؑ نے روز اوّل سے میری امداد کی ہے ۔ میں چاہتا ہوں کہ اُن کی اولاد میں اُن کے حقوق کی رعایت کر دوں [۱] "

رسولِ اکرمؐ کی نظر میں وقتِ نزولِ وحی سے لے کر آخری دم تک ابوطالبؑ کی نصرت و یاد کس قدر قیمت رکھتی ہے کہ آپ اس کو بھی دلیل جانشینی قرار دے رہے ہیں اور اسی کی بنا پر منزلِ نبوت کی نیابت حوالے کر رہے ہیں ۔

اب چونکہ باپ کے حقوق کی رعایت اولاد کے بارے میں ضروری ہے اور علیؑ ہی شرائط امامت و خلافت کے جامع ہیں لہٰذا انھیں کو یہ حق دیا جا سکتا ہے ۔

۱: ینابیع المودۃ ج ۲ ص ۱۴۱ غایۃ المرام ص ۲۹ ۔ الغدیر ج ۷ ، ۳۸۷ - ۳۸۸ وغیرہ

ایک مرتبہ عقیل سے خطاب کرتے ہیں :

"اے ابومسلم میں تم سے دوہری محبت کرتا ہوں ایک اپنی قرابت کی بنا پر اور ایک اس لیے کہ چچا تمھیں بہت چاہتے تھے[1]"

اللہ اللہ! رسول کو چچا سے کتنی محبت تھی کہ عقیل سے صرف قرابت کی بنا پر محبت نہیں فرماتے بلکہ اس لیے بھی محبت کرتے ہیں کہ چچا کو اُن سے محبت تھی۔ اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ اپنا محبوب بھی محبوب اور چچا کا محبوب بھی محبوب! ارباب انصاف! کیا محبت کی اس سے بلند بھی کوئی منزل ہو سکتی ہے؟

بدر کا معرکہ ہے حق و باطل، توحید و شرک کی فیصلہ کن جنگ اپنے آخری نکتے پر پہنچ چکی ہے۔ لشکر اسلام کی جانب سے جہاد کرنے کے لیے ابو عبیدہ بن الحرث بن عبد المطلب میدان میں نکل چکے ہیں۔ عتبہ بن ربیعہ یا شیبہ کے حملے سے پائے مبارک کٹ چکے ہیں۔ اللہ کی دو تلواریں علی و حمزہ میدان میں کھنچی ہوئی ہیں۔ ابو عبیدہ کے پیروں سے خون بہہ رہا ہے لیکن اس کے باوجود ایک مرتبہ آنکھیں کھولتے ہیں اور ضعیف و نحیف آواز سے کہتے ہیں :

"اے خدا کے رسول! کاش آج ابو طالبؑ زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ ان کے کلام کی کس طرح تصدیق ہو رہی ہے۔ بیشک انھوں نے سچ کہا تھا کعبہ کی قسم ہم محمدؐ کو اس وقت تک تمھارے حوالے نہیں کر سکتے جب تک کہ شمشیر زنی اور نیزہ بازی کا ایسا مظاہرہ نہ ہو جائے جس میں ہم سب ہلاک ہو جائیں اور اپنے بیوی بچوں سے بالکل غافل ہو جائیں۔"

ابو عبیدہ کی آواز کان میں آئی اور دل تڑپ گیا۔ چچا کی تصویر آنکھوں میں پھرنے لگی۔

---

(۱) استیعاب ج ۲ ص ۱۵۳، الحدیدی ج ۳ ص ۳۱۲، الحجۃ ص ۳۳۱، تذکرۃ الخواص ص ۵۱، نجم القبور ص ۲۰۲، الغدیر ج ۷، ص ۳۸۵۔

اللہ زبان پر حضرت ابوطالب اور ابو عبیدہ کیلئے استغفار کے کلمات جاری ہو گئے[1]

اسی دن کا یہ واقعہ بھی ہے کہ جب جنگ کا فیصلہ ہو گیا، کفر کا لشکر ہزیمت کھا کر بھاگ گیا تو رسول اکرمؐ نے پڑی ہوئی لاشوں پر ایک نظر دوڑانا شروع کی، کیا دیکھتے ہیں کہ ان میں ان کی لاشیں بھی ہیں جو آپ کے خلاف آتشِ جنگ بھڑکانے میں پیش پیش تھے۔ یہ منظر دیکھا اور پہلو کی طرف نظر ڈالی۔ ابوبکر پر نظر پڑ گئی۔ فرمانے لگے کاش آج ابوطالبؑ زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ ہماری تلواروں نے برابر کے پہلوانوں کو کس طرح ختم کیا ہے۔

اس بیان میں حضرت ابوطالب کے اس قصیدہ کی طرف اشارہ ہے جس میں آپ نے کفار کو یہی چیلنج دیا تھا اور اسی انداز سے دھمکی دی تھی[2]

ایک موقع ایسا بھی آتا ہے جب عباس رسول اکرمؐ سے سوال کرتے ہیں :
"یا رسول اللہ! کیا آپ کو ابوطالب کے بارے میں کوئی امید ہے ؟"
آپ نہایت ہی اطمینان و سکون کے ساتھ فرما دیتے ہیں :
"میں اپنے پروردگار سے ہر خیر کی امید رکھتا ہوں"[3]

رسول اکرمؐ کی زبان سے نکلے ہوئے یہ کلمات بھی سند صحیح کے ساتھ نقل کیے گئے ہیں کہ جب قیامت کا دن ہو گا تو میں اپنے باپ، ماں، چچا ابوطالبؑ اور ایک جاہلیت کے بھائی

۱: الحدیدی ج ۳ ص ۳۱۲ ۔ ج ۱ ص ۳۰ الحجہ ص ۲۰ شرح الاخبار ص ۴۸ بحار ج ۶ ص ۵۹۵

۲: آغانی ج ۱ ص ۲۸ الغدیر ج ۱ ص ۳۴۷ ج ۲ ص ۲ الحدیدی ج ۳ ص ۳۰۹

۳: الحدیدی ج ۳ ص ۳۱۱ الحجہ ص ۱۵ تذکرۃ الخواص ص ۱۰ معجم القبور ج ۱ ص ۱۹۰ الغدیر ج ۷ ص ۳۷۸ ص ۳۸۰ اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۳۶

کی شفاعت کروں گا۔

اگرچہ اس حدیث کے الفاظ و عبارات مختلف ہیں لیکن سب کا مفاد و مطلب ایک ہی ہے[1]

ان تمام احادیث کے بعد ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہم اس ناصرِ رسول کے ایمان کا اعتراف کریں۔ رسولؐ جب ذکر کرتے ہیں تو مدح و ثنا کے ساتھ، جب یاد کرتے ہیں تو جزائے خیر کے ساتھ، جب دعا کرتے ہیں تو رحمت و مغفرت کے لیے۔ حالانکہ یہ وہ رسول ہے جو جذبات و خواہشات کا تابع نہیں ہے، اس کا معاملہ صرف اعمال پر ہوتا ہے۔ اگر خیر ہے تو خیر اور شر ہے تو شر!

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ معاذ اللہ حضرت ابوطالبؑ مسلمان نہ تھے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ رسولِ اکرمؐ نے ان تمام آیات کی مخالفت کی جن میں کافر کے لیے استغفار سے روکا گیا تھا مثلاً:

ا: لا تجد قوماً یؤمنون باللّٰہ والیوم الآخر یوادون من حاد اللّٰہ ورسولہ ولو کانوا آباءھم واخوانھم او عشیرتھم ـــ اولٰئک کتب فی قلوبھم الایمان . . .

"اللہ اور قیامت پر ایمان لانے والا انسان دشمنِ خدا و رسول سے دوستی نہیں رکھ سکتا خواہ اُن کے درمیان کیسی ہی قرابت کیوں نہ ہو اور خواہ ان کے تعلقات کتنے ہی استوار کیوں نہ ہوں۔"

قرآن کریم کی نظر میں ایمان اور کافر کی دوستی دو متضاد چیزیں ہیں جن کا اجتماع ایک دل میں محال ہے۔ علامہ زمخشری فرماتے ہیں:

---

[1] الحدیدی ج ۳ ص ۳۱۱ تفسیر علی بن ابراہیم ص ۳۵۵ ۔ ۹ ۳ سابقہ ص ۳ سے العذیر ج ۷ ص ۳۶۹ ۔ ۳۸۲

قرآن کریم نے ایمان کے ساتھ مشرکین کی دوستی کو محال قرار دیا ہے مطلب یہ ہے کہ کسی مسلمان کو ایسا نہ ہونا چاہیے بلکہ اعداء دین سے سختی کے ساتھ عداوت ہونی چاہیے کسی وقت بھی ان کے ساتھ تعلقات نہ ہونے چاہئیں چاہے وہ باپ یا بھائی ہی کیوں نہ ہوں۔ اس لیے کہ اہلِ ایمان اللہ کی گروہ میں ہیں اور کفار شیطان کی گروہ میں۔ درحقیقت اخلاصِ حقیقی یہی ہے کہ اللہ کے دوستوں سے دوستی ہو اور اللہ کے دشمنوں سے دشمنی![1]"

اس کے بعد علامہ موصوف نے رسولِ اکرمؐ کی ایک دعا نقل کی ہے:

"خدایا کسی فاسق وفاجر کا احسان میرے سر پر نہ رکھنا اس لیے کہ میرے پیشِ نظر آیت ہے: لاتجد قوما الخ[2]"

مجمع البیان میں نقل کیا گیا ہے کہ کفار کی دوستی ایمان کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔

ب: یاایها الذین امنوا لاتتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء تلقون الیهم بالمودة۔

(اے اہلِ ایمان دشمنِ دین وایمان کو اپنا دوست نہ بناؤ، نہ ان سے مدد مانگو اور نہ ان کی مدد کرو)

ج: یاایها الذین امنوا لاتتخذوا اٰبائکم واخوانکم اولیاء ان استحبوا الکفر علی الایمان ومن یتولهم منکم فاولئک هم الظالمون الخ

اس آیہ مبارکہ میں ماں باپ اور بھائی جیسے رشتہ داروں سے بھی قطع تعلق کا حکم

---

۱ اور ۲: کشاف ج ۴ ص ۴۹۶ تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۳۳۰

دیا گیا ہے۔ اگر وہ ایمان سے اپنے رشتہ کو قطع کرلیں حالانکہ باپ تربیت کے اعتبار سے خالقِ مجازی کا درجہ رکھتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب ایسے لوگوں کی محبت انسان کو ظالم بنا دیتی ہے تو باقی کا کیا ذکر ہے!

اس کے بعد کی آیت میں ایک حتمی فیصلہ کیا گیا ہے یا تو ماں باپ کو چھوڑ کر اللہ کی طرف متوجہ ہوں یا پھر امر الہیٰ کا انتظار کریں۔ اس لیے کہ یہ لوگ فاسق و فاجر ہیں۔

علامہ زمخشری رسولِ اکرمؐ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ:

"کوئی شخص بھی اس وقت تک ایمان کے لطف سے آشنا نہیں ہو سکتا جب تک اللہ کی خاطر محبت اور اسی کی خاطر عداوت نہ رکھے۔ اللہ کے لیے دُور والوں کو دوست اور اسی کے لیے قریب والوں سے نفرت کرے

یہ وہ شدید ترین آیت ہے جس سے سخت قرآن کی کوئی آیت نہیں ہے اس لیے کہ آیت عامۃ الناس کی امورِ دین میں سہل انگاری اور ان کے ضعیف عقیدہ کی حکایت کر رہی ہے۔ اب بڑے بڑے مدعیانِ ایمان و تقویٰ کو بھی چاہیے کہ آیت کے معیار پر اپنے نفوس کو پرکھیں اور دیکھیں کہ ان کے دل میں حب اللہ اور بغض اللہ کے جذبات کس حد تک پائے جاتے ہیں۔ مجمع البیان میں ہے:

"دین کا معاملہ نسب پر مقدم ہے۔ جب ماں باپ سے قطع تعلق واجب ہے تو باقی لوگ کس شمار میں ہیں۔ حسن کا قول ہے کہ جو شخص مشرک سے دوستی کریگا وہ خود بھی مشرک ہو جائیگا"

۵: یاایھا الذین اٰمنوا من یرتد منکم عن دینہ فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم ویحبونہ اذلۃ علی المومنین اعزۃ

۱: کشاف ج ۲ ص ۱۰۱

علی الکافرین۔

۵: ولو کانوا یؤمنون باللّٰہ والنّبی وما انزل الیہ ما اتخذوھم اولیاء ولکن کثیرا منھم فاسقون ○

پہلی آیت نے ایمان کی شرائط میں باہمی دوستی، یکجہتی اور یگانگت کو شمار کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان کو متحد و متفق رہنا چاہیے تاکہ ان کی مثال ایک ایسی جماعت کی ہو جس کی ہر خشت دوسرے کی محتاج اور مددگار ہے۔

اس کے بعد پوری قوت طاقت اور صلاحیت کا مصرف کفار و مشرکین کے مقابلے میں ہونا چاہیے تاکہ وہ اسلامی وحدت کو تباہ و برباد اور مسلمانوں کے شیرازہ کو منتشر نہ کرسکیں مجمع البیان میں ہے کہ:

"آیت مبارکہ میں اذلہ سے مراد ذلیل ہونا نہیں ہے بلکہ آپس میں نرمی سے سلوک کرنا ہے۔ چنانچہ ابن عباس کہتے ہیں کہ اہل ایمان کا باہمی سلوک اسی طرح ہوتا ہے کہ جس طرح بیٹے کا سلوک باپ کے ساتھ یا غلام کا آقا کے ساتھ اور پھر یہ سب کافر کے مقابلے میں اسی طرح ہوتے ہیں جس طرح شکار کے لیے درندہ ۱"

دوسری آیت نے کفار کے دوستوں سے ایمان ہی کی نفی کردی ہے اور یہ بتادیا ہے کہ یہ لوگ اس جرم کی پاداش میں غضب الٰہی، عذاب خداوندی اور ذلت دائمی کے مستحق ہیں۔ اور ان میں اکثر تو فاسق و فاجر ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مشرکین سے واقعی دوستی خود نفاق کی ایک دلیل ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ واقعاً اہل ایمان نہیں ہیں بلکہ اپنے کفر و نفاق پر باقی ہیں آیت مبارکہ میں ان کے فاسق کہے جانے کی دو علتیں بیان کی گئی ہیں:

۱: یہ لوگ امر الٰہی سے خارج ہوگئے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ بات لفظ کفر سے حاصل نہیں ہوتی

۱: کشاف ج ۱ ص ۵۲

۲ : یہ لوگ کفر میں فاسق یعنی سرکش ہیں لہٰذا اس مقام پر تنہا فسق مراد نہیں بلکہ وہ فسق جو کفر کے بارے میں ہوتا ہے یعنی انتہائی سرکشی اور بغاوت[1]!

---

۱ : محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم

مفسرین کرام نے اس آیت کے ذیل میں حسن کا یہ قول درج کیا ہے :

" مسلمانوں میں کفار سے اجتناب کا ملکہ اتنا زیادہ ہوگیا تھا کہ ان کے کپڑوں کو اپنے کپڑوں سے اور ان کے جسموں کو اپنے جسموں سے مس نہ ہونے دیتے تھے۔"[2]

علامہ زمخشری فرماتے ہیں :

" مسلمانوں کا ہر دور میں فرض ہے کہ اس تشدد کا بھی خیال رکھیں اور اس نرمی کا بھی لحاظ رکھیں ، اپنے بھائیوں کی حمایت کریں اور اپنے مخالفین پر سختیوں سے کام لیں[3]

---

۱ : مجمع البیان ج ۷ ص ۱۷۱ ۲ : مجمع البیان ج ۲۶ ص ۸ ۳ : کشاف ج ۲ ص ۱۱۵

۳ : درحقیقت اسلام نے یہ تشدد اور یہ سخت گیری ہر غیر مسلم کیلئے روا نہیں رکھی ہے اس لیے کہ انھیں غیر مسلمین میں سے اہل کتاب اور اہل ذمہ بھی ہیں جن کے حفظ نفس و مال و آبرو کے احکامات و تعلیمات اسلامی شریعت میں بکثرت پائے جاتے ہیں بلکہ یہ تمام تشدد آمیز قوانین صرف ان اشخاص کیلئے ہیں جو قوانین جزیہ کے قائل اور پابند نہ ہوں بلکہ اپنی سرکشی پر اڑے ہوئے ہوں۔ اس کے علاوہ اہل ذمہ اور دیگر کفار میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ اہل ذمہ صاحبان کتب ہیں یہ توحید کا ایک مفہوم رکھتے ہیں اور مشرکین توحید کے قائل نہیں ہیں اور کفار اصل وجود خدا ہی کے منکر ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے ساتھ تشدد آمیز سلوک ہی ہونا چاہیے یہ بھی یاد رہے کہ حضرت ابوطالبؑ اہل کتاب میں سے نہیں ہیں لہٰذا مسلمانوں کے خیال کے مطابق ان کو ان آیات کے مفاد میں داخل ہونا چاہیے۔ استغفر اللہ ! (مترجم)

لیکن افسوس کہ آج مسلمانوں کا طرز عمل اس کے بالکل برعکس ہو گیا۔ کل تک آپس میں ایک دوسرے پر مہربان تھے اور آج دشمنوں کے ساتھ مہربانیاں ہیں۔ ان کے ساتھ حسن سلوک ہے۔ اور آپس میں صرف سختیاں ہیں، تشدد ہے، ایک دوسرے کی عداوت ہے۔ ہر ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہے۔ ہر شخص دوسرے بھائی کو دشمن کے سامنے لقمۂ اجل بنا کر پیش کرنے کی فکر میں ہے۔ وطن و مذہب سے خیانت ہو رہی ہے۔ استعماری اذہان سے محبت و اخلاص کا اظہار ہو رہا ہے مشرق و مغرب کو اپنے سروں پر مسلط بنایا جا رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انھیں اسی دنیا میں ان کے اپنے اعمال کی پاداش مل رہی ہے اور یہ اپنے کیے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

افسوس صد افسوس ریسمانِ اتحاد ٹوٹ گئی۔ وحدتِ اسلامیہ پارہ پارہ ہو گئی۔ اختلافات کی آگ بھڑک اٹھی اور خرمنِ اتحاد خاکستر ہو گیا۔

آمدم برسرِ مطلب۔ ہمارا ان چند آیتوں کو بطور نمونہ پیش کرنے سے مطلب یہ تھا کہ ہم ان کے مفاہیم و مقاصد پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور پھر دیکھیں کہ کیا ان تعلیمات و احکام والے نبی کیلئے جائز ہے کہ وہ ایک مشرک یا کافر پر صرف اس لیے رحم کرے کہ ان کا رشتہ دار ہے اور اس طرح اپنی تمام تعلیمات پر پانی پھیر دے!

کیا یہ ممکن ہے کہ رسولِ اکرمؐ ایک غیر مسلم انسان کے احسانات و مجاہدات کو قبول کریں جبکہ آپ کی دعا یہ ہے کہ خدایا کسی کافر کا ممنونِ کرم نہ بنانا۔ اس لیے کہ احسان و اعانت سے دل میں جذبۂ تشکر پیدا ہوتا ہے اور جذبۂ شکر ایک گہری محبت کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

کیا یہ تمام باتیں اس زجر و توبیخ، وعد و وعید، ترہیب و تخویف کے منافی نہیں ہیں جنھیں ان آیات میں استعمال کیا گیا ہے۔ اب تو صرف یہی صورت ممکن ہے کہ ہم رسولِ اسلامؐ کو اپنے قوانین سے منحرف اور اپنے دستور کا مخالف تصور کر لیں۔ اور مومنِ قریش

حضرت ابوطالبؑ کے کفر کا قول اختیار کریں۔ تاکہ ان کی نصرت و امداد، حفاظت و رعایت اور حمایت و نگرانی کسی داخلی الجھن کا باعث نہ بن سکے۔

ورنہ ان احسانات و الطاف کے اعتراف کے بعد اس ذکرِ خیر، ثنائے دوام، تعظیم عظیم اور احترام شدید کے بعد کفر کا قول اختیار کرنا ایک غیر ممکن سی بات ہے۔

پھر یہ تمام باتیں ان اقوال و اعترافات سے قطع نظر کرکے ہو رہی ہیں جن میں حضرت ابوطالبؑ نے اپنے اسلام، ایمان، عقیدہ اور جذبات کا اظہار فرمایا ہے اور جو آج تک تاریخ کے صفحات اور زمانہ کے اوراق پر نورِ ایمان کی روشنائی اور ضیائے یقین کی شعاعوں سے تحریر ہیں۔
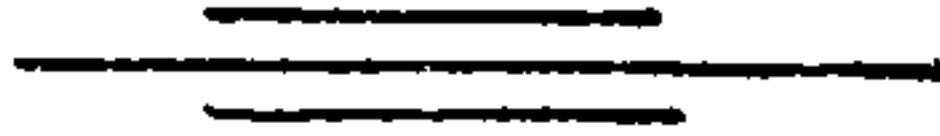
حضرت علیؑ کی زبان پر

جب ہم حضرت ابوطالب کے ایمان کا جائزہ اُن کے فرزند امیرالمومنینؑ کے کلمات کی روشنی میں لینا چاہتے ہیں تو ہمیں ہر تذکرہ خیر ادلۂ ایمان سے معمور اور ان کی ہر یاد براہینِ عقیدہ سے مملو نظر آتی ہے۔

ادھر باپ کی آنکھیں بند ہوتی ہیں اور اُدھر رسول اکرمؐ کی خدمت میں پہنچ جاتے ہیں تاکہ تجہیز و تکفین کے دستور و تعلیمات معلوم کریں اور جب رسول اکرمؐ ان تعلیماتِ اسلامیہ کو بیان کر دیں تو انھیں کے مطابق تجہیز و تکفین کی جائے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا یہ طریق و سلوک تجہیز و تکفین غیر مسلم کے جنازہ کے ساتھ جائز ہے؟

پھر یہ دیکھتے ہیں کہ رسول اکرمؐ بھی باپ کے جنازہ میں اس شان سے شریک ہیں کہ زبانِ مبارک پہ ذکر خیر ہے اور آنکھوں سے سیلِ اشک رواں پھر جیسے جیسے دن گزرتے جاتے ہیں حالات ناساز گار ہوتے جاتے ہیں ویسے ہی ویسے رسول اکرمؐ کیلئے ابوطالبؑ کی یاد زیادہ ضروری ہوئی جارہی ہے۔ اب علیؑ کی نظروں میں باپ کی تصویر پھرتی رہتی ہے۔ وہ اُن کے مواقف، وہ اُن کے مجاہدات، وہ ان کی شانِ حمایت و رعایت، وہ ان کا طرزِ اعلان و تحفظ!

یہ خیالات دل میں آتے ہیں اور آنکھوں سے ایک سیلاب جاری ہوتا ہے دل میں خارِ غم کھٹکنے لگتا ہے اور زبانِ الم ترجمان پر یہ اشعار آجاتے ہیں۔

ابا طالب! عصمة المستجیرا وغیث المحول ونور الظلم
فقد فقدک اهل الحفاظ فصلی علیک ولی النعم

ولقاک ذ ربک رضوانہ   فقد کنت للمصطفیٰ خیر عم[1]

اے پناہ گزینوں کے پناہ دینے والے، اے ابر کرم، اے نور ظلمات ابو طالب
آپ کی موت نے دل توڑ دیے اللہ آپ پر رحمت نازل کرے۔
خالق آپ کو اپنی رضا سے سرفراز کرے۔ آپ تو حضرت رسول اکرمؐ
کے بہترین چچا تھے۔

زمانہ گزر رہا ہے۔ بنی امیہ اپنے مظالم اور اپنی سیاہ کاریوں میں مشغول ہیں روایتیں وضع ہو رہی ہیں اور حضرت علیؑ ان اڑتی ہوئی چنگاریوں کو دیکھ رہے ہیں، ایک دن وہ بھی آ گیا جب آپ رحبہ میں ایک مجمع کے درمیان تشریف فرما تھے اور ایک شخص کھڑا ہو کر کہتا ہے۔ یا امیر المومنینؑ آپ کا مرتبہ یہ ہے اور آپ کے والد جہنم میں! یہ سنتا تھا کہ چہرہ کا رنگ بدل گیا غیظ و غضب کے آثار ابھرے، افسوس بنی امیہ ایسے ننگ انسانیت اعمال پر اتر آئے ہیں۔ اب مرنے والے پر بھی مظالم ڈھائے جا رہے ہیں جبکہ وہ موت کی حفاظت اور دوام بقا کی آغوش میں ہے۔ اب تو زندگی کی قدر دانی میں صرف اس کا ذکر خیر اور اس کی مدح و ثنا ہے۔ کیا ان کا ارادہ ہے کہ اس تذکرہ کو بھی مردہ بنا دیں۔ کیا یہ چاہتے ہیں کہ روایات وضع کر کے حق کی نورانیت اور اس کی پاکیزگی کو بھی بدنما اور داغدار بنا دیں۔ یہ سوچا اور ایک مرتبہ تڑپ کر فرمایا:

"خاموش خاموش خدا تیرا برا کرے۔ محمدؐ کو نبی بنانے والے کی قسم اگر میرا باپ تمام روئے زمین کے انسانوں کی شفاعت کرنا چاہے تو اللہ قبول کر لیگا۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ بیٹا قسیم النار والجنۃ ہو اور باپ جہنم میں ہو۔ قیامت کے دن

---

[1] الحجۃ ص۱۲۲ تذکرۃ الخواص ص۱۱، شیخ الابطح ص۵، مجمع العقبور ج ا ص۱۰۲، الغدیر ج ۳ ص۹۹، ج ۷ ص۲۷۹، ۳۸۹۔ اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص۱۴۰۔

ابوطالب کا نور سوائے انوارِ خمسہ کے تمام انوار پر غالب آجائیگا۔[1]

ظاہر ہے کہ جس کا مرتبہ اتنا بلند ہو کہ خالق نے اسے قسیم نار و جنت بنایا ہو۔[2] اس کی شرافت و نجابت کو کس درجہ بلند ہونا چاہیے۔ کیا اس کے سلسلۂ نسب میں غیر مومن کافر اور غیر موحد کوئی ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں!

ایک بیٹے اور ایسے باعظمت بیٹے کے لیے کس قدر بے عقلی کی بات ہے کہ اس کا باپ غیر مومن اور شرک سے ملوث ہو۔ درحقیقت یہ ایک ایسی بات ہے جو بیٹے کے حیثیت کو کم کر دیتی ہے۔ اس کی عظمت کو گھٹاتی اور منزلت کو گرا دیتی ہے۔

کبھی فرماتے تھے: خدا کی قسم میرے باپ، میرے جدِ امجد عبدالمطلب، ہاشم اور عبدمناف نے کبھی کسی بت کے سامنے پیشانی نہیں جھکائی۔ سوال یہ ہے کہ پھر کس کی عبادت کیا کرتے تھے۔ درحقیقت یہ لوگ دینِ ابراہیمی کے پیرو تھے اور بیتِ خدا کی طرف نماز ادا کیا کرتے تھے![3]

ابوطفیل عامر بن واثلہ نے حضرت امیرؑ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جب میرے باپ کا وقتِ وفات قریب آیا تو حضرت رسولِ اکرمؐ تشریف لائے اور ان کے بارے میں مجھے ایک ایسی خبر دی جو دنیا و مافیہا کی ہر خبر سے بہتر تھی۔[4]

کبھی فرمایا کرتے تھے۔ خدا کی قسم ابوطالب بن عبدالمطلب ایک مردِ مومن و مسلمان تھے۔ یہ اور بات ہے کہ قریش کی اذیتوں کے خوف سے بنی ہاشم کے

۱: الحجۃ ص۱۵، تذکرۃ الخواص ص۱۱، شیخ الابطح ص۳۱، الغدیر ج۷، ص۳۸۵

۲: یہ روایت حضرت ابوبکر سے مروی ہے۔ الریاض النضرہ ج۲ ص۱۶۴ ۲۴۴

۳: الغدیر ج۷، ص۳۸۴، العباس ص۱۸، مرآۃ العقول ص۳۶۲، مجمع القبور ج۱ ص۲۰۰

۴: الحجۃ ص۲۳۔ الغدیر ج۷، ص۳۸۵

تحفظ کیلئے اس کا اظہار نہ کرتے تھے[1]

کبھی فرماتے تھے حضرت ابوطالبؑ کا اس وقت تک انتقال ہی نہیں ہوا جب تک کہ خدا کا رسول اس سے راضی نہیں ہو گیا۔[2]

حضرت امیرؑ کے یہ اقوال و ارشادات جن میں ایمانِ ابوطالبؑ کی واضح ظاہر شہادتیں اور بہی امیت کے جعل و فریب کی کھلی ہوئی تردیدیں پائی جاتی ہیں انھیں ایسے جذبات پر محمول نہیں کیا جا سکتا جنھیں واقعہ و حقیقت سے کوئی ربط نہ ہو۔

میرے خیال میں کوئی مسلمان بھی ایسا نہ ہو گا جو اتنی بڑی جرأت کر سکے۔ اور ان فرامین و ارشادات کو قرابت کے جذبات پر محمول کر سکے۔ اس لیے کہ یہ انداز فکر امام المسلمین علی ابن ابیطالب کی شخصیت پر کھلا ہوا حملہ ہے اور احادیث ارشادات نبویہ سے کھلم کھلا لبغاوت!

کیا وہ علیؑ کہ جس کے بارے میں نص پیغمبر علی مع الحق والحق مع علی یدور معہ حیثما دار موجود ہو وہ حق کو چھوڑ کر جذبات کی رو میں بہہ سکتا ہے

ہم رسول اکرمؐ کے ان تمام اقوال کو ہم بیان نہیں کرنا چاہتے جن میں امیر المومنینؑ کی شخصیت و عظمت کو ظاہر کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ آپ کی عظمت روز روشن کی طرح ظاہر اور آفتاب عالمتاب کی طرح واضح ہے۔

اگر کوئی شخص آپ کو جذباتی انسان کہتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ نبی کریمؐ کو بھی ایک جذباتی انسان مانتا ہے۔

۱: الحجۃ ص۲۷ ۔ الغدیر ج، ص ۳۸۹ معجم القبور ج ۱ ص ۲۰
۲: الغدیر ج، ص ۳۸۹ ۔ الحجۃ ص ۲۳ اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۳۶

اگر معاذ اللہ حضرت ابوطالب کی موت کفر پر واقع ہوتی تو امیر المومنینؑ کا فریضہ تھا کہ ان سے برأت و بیزاری کا اظہار کرتے۔ ان کی بے ایمانی کو عالم آشکار کرتے ہوئے ان سے تبرّا فرمایا کرتے۔

آپ کو یہ حق کسی صورت سے بھی نہیں تھا کہ دشمن خدا سے اظہار محبت اور کافر سے اظہار اخلاص کریں۔ یہ بات اللہ سے اخلاص کے خلاف تھی اور علیؑ جیسا مومن مخلص ایسا کام نہیں کر سکتا۔

لیکن یہاں تو معاملہ بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ باپ سے محبت ہی محبت ہے اخلاص ہی اخلاص ہے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؑ اپنے پدر بزرگوار کو ایمان کی اس منزل پر فائز جانتے ہیں جس منزل تک عام انسان کی رسائی غیر ممکن ہے۔ ورنہ کوئی بھی انسان عقیدہ کے مقابلے میں قرابتداری کا لحاظ کر سکتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ عقیدہ سے بڑا کوئی رشتہ اور دین و ایمان سے مستحکم کوئی قرابت نہیں ہوتی۔ یہی وہ قوت ہے جو ہر تند و تیز سیلاب کا مقابلہ کرتی ہے اور یہی وہ طاقت ہے جو ہر بڑے طوفان کو روک دیتی ہے۔

تاریخ اسلام ہمارے سامنے ہے۔ غزوۂ بنی مصطلق میں جب عبداللہ بن ابی بن سلول نے کچھ نفاق آمیز کلمات کہہ کر مسلمانوں میں افتراق پیدا کرنا چاہا تو اس کا بیٹا عبداللہ[۱] دوڑتا ہوا رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا۔ یا رسول اللہ میں نے سنا ہے کہ آپ میرے باپ کو قتل کرنا چاہتے ہیں اگر یہ صحیح ہے تو پھر آپ مجھے حکم دیں

۱: زمخشری کا کہنا ہے کہ عبداللہ کا نام حباب تھا، لیکن چونکہ حباب شیطان کا ایک نام ہے اس لیے آنحضرتؐ نے ان کا نام عبداللہ رکھ دیا تھا۔

میں اس کا سر لیکر آتا ہوں، کسی دوسرے کو اس خدمت پر مامور نہ کریں ایسا نہ ہو کہ کوئی دوسرا میرے باپ کو قتل کرے اور میں اس قاتل کو نہ دیکھ سکوں جذبات میں آکر اسے قتل کر ڈالوں اور اس طرح ایک مومن کا خون کر کے جہنم کا مستحق بن جاؤں

اللہ رے احتیاط و اخلاص! بیٹا یہ چاہتا ہے کہ باپ کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دے تاکہ اسلام کا مقصد بھی حاصل ہو جائے اور اپنے ایمان و عقیدہ پر حرف بھی نہ آنے پائے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی دوسرا قتل کرے اور فطرت بشریہ کی بنا پر جذبات میں آکر ایک مومن کا خون کر کے جہنم اور عذاب الٰہی کا مستحق بن جائے۔

اور کیا کہنا رسول اکرمؐ کے فضل و کرم کا کہ ابن ابی کو صرف اس کے بیٹے کے ایمان و اخلاص کی بنا پر چھوڑ دیا [۲]

اس واقعے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دینی جذبات اور ایمانی رجحانات قرابت کے احساسات پر ہمیشہ غالب رہتے ہیں۔

صفین کی فیصلہ کن جنگ ختم ہو چکی ہے۔ عدی بن حاتم اپنے بیٹے زید کے ساتھ قتل گاہ سے گزر رہے ہیں کیا دیکھتے ہیں کہ انھیں مقتولین میں سے ایک معاویہ کا فوجی زید کا ماموں بھی ہے۔ زید نے ماموں کی حالت دیکھی اور چیخنا شروع کر دیا میرے ماموں کا قاتل کون ہے۔ ایک شخص آگے بڑھا اور کہنے لگا میں اس کا قاتل ہوں۔ زید نے نیزہ سے مار کیا اور اُسے ہلاک کر دیا۔

۱: زمخشری نے نقل کیا ہے کہ جب عبداللہ بن ابی نے مدینہ میں داخلہ کا قصد کیا تو اسکے بیٹے نے اس کا راستہ روک دیا اور کہا کہ پہلے رسول اکرمؐ کی عزت اور اپنی ذلت کا اعتراف کر جب مدینہ میں داخلہ کا قصد کرو جب اس نے انکار کیا تو بیٹے نے بگڑ کر کہا کہ میں تمھاری گردن اڑا دونگا۔ باپ نے یہ دیکھ کر اپنی ذلت کا اعتراف کر لیا

۲: کامل ج ۲ ص ۱۳۱ طبری ج ۲ ص ۲۲۰ کشاف ج ۲ ص ۴۶۱ تفسیر علی بن ابراہیم ص ۶۸۰ مجمع البیان ج ۲۸ ص ۲۹۳

یہ دیکھا تھا کہ عدی بن حاتم نے زید کی طرف رُخ کیا اور نہایت ہی سخت لہجے میں خطاب کیا اے زن احمق کے بچے! اگر میں نے تجھے ان لوگوں کے حوالہ نہ کردیا تو گویا میں مسلمان ہی نہیں مگر افسوس کہ زید بھاگ کر معاویہ سے جا ملا اور معاویہ نے بھی نہایت ہی اکرام و احترام کے ساتھ اسکا استقبال کیا۔ عدی نے دیکھا کہ بیٹا ہاتھ سے نکل گیا ہے تو بددعا کیلئے ہاتھ اٹھا دیے۔ خدایا زید مسلمانوں سے الگ ہوکر ملحدوں سے مل گیا ہے اسے ایک ایسا تیر مار دے جو خطا نہ کرسکے۔ خدا کی قسم اب نہ میں اس سے بات کروں گا اور نہ اس کے ساتھ ایک چھت کے نیچے جمع ہوں گا۔

یہ ہے عقیدہ کا کرشمہ کہ عدی بن حاتم عقیدہ کی خاطر اپنے بیٹے کو موت کے گھاٹ اتار دینے پر آمادہ ہیں اور جب یہ ممکن نہیں ہوتا تو کم از کم بددعا کرتے ہوئے ضرور نظر آتے ہیں مسلمانو! کیا عدی کے سینے میں باپ کا دل نہ تھا؟!

جنگ صفین میں یہ واقعہ اپنی نوعیت کا منفرد نہیں بلکہ اسی قسم کا ایک واقعہ اور بھی پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ لشکر معاویہ سے ایک شخص مبارز طلبی کرتا ہوا نکلا، ادھر لشکر اسلام سے ایک مجاہد نکلا حق و باطل کی جنگ شروع ہوئی معرکہ تیز ہوا، بات آگے بڑھی دونوں گھوڑوں سے اتر پڑے عراق کا حق پرست شام کے باطل پرست کے سینے پر سوار ہوگیا، چاہا کہ خود ہٹا کر اسکا گلا کاٹے، کیا دیکھا کہ اسکا حقیقی بھائی ہے۔ ہاتھ اٹھتے اٹھتے رُک گیا لشکر اسلام نے آواز دی۔ جلدی کام تمام کر۔ اس نے جواب دیا۔ ارے

۱: مجھے یاد ہے کہ میں نے اس واقعہ کے نشانات الغدیر سے تعین کیے تھے لیکن اتفاق سے اس وقت مکمل حوالہ نوٹ نہ کرسکا تھا اور بعد تلاش بسیار نہ مل سکا۔ لہٰذا یہ بھی ممکن ہے کہ یہ واقعہ الغدیر کے دوسری کتاب ہی سے لیا گیا ہو۔ ویسے اس واقعہ کا تذکرہ کتاب صفین ص ۵۹۹ میں بھی موجود ہے، اور کامل ابن اثیر ج ۳ ص ۱۶۵ میں بھی ایک اشارہ ہے۔

یہ تو میرا بھائی ہے۔ آواز آئی اچھا چھوڑ دے لیکن کیا کہنا اخلاص کا، دل میں سوچنے لگا کیا خونی رشتہ ایمان پر بھی غالب آسکتا ہے! یہ سوچا اور پکارا اس وقت تک نہ چھوڑوں گا جب تک امیرالمومنینؑ اجازت نہ دے دیں۔ آپ نے فرمایا اچھا چھوڑ دو۔ ظاہر ہے کہ امیرالمومنینؑ کی طرف سے اگر یہ خصوصی اجازت نہ ہوتی تو ایک بھائی دوسرے بھائی کا کام تمام کر دیتا۔

تو کیا یہ مان لیا جائے کہ یہ راہِ خدا کے مجاہدین اس مجاہد اکبر سے زیادہ اسلام دوستی اور خوفِ خدا رکھتے تھے جس کی تلوار نے رؤسائے مشرکین کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اور جس کے بازوؤں کے بل بوتے پر اسلام کھڑا ہوا تھا۔

ہرگز نہیں! پھر کیونکر ممکن ہے کہ حق و باطل کا فیصلہ کن، حق کا ہمراز و دمساز، باطل کا جانی دشمن، اپنی زبان پر خلافِ توقع کلمات صرف اسلیئے جاری کرلے کہ جذبات دین سے مقابل ہو گئے ہیں۔

خدا کی قسم! اگر علیؑ کو اپنے باپ کے ایمان و عقیدہ پر یقین نہ ہوتا تو کبھی بھی مذمت کرنیوالوں کو منع نہ کرتے۔ بلکہ آپ بھی انہی کے ہم آواز اور ہم زبان ہوتے اس لیے کہ آپ حق کے ساتھی، حق کے تابع، حق کے رئیس ہونے کی حیثیت سے حق گوئی، حق بیانی اور حق ترجمانی کے زیادہ حقدار تھے۔

بھلا رسول اکرمؐ کے بعد علیؑ سے اوامر و نواہی، احکام و تعلیمات، قرآن کی پابندی کرنے والا اور کون ہوگا؟!

کیا یہ ممکن ہے کہ قرآن، دشمنِ خدا و رسول سے برائت اور قطع تعلق کا حکم دے اور علیؑ اس کی شان میں رطب اللسان رہیں۔ استغفراللہ! علیؑ جیسا مجسمۂ حق کبھی بھی قرآن کی مخالفت نہیں کرسکتا!

اس مقام پر امیر المومنینؑ کے وہ چند فقرات بھی قابلِ توجہ ہیں جو آپ نے صفین، کے موقع پر دوست و دشمن کو خطاب کر کے ارشاد فرمائے تھے، آپ فرماتے ہیں: ہم رسول اکرمؐ کے ساتھ میدانِ جنگ میں اپنے باپ، بھائی، چچا اور بیٹے سب سے جنگ کرتے تھے۔ اور اس جہاد سے ہمارے ایمان و عقیدہ میں زیادتی، صبر و تحمل میں اضافہ اور قوتِ جہاد میں صلابت پیدا ہوتی تھی۔

مسلمانوں کے دینی جذبات اور احقاقِ حق کے رجحانات کی صحیح ترجمانی یہی ہے کہ اگر خاندان تباہ ہوتا ہے تو ہو جائے۔ لیکن قرآنی دستور پر حرف نہ آنے پائے!
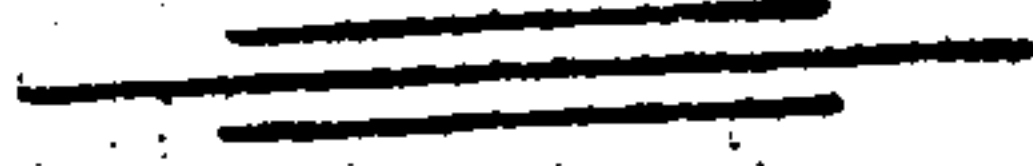
اہلبیتِ اطہار کی زبان پر

جب ہم سیرتِ اہلبیتِ اطہار کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں یہ صاف طور پر نظر آتا ہے کہ ان میں سے ہر امام اور ہر معصوم تہمت و افتراء کے اُن تمام قلعوں کو مسمار کر رہا ہے جو شیخ بطحا کے ایمان کو پوشیدہ کرنے اور حق کی رونق کو مٹانے کے لیے تیار کیے گئے ہیں تاکہ حق کی رونق و آبرو باقی رہ جائے اور باطل کی بنیادیں منہدم ہو جائیں حق کی آواز گونجنے لگے۔ اور باطل کے نعرے صدا بصحرا ہو جائیں!

جیسے جیسے باطل نے اپنے جعل و فریب میں اضافہ کیا ویسے ہی ویسے کلمۂ حق کی گونج بڑھتی گئی۔ قلب و جگر حرکت میں آ گئے۔ اور فضائیں نغمہائے ایمان سے معمور ہو گئیں۔

جیسے جیسے باطل کی تاریکیاں بڑھتی گئیں اور اوراقِ تاریخ سیاہ ہوتے گئے ویسے ہی ویسے ایمان کی شعاعوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہدایت کی کرنیں پھوٹتی رہیں تاکہ ظلمات کا دامن چاک کیا جائے اور گم کردہ راہ طالبِ حق کو اس کی حقیقی منزل تک پہنچا دیا جائے۔

ایک شخص جس کے کان باطل کی آوازوں سے بج رہے تھے۔ امام سجاد زین العابدینؑ سے سوال کیا کیا حضرت ابوطالبؑ مومن تھے؟ حضرتؑ نے فرمایا ہاں۔ اس شخص نے چاہا کہ ان تہمتوں کا سرچشمہ بھی معلوم کر لیا جائے جو ایمانِ ابوطالبؑ کے خلاف وضع کی گئی ہیں۔ عرض کی۔ بعض لوگ تو انھیں کافر سمجھتے ہیں۔

یہ سننا تھا کہ امام کا دل تڑپ گیا، ایک مظلومیت بھری آہ کھینچی اور فرمانے لگے تعجب بالائے تعجب، آخر یہ لوگ حضرتِ ابوطالبؑ پر تہمت رکھتے ہیں یا رسولِ اکرمؐ پر!

قرآن کریم نے متعدد آیات میں اس بات سے منع کیا ہے کہ کوئی مومن عورت کسی کافر کی زوجیت میں رہے۔ حالانکہ حضرت فاطمہ بنت اسد بلا شک و شبہ مومنہ بلکہ سابقات میں سے تھیں اور رسول اکرمؐ نے انھیں تا حیات حضرت ابوطالبؑ کی زوجیت سے جدا نہیں کیا۔[1]

امام سجادؑ کے بیان سے صاف طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ ایمانِ ابوطالبؑ پر اعتراض کرنا درحقیقت رسول اکرمؐ کی شخصیت پر اعتراض کرنے کے مرادف ہے کہ حضورؐ نے قرآن کریم کے مکرر حکم کو نافذ نہیں کیا۔ اور آخر تک یونہی ٹالتے رہے۔ قرآن کا منشا تھا کہ ایمان والا دل کفر کے زیر سایہ نہ رہے۔ اور معاذ اللہ رسول اکرمؐ حضرت ابوطالبؑ کی زندگی تک اس کی مخالفت ہی کرتے رہے۔ اس لیے کہ حضرت فاطمہ بنت اسد کے ایمان میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی۔ اور نہ ان کے خلاف یہ مصنوعی روایتیں وضع ہوئی تھیں۔ اور نہ کوئی مورخ آج تک اس بات کا قائل ہوا ہے کہ رسول اکرمؐ نے اس رشتہ زوجیت کو منقطع کر دیا تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اکرمؐ کی نظر میں حضرت ابوطالبؑ کا ایمان پوری طرح سے ثابت تھا ورنہ آپ کسی طرح بھی حکم قرآنی کی مخالفت نہ کرتے۔

حضرت ابوطالبؑ کے ایمان پر حملہ کرنا ایک اتنی بڑی جرأت چاہتا ہے جس میں خود رسول اکرمؐ بلکہ بنیادِ اسلام کو مقابل قرار دیکر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ معاذ اللہ رسول اکرمؐ بھی وحی الٰہی کی مخالفت کرتے تھے اور آپ کو بھی تعلیماتِ اسلامیہ اور احکام الٰہیہ کا مطلق خیال نہ تھا۔

اس کے بعد امام محمد باقرؑ کا دور آتا ہے۔ ایک شخص نے آپ سے اس حدیثِ مجہول کے بارے

---

(۱) الحجۃ ص۲۲۔ الحمید ی ج ۳ ص۳۱۲۔ الغدیر ج ۷ ص۳۸۱-۳۹۰۔ اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص۱۳۶۔ شیخ الابطح ص۱۳۴

سے سوال کرتا ہے:
"ابو طالب جہنم میں ہیں۔" (معاذ اللہ)
تو آپ فرماتے ہیں:
"اگر ساری دنیا کا ایمان ایک پلڑے میں رکھ لیا جائے اور حضرت ابو طالبؑ کا ایمان دوسرے پلڑے میں ابو طالبؑ کا پلہ بھاری رہے گا۔"

پھر فرماتے ہیں:
"کیا تجھے معلوم نہیں کہ حضرت امیر المومنینؑ اپنی زندگی میں حضرت عبداللہ، حضرت آمنہ اور حضرت ابو طالبؑ کی طرف سے حج کرنے کا حکم دیا کرتے تھے اور اپنے بعد کیلئے وصیت بھی فرما گئے تھے۔" [1]

مقصد یہ ہے کہ ابو طالبؑ کا ایمان عام انسانوں کے ایمان سے مختلف حیثیت رکھتا ہے۔ لوگوں کا ایمان تقلیدی ہو سکتا ہے لیکن ابو طالب کا ایمان عرفان و بصیرت کا نتیجہ تھا، لوگوں کا ایمان اپنے لیے ہوتا ہے اور ابو طالبؑ کا ایمان جہاد و دفاع اور نصرت و امداد کے لیے تھا۔

ظاہر ہے کہ ایک ایسے شخص کا ایمان جو ایک مرکزی شہر کا رئیس، ایک جوان حرب خاندان کا ذمہ دار، صاحب عظمت و جلالت اور مالکِ جاہ و حشم ہو بڑی عظمت رکھتا ہے جبکہ ایمان لانے والا یہ بھی جانتا ہو کہ ایمان قبول کرنے کے بعد نہ یہ جاہ و جلال رہے گا اور نہ یہ شان و عظمت، بلکہ ایک ایسے یتیم کی متابعت کرنا پڑے گی جو کل تک اپنی ہی آغوش میں پل رہا تھا۔

اس کے بعد امام نے امیر المومنین علیؑ کے طرز عمل سے استدلال کر کے یہ واضح

---

[1] معجم القبور ج ۱ ص ۱۸۹ الحجۃ ص ۱۱۵ شرح الابطح ص ۱۳ الغدیر ج ۷ ص ۳۹۰، ۳۹۱ اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۴۰ ابن ابی الحدید ج ۳ ص ۳۱۲ شرح النہج میں روایت علی بن محمد کی طرف منسوب ہے حالانکہ اصل محمد بن علی ہے۔

کر دیا کہ حج جیسا اہم فریضہ جو ارکانِ اسلام میں شمار ہوتا ہے کسی ایسے انسان کی طرف سے نہیں ہو سکتا جس کا اسلام سے کوئی رشتہ اور اس کے ارکان سے کوئی تعلق نہ ہو

حضرت امام جعفر صادقؑ کے اقوال وارشادات میں ایک ایسا ذخیرہ پایا جاتا ہے جسمیں آپؑ نے اپنے جدِ بزرگوار کی توصیف وتعریف اور مدح وثنا کی ہے اور ان افترا پردازاور جعلساز عناصر کی تردید فرمائی ہے۔

آپ کا دور وہ تھا جب بنی امیہ کے مظالم کا خاتمہ ہو رہا تھا اور ایک ایسی حکومت کی بنیاد پڑ رہی تھی جس کا ظاہری شعار حق کو اہل حق تک پہنچانا اور بنی ہاشم کی حمایت تھا۔ ظاہر ہے کہ اس نزاع کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ علویوں کی گردن سے کچھ عرصے تک یہ تلواریں ہٹ جائیں گی۔ ان کی زبانوں پر سے پہرے اٹھا دیے جائیں گے۔ ہادیانِ حق کو اتنا موقع مل جائیگا کہ وہ اپنے پیغام کو اقصائے دنیا تک پہنچا سکیں جب تک کہ برسرِ اقتدار آنے والی حکومت مستقر نہ ہو جائے اور دوبارہ مظالم کا سلسلہ شروع نہ ہو۔

حالاتِ زمانہ نے آپ کو اتنا موقع دے دیا کہ آپ اسلامی تعلیمات اور الٰہی احکام کو واضح کر کے حقانیت کی شعاعوں اور ہدایت کی کرنوں کو عالم کے ہر امکانی حصّے تک پہنچائیں۔ چنانچہ آپ نے اس سلسلے میں کافی حد تک اپنے جدِ محترم کے بارے میں بھی ارشادات فرمائے۔

کبھی کسی شخص نے سوال کر لیا کہ کیا ابوطالبؑ جہنّم میں ہیں؟ تو فرمایا کہ یہ جھوٹ ہے ایسی کوئی خبر جبریلِ امین نہیں لاتے! ابوطالبؑ کی مثال ان اصحابِ کہف کی مثال ہے جنھوں نے ایمان کو چھپایا اور شرک کو ظاہر کیا۔ اللہ نے ان لوگوں کو دہرا اجر عنایت کیا۔ حضرت ابوطالب نے بھی ایمان کو پوشیدہ رکھا،

اور شرک کو ظاہر کیا۔ اللہ نے ان کو بھی دُہرا اجر دیا ہے حضرت ابوطالبؑ دُنیا سے اس وقت تشریف لے گئے ہیں جب انھیں جنّت کی بشارت دیدی گئی ہے۔

اس کے بعد نہایت ہی تعجب کے ساتھ فرمایا آخر یہ کیسی باتیں ہیں؟ ابوطالبؑ کے انتقال کی شب جبریلِ امین یہ وحی لیکر آئے تھے کہ اے محمدؐ! اب مکّہ سے نکل چلو، اب یہاں تمھارا کوئی مددگار نہیں ہے[1]۔

امام صادقؑ کے اس کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب ابوطالبؑ کو اللہ تعالیٰ نے دُہرا اجر و ثواب عطا کیا ہے، صرف اس لیے کہ انھوں نے مصلحتِ وقت کا لحاظ کرتے ہوئے اپنے ایمان کو مخفی رکھا اور کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا یعنی اگر ایک طرف ایمان کا اجر و ثواب ہے تو دوسری طرف اس تقیہ و پردہ داری کا اس لیے کہ ایمان کا مخفی رکھ لینا اور اس کا کسی پر ظاہر نہ ہونے دینا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے

اس کے بعد آپ نے اصحابِ کہف کی مثال دیکر یہ واضح کر دیا کہ تقیہ پر دُہرا اجر ملنا کوئی نئی بات نہیں ہے اور حضرت ابوطالبؑ کا تقیہ میں زندگی گزار دینا بھی تاریخ کا کوئی انوکھا حادثہ نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے نصِ قرآنی کے بموجب اصحابِ کہف میں یہ تمام باتیں ہو چکی ہیں۔

امامؑ کا یہ فرمانا کہ پروردگارِ عالم نے ابوطالبؑ کو دُنیا ہی میں جنّت کی بشارت دیدی تھی، بہ ظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے لیکن یہ تعجب اس وقت ختم ہو جاتا ہے جب ہمارے سامنے ایک ایسی حدیث[2] پیش کی جاتی ہے جس میں جنّت کی بشارت کا تذکرہ ہے اور اس میں ایسے نام شمار کرائے گئے ہیں جن کو جہاد، نصرت، قربانی

۱: الحجہ ص۱۱۵ ۔ الحدیدی ج ۳ ص۳۱۲ ۔ الغدیر ج ۷ ص۳۹۱ ۔ معجم القبور ج ۱ ص۱۹۱
اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص۱۳۶

۲: عشرۂ مبشرہ کی طرف اشارہ ہے۔ (جوادی)

دفاع اور امدادِ دین میں حضرت ابوطالب سے کوئی نسبت نہ تھی۔

اس کے بعد امامؑ اپنے دعوے کو ایک مستحکم دلیل سے مضبوط بناتے ہیں جس کا مضمون یہ ہے کہ ایک انسان کے مرتے ہی نبوت کا سکون و قرار مٹ جائے۔ وحی الٰہی کو یہ کہہ کر مکہ سے نکلنے کا حکم دینا پڑے کہ اب تمھارا کوئی مددگار نہیں رہا اسے کسی طرح بھی کافر نہیں کہا جا سکتا۔

ایک مرتبہ امام جعفر صادقؑ نے یونس بن نباتہ سے سوال کیا۔ یونس! لوگوں کا حضرت ابوطالب کے بارے میں کیا خیال ہے؟ عرض کی لوگ کہتے ہیں کہ وہ جہنم میں ہیں اور اُن کا مغز سر اُبل رہا ہے۔

آپ نے غصے میں آکر فرمایا۔ یہ دشمنِ خدا جھوٹے ہیں۔ ابوطالبؑ انبیاء و صدیقین، صلحاء شہداء کے ساتھ ہیں اور ان حضرات سے بہتر کوئی رفیق ممکن نہیں ہے[1]۔

ایک مرتبہ ایک شخص نے سوال کر لیا کہ لوگ ابوطالب کو کافر خیال کرتے ہیں۔

آپ نے فرمایا یہ جھوٹے ہیں کیا وہ بھی کافر ہو سکتا ہے جس کا یہ قول ہو

ألم تعلموا انا وجدنا محمداً — نبیاً کموسیٰ خط فی اول الکتب[2]

"ہم نے محمدؐ کو موسیٰ کی طرح نبی برحق پایا ہے"

کبھی فرماتے تھے آخر ابوطالب کیسے کافر ہو سکتے ہیں جن کا قول یہ ہے:

لقد علموا ان ابننا لا مکذب — لدینا ولا یعبا بقول الاباطل

وابیض یستسقی الغمام بوجهه — ثمال الیتامیٰ عصمة للارامل[3]

دنیا جانتی ہے کہ میرا فرزند نہ غلط گو ہے اور نہ دروغ بیان

وہ ایسا مبارک ہے جس کے طفیل میں بارش ہوتی ہے۔ وہ یتیموں اور بیواؤں کا والی و وارث ہے

۱: الحجہ ص۱۷، شیخ الابطح ص۳۲، الغدیر ص۳۹۴   ۲: الغدیر ج۷، ص۳۹۲

۳: الغدیر ج۷، ص۳۹۲

مقصد یہ ہے کہ وہ انسان کس طرح کافر فرض کیا جاسکتا ہے جو محمد کو نبی، صادق با برکت فیاض، والی ایتام، وارث بیوگان اور ایک وجیہ و شکیل شخصیت تسلیم کرتا ہو۔

آپ فرماتے ہیں کہ امیر المومنینؑ کو حضرت ابوطالب کے اشعار بہت زیادہ محبوب تھے، آپ چاہتے تھے کہ ان کی تدوین ہو جائے تاکہ یہ پڑھے جائیں اور مشتہر ہوں۔ چنانچہ آپ اکثر حکم دیا کرتے تھے کہ ان اشعار کو خود پڑھو اور اپنے بچوں کو پڑھاؤ اس لیے کہ حضرت ابوطالب دین خدا پر تھے۔ اور ان اشعار میں بڑا علم ہے[1]۔

امیر المومنینؑ کی دیگر شہادتوں کے علاوہ خود یہ حدیث بھی حضرت ابوطالبؑ کے درجۂ عظیم اور بلند منزل کی نشاندہی کر رہی ہے۔ امام کا منشا یہ ہے کہ ان کے اشعار نقل کیے جائیں ان کی تعلیم دی جائے اور انھیں حفظ کیا جائے تاکہ ان سے رسالت کا عرفان حاصل ہو اور مذہبی معلومات میں اضافہ ہو۔

اس کے بعد امام موسیٰ کاظمؑ کا دور آتا ہے۔ درست ابن منصور آپ سے حضرت ابوطالبؑ کے بارے میں سوال کرتے ہیں لیکن اس سوال کا تعلق اُن کے ایمان سے نہیں ہے اس لیے کہ یہ بات درست کی نظر میں واضحات میں سے تھی، بلکہ سوال یہ ہے کہ کیا حضرت ابوطالب رسول اکرمؐ کے لیے بھی حجت خدا تھے، آپؑ نے فرمایا نہیں وہ امانتدار وصایائے مرسلین تھے جنھیں آنحضرتؐ تک پہنچادیا تھا۔ عرض کی کیا یہ وصیتیں اس لیے دی گئی تھیں یہ رسول اکرمؐ پر حجت خدا تھے؟ فرمایا نہیں، اگر یہ حجت ہوتے تو وصیتیں ان کے حوالے کیوں کرتے خود ہی کیوں نہ رکھتے! پھر ابوطالبؑ کا موقف کیا ہے؟ وہ پیغمبر اکرمؐ کے احکام

---

[1]: الحجۃ ص۲۵۔ الغدیر ج ۷، ص۳۹۵۔

کے معترف تھے۔ اور اسی لیے تمام وصایا ان کے حوالے کر دیے[1] تھے۔

یہ حدیثِ مبارک ہمارے اس دعوے کی مستحکم دلیل ہے کہ ابوطالبؑ ایک تاریخی اور دینی ضرورت تھے۔ جن کے ذریعے پروردگار عالم کو ملتِ ابراہیمی کی شعاعیں رسول اکرمؐ تک پہنچانا تھیں اور جنھیں ابراہیمیت اور محمدیت کے درمیان واسطہ بننا تھا۔

انداز حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ سوال کرنے والا حضرت کے ایمان کی طرف سے بالکل مطمئن تھا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ آپ تمام انبیاء کی وصیتوں کے امانتدار ہیں۔ ایسا انسان کافر نہیں ہو سکتا اسی لیے اس نے گفتگو کا رخ بدل کر اس اہم منزل کا سوال کیا جو اس کی نظر میں ابوطالب کیلئے ہو سکتی تھی۔ یعنی وہ رسول اکرمؐ کیلئے بھی حجتِ خدا تھے۔ امام نے نہایت ہی صراحت کے ساتھ جواب دے کر حضرت کے موقف کو واضح فرمایا اور بتلایا کہ وہ رسول اکرمؐ کے دین اور ان کی تعلیمات کے معترف و مقر تھے اور بس!

ابان بن محمود نے امام رضاؑ کو خط لکھا۔ میں آپ پر فدا، اب تو مجھے حضرت ابوطالبؑ کے ایمان میں شک ہونے لگا ہے۔ آپ نے فوراً جواب میں تحریر فرمایا:

من یشاقق الرسول من بعد ما تبین له الھدی ویتبع غیر سبیل المومنین نوله ما تولیٰ ونصله جھنم وساءت مصیرا۔

یعنی جو لوگ ہدایت کے واضح ہونے کے بعد رسولؐ سے اختلاف کریں گے اور مومنین کے راستہ کو ترک کر دیں گے ان کا حشر بُرا ہوگا۔ وہ جہنمی ہیں

---

[1] العباس ص۱۱ ۔ الغدیر ج ۷، ص ۳۹۵ ۔

اور اگر تو نے ابوطالبؑ کے ایمان کا اقرار نہ کر لیا تو تیرا انجام بھی جہنم ہوگا [1]

امام رضاؑ کے اس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوطالبؑ کے ایمان میں شک کرنا گویا رسول اکرمؐ کی شخصیت کا انکار ہے اس لیے کہ حضرت ابوطالبؑ کا ایمان اپنی وضاحت و صراحت کی بنا پر شک و شبہ کے قابل نہیں ہے۔ اب اگر اس کے بعد بھی کوئی شخص شک کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ رسول اکرمؐ کا بھی مخالف ہے اور ہدایت کے واضح ہونے کے بعد بھی اس سے چشم پوشی کرتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جو شخص ہدایت سے اعراض کرے گا مومنین کے راستے سے الگ ہو جائیگا وہ دائرۂ ایمان سے خارج ہوگا۔ اس کے قدم صراط مستقیم اور جادۂ حق سے باہر ہوں گے اور ایسے شخص کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔

اس کے علاوہ حضرت ابوطالبؑ کے ایمان میں شک کرنا رسول اکرمؐ کو اذیت دینا ہے۔ اور آنحضرتؐ کو اذیت دینے والا بنص قرآنی مستحق عذاب الٰہی و لعنت ابدی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

ان الذین یوذون اللہ و رسولہ لعنہم اللہ فی الدنیا و الآخرۃ واعد لہم عذابا الیما۔

جو لوگ خدا و رسول کو اذیت دیتے ہیں ان پر دنیا و آخرت میں لعنت ہے اور ان کیلئے دردناک عذاب مہیا کیا گیا ہے۔

والذین یوذون رسول اللہ لہم عذاب الیم

جو لوگ رسول خدا کو اذیت دیتے ہیں ان کیلئے دردناک عذاب ہے۔

۱: الحدیدی ج ۳ ص ۳۱۱ الحجۃ ص ۱۱۶ الغدیر ج ۷ ص ۳۸۱ و ۳۹۶ معجم القبور ج ۱ ص ۱۸۹ اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۳۶

خود حدیثِ نبوی میں وارد ہوا ہے :

من آذی شعرۃ منی فقد اذانی ومن اذانی فقد اذی اللہ ۔

جس نے میرے ایک بال کو بھی اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی اور جس نے مجھے اذیت دی اس نے خدا کو اذیت دی[1]

امام حسن عسکری علیہ السلام اپنے آبائے کرام کے حوالہ سے ایک مفصل حدیث نقل فرماتے ہیں جس کا ایک حصہ یہ ہے :

"پروردگارِ عالم نے رسولِ اکرمؐ کی طرف وحی فرمائی کہ میں نے تمھاری تائید دو قسم کے شیعوں سے کی ہے کچھ بظاہر تمھاری نصرت کرتے ہیں اور کچھ پوشیدہ طور پر۔ جو لوگ درپردہ کمک کرتے ہیں ان کے سردار اور ان میں سب سے افضل ابوطالبؑ ہیں اور جو لوگ بہ ظاہر امداد کرتے ہیں ان کے سردار ابوطالب کے فرزند علی ابن ابیطالب ہیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ : ابوطالب کی مثال اس مومن آلِ فرعون کی ہے جو اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا[2]

امامؑ کے ارشاد کا مقصد یہ ہے کہ رسولِ اکرمؐ کے ناصرین میں ایک جماعت ان لوگوں کی بھی ہے جو آپ کی درپردہ اعانت کرتے تھے اس لیے کہ زمانہ کے حالات اظہارِ ایمان کے لیے سازگار نہ تھے اور مصلحتِ وقت اعلانِ امر کی مقتضی نہ تھی جس طرح کہ قرآنِ مجید میں ملائکہ کی خفیہ نصرت کا تذکرہ مکرر و مسلسل طور پر نظر آتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :

انزل جنوداً لم تروھا ۔ وایدہ بجنود لم تروھا ۔ ان یمدکم ربکم بثلاثۃ آلاف من الملائکۃ منزلین ۔

۱: صواعق محرقہ ص۱۱۱ ۲: الحجۃ ص۱۱۵ الغدیر ج ۷ ص۳۹۸ ۔

يمددكم ربكم بخمسة الاف من الملائكة مسومين

اني ممدكم بالف من الملائكة مردفين ۔ اور اس کے

علاوہ متعدد آیتیں۔

اس کے بعد آپ حضرت کے ایمان کو مومنِ آلِ فرعون کے ایمان سے تشبیہ دیتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح مومنِ آلِ فرعون نے اپنا ایمان کو پوشیدہ نہ کیا ہوتا تو حضرت موسیٰ کا بچنا دشوار اور ان کا قتل یقینی تھا اسی طرح اگر حضرت ابوطالب نے اپنے ایمان کو پردہ میں رکھ کر کفار کو اپنا ہم مسلک وہم مشرب ظاہر نہ کیا ہوتا تو نبی اکرمؐ کی نصرت سخت دشوار ہو جاتی اور حضرتؐ کا بچنا ناممکن ہو جاتا

کسی مسلمان کو یہ اختیار نہیں ہے کہ ان تمام اقوال وارشادات کو رشتہ داری اور قرابتداری کے جذبات پر محمول کر دے اسلیے کہ اہلبیتِ معصومین کی عصمت و طہارت کی شہادت کیلئے قرآن مجید میں آیتِ تطہیر موجود ہے اور زبانِ پیغمبر پر حدیثِ ثقلین آیۂ تطہیر کا اعلان ہے کہ یہ ہر رجس وعیب سے بَرا و منزہ ہیں اور حدیث ثقلین یہ بتا رہی ہے کہ یہ قرآن کے عدیل و مثیل ہیں جو معجزۂ پیغمبر، رشتۂ زمین و آسمان اور باعثِ نجاتِ امّتِ اسلامیہ ہے۔

ایسی صریح آیۂ مبارکہ اور ایسی متفق علیہ حدیث کے بعد یہ توہم نہیں ہو سکتا کہ ائمۂ اطہار حق سے الگ ہو کر صرف رشتہ اور قرابت کا لحاظ کریں گے؟ قرآن کریم میں بیشمار آیات اور زبانِ رسالت کے مختلف ارشادات اس بات کا صریحی اعلان کر رہے ہیں کہ یہ شخصیتیں کسی وقت بھی حق سے اعراض نہیں کر سکتیں، ان کی فکر کسی وقت بھی رشتہ وقرابت میں اسیر نہیں ہو سکتی ۔ یہ اسباب نجات عدیل قرآن اور مصاحبِ حق ہیں۔

اس کے علاوہ قرآن مجید میں بکثرت آیتیں ایسی بھی جن میں دشمنانِ خدا کی دوستی

سے روکا گیا ہے خواہ ان سے کسی قدر مضبوط رشتہ کیوں نہ ہو بلکہ اگر وہ باپ اور بھائی بھی ہوں جب بھی ایک مسلمان کا فریضہ ہے کہ ان سے ترک موالات اور ان کی طرف سے برأت کا اعلان کرے۔

میں نے مانا کہ حضرت ابوطالبؑ آئمۂ اہلبیت کے خاندانی بزرگ اور مورث اعلیٰ تھے لیکن کیا یہ بھی تصور ہو سکتا ہے کہ صرف اسی بزرگی اور قرابت کی بناپر یہ حضرات قرآن کریم کے احکام و تعلیمات کو ٹھکرا دیں گے؟ استغفراللہ!

حقیقت یہ ہے کہ ان مقدس شخصیتوں کے بارے میں اس قسم کے تصورات اسلام، رسولِ اسلام اور قرآن کریم پر کھلا ہوا حملہ ہے۔ قرآن کی عصمت و طہارت پر حملہ کرنے والا کبھی بھی مسلمان نہیں کہا جا سکتا۔

اصحاب و علماء کی زبان پر

ہماری نظر میں ایسے اصحاب کرام بھی ہیں جن کی آنکھوں پہ لذات دنیا اور اعراض مادیہ کے حجابات نہیں تھے۔ انھوں نے نورِ ایمان کا مطالعہ و مشاہدہ کیا تھا اور اس کو علی الاعلان ظاہر بھی کر دیا تھا۔ ہمارا موضوعِ کلام ان تمام اقوال و ارشادات کا تذکرہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ بات کتاب کو اس کے حدود سے خارج کر دیگی۔ لیکن تاہم چاہتے ہیں کہ اربابِ انصاف کے سامنے ان ارشادات کا کچھ ایک نمونہ پیش کر دیا جائے تاکہ حضرت ابوطالبؑ کی عظمت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

حضرت ابوبکر فرماتے ہیں کہ ابوطالبؑ کا اس وقت تک انتقال نہیں ہوا جب تک کہ انھوں نے لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ نہیں کہہ لیا[1] اسی کلام کی تائید حضرت عباس نے بھی کی ہے[2]

عبداللہ بن عباس سے ایک شخص سوال کرتا ہے کیا حضرت ابوطالب مسلمان تھے؟ آپ نے جواب دیا بھلا وہ شخص کیونکر مسلمان نہ ہو گا جس کا یہ قول ہو:

وقد علموا ان ابننا لامکذب علینا ولا یعبا بقول الاباطل

یاد رکھو ابوطالبؑ کی مثال اصحاب کہف کی ہے جن کو ایمان کے پوشیدہ کرنے اور کفر کے اظہار پر دوہرا اجر عنایت ہوا ہے[3]

۱: شرح النہج ج ۳ ص ۳۱۲ شیخ الابطح ص ۷۱ الغدیر ج ۷ ص ۳۷۰ ۱۰۴ ۔ احیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۳۶

۲: شیخ الابطح ص ۷۱ الغدیر ج ۷ ص ۳۹۹ ۱۰۴ ۔ اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۳۶

۳: الحجۃ ص ۹۵ ۱۱۵ ۔ الغدیر ج ۷ ص ۳۹۸

حضرت ابوذر جیسا جلیل القدر صحابی جس پر نہ دنیا کے سیم و زر کا کوئی اثر ہوا اور نہ معاویہ کے رعب و دبدبہ کا، صاف لفظوں میں اعلان کر رہا ہے۔ خدائے وحدہٗ لاشریک کی قسم حضرت ابوطالبؑ کا اس وقت تک انتقال ہی نہیں ہوا جب تک کہ اسلام نہیں لائے!

حسان بن ثابت اپنے اشعار میں کہتے ہیں:

فاذا ابتدیتم ھالکا فابکوا الوفی أخا الوفی

اگر کسی مرنے والے پر رونا چاہتے ہو تو وفادار اور وفادار کے بھائی پر گریہ کرو

سبط ابن جوزی کہتے ہیں کہ ان سے مراد حضرت حمزہؓ اور حضرت ابوطالبؑ ہیں

حضرت ابوطالبؑ کے ایمان کے یہ اعلانات کسی ایک دور یا کسی ایک طبقے سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ جس انسان پر بھی اغراض و خواہشات کا غلبہ نہیں ہوا جس کی آنکھوں پر تعصب و عداوت کے دبیز پردے نہیں پڑے۔ وہ اسی اعلان میں سرشار نظر آتا ہے، بلکہ میں تو یہ بھی دیکھتا ہوں کہ اگر کسی شخص نے عداوت کتنا بھی چاہی تو جلالت قدر نے بالآخر اپنا اعتراف کرا ہی لیا۔

عباسی بادشاہ عبداللہ مامون جس کی حیثیت سے کوئی شخص ناواقف نہیں ہے وہ بھی یہ کہتا ہوا نظر آتا ہے کہ ابوطالبؑ اپنے ان اشعار کی بنا پر قطعی مسلمان تھے:

نصرت الرسول رسول الملیک ببیض تلالاء کلمع البروق

أذب وأحمی رسول الالہ حمایة حام علیہ شفیق

وما ان ادب لاعدائہ دبیب البکار حذار الفنیق

ولکن أزیر لھم سامیا کما زار لیث بغیل مضیق

۱: الغدیر ج ، صہ ۳۹۹ ۲: الحدیدی ج ۳ صہ ۳۱۴ الغدیر ج ، صہ ۳۳۷ الحجۃ صہ ۵۴ دیوان ابیطالب صہ ۱

میں نے خدا کے رسول کی نصرت بجلی کی طرح چمکتی ہوئی تلواروں سے کی ہے
میں نے ایک شفیق حمایت کرنیوالے کی طرح ان کی حمایت کی ہے۔
میں ان کے دشمنوں کے سامنے اس طرح دب کر نہیں چلتا تھا جیسے اطفالِ
حیوان اپنے بڑے سے دبتے ہیں۔
بلکہ میں شیر نر کی طرح ڈکارتا ہوا سامنے آتا تھا۔

ابو جعفر اسکافی جاحظ کے رسالۂ عثمانیہ کی رد کرتے ہوئے حضرت ابوطالب کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ ابوطالبؑ رسول اکرمؐ کے باپ تھے۔ وہی اُن کے کفیل مددگار اور حامی تھے۔ اگر وہ نہ ہوتے تو دین قائم نہ ہوتا لیکن افسوس کہ اغلب روایات کی بنا پر وہ مسلمان نہ تھے"[1]

ہمیں انتہائی تعجب ہے بلکہ ہم تو یہ تصور بھی نہیں کرسکتے کہ یہ آخری فقرہ ابو جعفر اسکافی کا ہوگا۔ اس لیے کہ یہ آخری فقرہ اپنے سابقہ فقرات سے بالکل متضاد حیثیت رکھتا ہے اور علامہ اسکافی خود بھی حضرت ابوطالبؑ کے اسلام کے معترف ہیں۔

ہمارے خیال کی مزید تصدیق اس بات سے ہوتی ہے کہ ہمارے بیان کا ماخذ ان کا اصل رسالہ نہیں ہے بلکہ اس کا وہ خلاصہ ہے جو حسن سندوبی نے تیار کیا ہے اور یہ وہ حسن سندوبی ہیں جن کی اہلبیت دشمنی اور معاویہ و یزید دوستی کا اظہار مقدمہ میں کیا جاچکا ہے۔ پھر اگر یہ فقرہ تسلیم کر بھی لیا جائے تو یہ ان کی ذاتی رائے کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ اس میں اغلب روایات کا مفہوم بیان کیا گیا ہے جسکو ذاتی عقیدہ سے کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ ایک دوسرے مقام پر آپ نے ان لوگوں کا تذکرہ بھی کیا ہے

۱: رسائل جاحظ ص۲۲

ابوطالب کی وجہ سے مسلمان ہوئے تھے ۔ ملاحظہ ہو :

"ابوطالبؑ ہی کی وجہ سے بنی ہاشم نے بنی مخزوم، بنی سہم اور بنی جمح سے مقابلہ کیا، انھیں کی وجہ سے شعب کی مصیبتیں برداشت کیں، انھیں کی وجہ سے حضرت فاطمہ بنت اسد مسلمان ہوئیں جن کی شخصیت ابوبکر وغیرہ سے زیادہ اہم تھی اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ آپ اسلام نہیں لائے تو یہ صرف تقیہ تھا" [۱]

اسکے علاوہ علامہ اسکافیؒ کا صحیح مذہب ابن ابی الحدید کے بیانات سے دریافت کیا جا سکتا ہے ۔

انتہا یہ ہے کہ جاحظ جیسا متعصب انسان بھی جب حضرت ابوطالبؑ کا تذکرہ اپنے رسالہ عثمانیہ میں کرتا ہے تو اس بات پر مجبور ہو جاتا ہے کہ حضرت علیؑ کے سابق الاسلام ہونے پر ابوطالب کی طرف سے کوئی اعتراض نہ کر سکے ۔ چنانچہ کہتا ہے :

"کیا تجھے نہیں معلوم کہ قریش بلکہ تمام اہلِ مکہ میں نبی کریم کو اذیت دینے کی جرأت اس وقت تک نہ ہوئی جب تک ابوطالبؑ زندہ رہے" [۲]

تذکرۃ الخواص کے مؤلف (ابن جوزی) نے جناب ابوطالب کا تذکرہ کرتے ہوئے پہلے امیر المومنینؑ کے اقوال و ارشادات نقل کیے ۔ اس کے بعد خود جناب ابوطالب کے کارہائے نمایاں بیان کیے آخر میں تحریر فرمایا :

"حضرت ابوطالبؑ کے اہلِ جنت ہونے میں کوئی قائل نہیں ہے اس لیے کہ اس کے دلائل جو شواہد حدِ احصار سے باہر ہیں اور نبی کریمؐ کی نصرت میں آپ کا اہتمام خاص کفار و مشرکین سے دفاع کرتے ہیں انتظام

۱: رسائل جاحظ ص۱۵ ۲: رسائل جاحظ ص۵

مخصوص اور رسولِ اکرمؐ کا آپ کی موت پر گریہ ، پورے سال کا عام الحزن قرار دینا ، دعائے رحمت و استغفار ، ایک مدت تک دعائے خیر سے یاد کرنا ، یہ باتیں میرے دعوے کے اثبات کیلئے کافی ہیں[1]۔

اس کے بعد مؤلف نے آئمۂ اطہار کے اقوال اور حضرت ابوطالبؑ کے اشعار و ارشادات سے استدلال کرتے ہوئے آخر میں بیان کیا ہے کہ :

"کسی مؤرخ نے آج تک حضرت علیؑ پر یہ اعتراض نہیں کیا کہ آپ کے والد بزرگوار کفار میں سے تھے ۔ حالانکہ معاویہ ، عمرو عاص ، عبداللہ بن زبیر اور مروان جیسے دشمنانِ جان موجود تھے ۔ جنھوں نے آپ کی تنقیص و توہین میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا ۔ مزید لطف یہ بھی ہے کہ آپ برابر ان کے آباد اجداد کا تذکرہ فرمایا کرتے تھے ۔ ان کے کفر و شرک کو طشت از بام کیا کرتے تھے ۔

درحقیقت یہ طرزِ تاریخ آپ کے اسلام پر بہترین دلیل ہے بلکہ یہ اس بات کو بھی واضح کرتا ہے کہ آپ کے کفر کا قائل انتہائی متعصب انسان ہے ۔ اے صاحبِ انصاف ذرا دیکھ تو سہی ان شپر چشم افراد نے نورِ آفتاب کو کس طرح چھپا دیا ہے[2]"۔

حقیقت یہ ہے کہ مؤلف کے یہ کلمات ایک منطقی استدلال اور واقعی برہان کی حیثیت رکھتے ہیں بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ امیر المومنینؑ اپنے آبا و اجداد کی حقیقت بیان کریں اور وہ لوگ اس نکتہ سے غافل ہو جائیں ۔ میرا تو عقیدہ ہے کہ اگر ان دشمنانِ دین کو حضرت ابوطالبؑ کے اسلام میں ذرا بھی شک ہوتا تو امیر المومنینؑ کے مقابلے میں اس کا تذکرہ ضرور کرتے ۔ یہ لوگ تو ایسی ایسی تہمتوں پر آمادہ تھے جن سے ایمان ، انسانیت ، ضمیر اور وجدان سب شرمندہ

۱: تذکرۃ الخواص صفحہ ۱۰-۱۱ ؎

۲: تذکرۃ الخواص صفحہ ۱۱ ؎

ہو جائیں۔ ان لوگوں کا سکوت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آپ کا اسلام دشمنوں کی نظر میں بھی واضحات کی حیثیت رکھتا تھا۔

ہم اس مقام پر ضروری خیال کرتے ہیں کہ اس حق کی آواز کو بھی ظاہر کر دیں جو ایک مسیحی کی زبان سے نکلی ہے۔ وہ مسیحی جس نے نورِ حق کو چھپانے کی کوشش نہیں کی بلکہ ہدایت کو عالم آشکار کرنے کی سعی مشکور کی ہے جس نے امیر المومنینؑ کی شان میں مفصل قصیدہ لکھ کر عربی ادب پر احسان کیا ہے اور زبان میں ایک غیر معمولی اضافہ کیا ہے۔ یہ مورخ اس انداز سے رقم طراز ہے کہ:

مؤرخین میں اس مسئلے پر اختلاف ہے کہ ابوطالب مسلمان ہوئے تھے یا کفر ہی پر باقی تھے۔ دونوں طرف کے دلائل ہیں، دونوں طرف احادیث رسول ہیں۔ مجھے اس اہم مسئلے میں رائے دینے کی جرأت نہیں ہو سکتی لیکن میں صرف اتنی سی بات کہنا چاہتا ہوں کہ حضرت ابوطالبؑ ایک مرد مومن تھے۔ اس لیے کہ انسان کسی قدر بھی صلۂ رحم کرنے والا ہو، کتنا بھی اپنی اولاد اور اپنے اعزا سے محبت کرنے والا ہو لیکن وہ کسی وقت بھی اس نظریے یا عقیدہ سے غافل نہیں ہو سکتا جو اس کے قریب یا رشتہ دار کے ذہن میں پایا جا رہا ہے بلکہ جس کی بنا پر وہ اپنے دین کو تباہ و برباد کر کے ایک دوسرے دین کی بنیاد ڈالنا چاہتا ہے اس لیے کہ انسان کو اپنا مذہب بہت عزیز ہوتا ہے۔ وہ اس کا احترام کرتا ہے، اس پر جان قربان کرتا ہے، بلکہ اپنا عزیز قریب باپ بیٹا اور بھائی بھی اس کی مخالفت کرتا ہے تو اسے قتل کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جب یہ عام انسان کا دستور ہے تو ابوطالبؑ جیسے صاحب جاہ و حشم انسان پر تو خود اپنی ذاتی اور مرکزی دونوں حیثیتوں سے لازم تھا کہ وہ اپنے

دین سے دفاع ہوتے دیں اور اپنی قوم میں اپنا وقار برادنہ ہونے دیں۔
لیکن دیکھا یہ جاتا ہے کہ آپ اپنے بھتیجے کی مدد کر رہے ہیں جس کا مطلب یہ
ہے کہ آپ دل سے ضرور مومن تھے اگرچہ اس کا اظہار نہیں فرمایا۔ اس لیے
کہ مصلحتِ وقت اور سیاستِ زمانہ کے تقاضے اس اظہار کے خلاف تھے۔
ظاہر ہے کہ اگر آپ ابتدائے بعثت اور صبحِ اسلام ہی سے اپنے ایمان و
اسلام کا اظہار کر دیتے تو تمام قریش اسی وقت سے مخالف ہو جاتے۔ آپ کا
پورا وقار واحترام ختم ہو جاتا اور پھر اس طرح محمد عربی کی امداد نہ کر سکتے جس
طرح آپ نے کی ہے نتیجہ یہ ہوتا کہ دین ضعیف کا ضعیف ہی رہتا یہی وہ
اسباب تھے جنھوں نے آپ کو ایمان کے پوشیدہ رکھنے پر مجبور کر دیا۔ ورنہ
آپ کے قصائد، خطبے، اعمال واحوال اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ آپ مومن
کامل تھے۔ آپ کا جہاد و دفاع آخر وقت تک رسول اکرمؐ کی مدح وثنا قصائد،
خطبے اور وہ وصیت آخر اس بات کی دلیل ہے کہ آپ بہترین اصحاب اور
منتخب ناصرین میں سے تھے۔ کاش آج بھی اسلام کو ایسے ہی نصرت کرنے
والے اور اسی انداز کے اعلاءِ کلمۃ الحق والے مل جاتے جیسے کہ صدرِ اسلام
اور ابتدائے دعوت میں حضرت ابو طالبؑ تھے۔ اگر ایسا ہو جائے تو
آج بھی اسلام کا وقار بلند تر ہو جائے۔

یہ ہیں حضرت ابو طالبؑ، محمد مصطفےٰؐ کے کفیل و ناصر، امیر المومنین اسد اللہ الغالب
علی ابن ابیطالبؑ کے والد بزرگوار، بلکہ یہ ہے وہ عظیم انسان جس کی آغوشِ تربیت میں
پل بڑھ کر یہ دونوں ستارے زینتِ آسمانِ دین و دنیا بن گئے ہیں[۱]۔

۱۔ معجم القبور ج ۱ ص ۱۹۳ ۔ حاشیہ شرح قصیدہ علویہ ص ۵۸۔

اس واضح حقیقت اور ظاہر و باہر بیان کے بعد کسی تنقید و تبصرہ کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ صفحات تاریخ گواہ اور حالات شاہد ہیں کہ دینی رشتہ خون کے رشتہ پر ہمیشہ غالب رہتا ہے۔ ہم سابق میں اس قسم کے واقعات بھی نقل کر چکے ہیں کہ انسان اپنے عقیدہ کی خاطر ہر ممکن قربانی پیش کر دیتا ہے۔ اور جب بھی عقیدہ اور رشتہ میں ٹکراؤ ہو جاتا ہے عقیدہ کی فتح ہوتی ہے اور قرابت کی شکست۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین فرماتے ہیں:

"حضرت ابو طالب کی نبی کریمؐ پر مہربانیاں معروف اور آپ کی دینی حمایت شہرۂ آفاق ہے۔"[1]

حضرت ابو طالب کے بارے میں استاذ عبدالعزیز سید الاہل نے ایک کتاب تالیف کی ہے جس کے بارے میں بعض حضرات کا خیال ہے کہ مؤلف نے حضرت کے اسلام کا انکار کیا ہے لیکن میرا نظریہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ استاد موصوف نے جس صراحت اور وضاحت کے ساتھ حضرت کے سابق الاسلام اور کامل الایمان ہونے کا اعتراف کیا ہے اس کی نظیر کم ملتی ہے۔ بلکہ اگر پوری کتاب میں مقدمہ کی صرف چند سطریں ہی ہوتیں تو بھی وہ میرے مقصد کو ثابت کرنے کیلئے کافی تھیں۔ چنانچہ آپ اپنی کتاب کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"یہ کسی طرح مناسب نہیں ہے کہ ایک ایسا شخص جس نے نبوت کی حمایت و حفاظت میں چالیس سال سے زیادہ گزارے ہوں اس کی خبریں اس طرح قطع و برید کے ساتھ بیان کی جائیں، اس کے سوانح حیات کو اس طرح منتشر کر دیا جائے کہ اس کے نقل کرنیوالے بہت کم ہوں اور اس قلیل تعداد کے افراد

۱: الفتنۃ الکبریٰ ص ۱۵۱

بھی مختلف الخیال ہوں نتیجہ یہ ہو کہ تمام زندگی رسالت کی خدمت کرنیوالے
انسان کے بارے میں وقت انتشار کیلئے ایسی باتیں بیان کی جائیں جن سے
غرض مندی اور خواہش پرستی بالکل نمایاں ہو۔ حضرت ابوطالبؑ نے پوری زندگی
اتباعِ رسولؐ میں گزار دی، اپنے بچوں کو ان کے اتباع کا حکم دیا، اپنا سارا
گھر ان کی خاطر لٹا دیا، دشمنوں سے مقابلہ کیا اور عزم محکم کے ساتھ آخر وقت
تک نصرت رسولؐ پر کمر بستہ رہے۔ ان کا وجود نصرت رسول اکرمؐ کیلئے
ایک تاریخی ضرورت تھا جس کا ظہور پذیر ہونا اسلام کی تبلیغ اور پیغام الٰہی
کی نشر و اشاعت کیلئے انتہائی ضروری تھا جیسا کہ ابن خلدون نے بھی
اعتراف کیا ہے[1] اور یہ بھی اللہ کی ایک مشیت تھی ورنہ کوئی نظام، کوئی قانون
اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتا جب تک اس کے انصار و اعوان نہ ہوں
اسلام کا انتشار و اشتہار بھی اگرچہ انصار و اعوان ہی کے ذریعے ہوا ہے
لیکن ان کی حیثیت اسلام کے مقابلے میں ثانوی تھی۔ یہ سب اسلام کے
چاہنے والے تھے اور وہ اسلام کے قائم کرنیوالے۔ اگر وہ نہ ہوتے تو
ان کا ذکر ہی نہ ہوتا۔[2]

حضرت ابوطالبؑ نے اپنے فریضے کو پوری طرح ادا کیا اور اپنے بار کو
صحیح طریقے سے اٹھایا۔ انھوں نے نبی کریمؐ کی نصرت کی، ان کا ہاتھ بٹایا
دشمنوں کا مقابلہ کیا اور کسی قسم کے تکبر سے کام نہیں لیا جب کہ دوسرے
افراد بہک رہے تھے اور تمام قریش کے آپ سردار بھی تھے۔[3]

آپ کی وفات پر رسولِ اکرمؐ نے گریہ فرمایا اور ظاہر ہے کہ اگر وہ نہ روئیں
گے تو کون روئیگا۔ آپ نے ان کی تربیت کی تھی، ان کی کفالت و حفاظت

۱: کاش تاریخ میں ایسا کوئی اعتراف ہوتا۔ ۲،۳: ابوطالب شیخ بنی ہاشم ص۵ و ۶

کی تھی۔ ان کیلئے باپ کے بعد باپ اور نصرت کے وقت ناصر تھے۔ بلکہ ابتدائے تبلیغ میں محمدؐ کی پوری جماعت تھے[1]!

اس کے بعد ہماری نظر جارج جرداق کی کتاب "صوت العدالۃ الانسانیۃ" پر پڑتی ہے جس میں فاضل مؤلف نے شیخ بطحا کی خدمت میں عقیدت کے گلدستے اور مدح و ثنا کے تحفے پیش کیے ہیں بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس مبارک تذکرہ کی چند سطریں یہاں نقل کر دی جائیں۔ آپ فرماتے ہیں:

"جب حضرت عبد المطلب کا انتقال ہوا تو آنحضرتؐ کی کفالت ابو طالبؑ (والد علیؑ) کے حوالے ہوئی۔ آپ انہیں کی محبت، شفقت اور حسن تربیت کے سایہ میں پروان چڑھے جیسا کہ باپ کا منشا تھا"[2]

اس کے بعد حضرت عبد المطلب کی ابو طالب سے وصیت کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

حضرت عبد المطلب نے ابو طالبؑ کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ وہ ان کے حالات و جذبات کے صحیح طریقے سے واقف تھے۔ آپ کی اولاد میں شفقت و محبت کا جذبہ اکثر کے دل میں موجود تھا لیکن وہ جذبہ جو ابو طالبؑ کے دل میں تھا وہ کسی کو بھی حاصل نہ تھا اور ظاہر ہے کہ محبت و عطوفت کے جذبات تربیت کے مقابلے میں زیادہ مؤثر ثابت ہوتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت عبد المطلب نے ابو طالب کا انتخاب کیا۔ علاوہ اس کے کہ ابو طالبؑ خود بھی اپنے بھتیجے سے ایک ایسی محبت والفت رکھتے تھے جو ہمدردی کیلئے کسی وصیت و نصیحت کی

۱: ابو السیاسیخ بنی ہاشم دمشق ۲: صوت العدالۃ ج ۱ ص ۵۵

۳: صوت العدالۃ ج ۱ ص ۵۵

محتاج نہ تھی۔ چہ جائیکہ جب اتنی اہم وصیت کا اضافہ بھی ہو جائے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حضرت ابو طالبؑ ایک جلیل القدر عظیم المرتبت شخصیت کے مالک تھے آپ کی حیثیت ایک ایسے امین اور تجربہ کار انسان کی تھی جو ہر مصلحت، ہر امانت داری اور ہر پاکیزگی و اخلاص پر عمل پیرا رہتا ہو۔[1]

اس کے بعد فرماتے ہیں:

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس دن اللہ نے عبد المطلب کی اولاد میں محمدؐ کو نبوت کیلئے منتخب کیا تھا اسی دن ابو طالبؑ کو ان کی کفالت و تربیت کے لیے چن لیا تھا۔ ابو طالبؑ نے اپنی قوت فکر و نظر کی بنا پر محمدؐ میں اس بات کا ادراک کر لیا تھا جسے کوئی نہ سمجھ سکا تھا۔[2]

اس کے علاوہ بھی چند پُر مغز، بامعنی اور لطیف و دقیق کلمات اس کتاب کے صفحات میں نظر آتے ہیں:

"اگر ابو طالبؑ کے نفس مبارک کی معنویت محمدؐ کے نفس مقدس میں نظر آئے تو کوئی تعجب نہیں ہے اس لیے کہ نفس ذات کا ایک جزو ہے اور اس ذات نے تکمیل کی منزلیں ابو طالبؑ کے زیر سایہ گزاری ہیں۔[3]

حضرت ابو طالبؑ پہلے وہ شخص ہیں جنھوں نے اسلام میں رسول اکرمؐ کی مدد اور ان کی تبلیغ نشر و اشاعت کیلئے اشعار نظم کیے ہیں۔ آپ کی نظر میں محمدؐ کی شان میں معمولی سے معمولی بات بھی بہت بڑی معلوم ہوتی تھی۔[4]

ابو طالبؑ نے کسی آن بھی اس بات کو فراموش نہیں کیا کہ محمدؐ میرے خاندانی اخلاق کی فرد اکمل ہے اور وہ ایک استمراری شکل ہے جس میں حضرت عبد المطلب، عبد اللہ اور ابو طالبؑ کی تصویر بہ وقت واحد میں اجاگر ہوتی ہیں۔[5]

---

۱ تا ۵: صوت العدالۃ ص ۵، ص ۵۹ ج ۱ ؟

جس وقت ابوطالبؑ کا انتقال ہوا نبی کریمؐ نے محسوس کیا کہ آج ایک عظیم ستون منہدم ہو گیا ہے۔ ایک بڑی طاقت ختم ہو گئی ہے اور حضرت کا یہی احساس اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آپ کو ابوطالب سے ایک بڑا مستحکم روحانی تعلق تھا۔ اگر محمد عربیؐ کے اس احساس کا منشا فقط یہ تھا کہ ابوطالبؑ کے مرنے سے ایک جاں نثار کم ہو گیا، ایک خدا کار مر گیا، ایک دفاع کرنیوالا اٹھ گیا۔ ایک بچانے والا نہ رہا۔ جیسا کہ خود ان کے قول سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک چچا زندہ رہے قریش کو نظر بھر کر دیکھنے کی جرأت نہ ہو سکی تو پھر اس عمیق حزن اور گہرے الم کا منشا کیا تھا جو ہر وقت محمدؐ کے دل پر چھایا رہتا تھا جب کہ انھیں اس بات کا یقین تھا کہ چاہے ساری دنیا مخالف ہو جائے میری رسالت کامیاب ہو کر رہے گی حقیقت یہ ہے کہ محمدؐ کے اس مستقل حزن و الم کا منشا صرف یہ تھا کہ آپ اپنے لیے ایک بہت بڑا خلا محسوس کر رہے تھے۔ اپنے سامنے ایک بڑے عزیز اور شفیق کو غائب دیکھ رہے تھے یا یوں کہا جائے کہ اپنی ذات میں ایک کمی محسوس کر رہے تھے۔ اس لیے کہ آپ کا ماضی و حال سب مرنیوالے ہی سے وابستہ تھا[1]

اس کے بعد فاضل مؤلف نے دوسرے مقام پر اس قلبی اتحاد کو نقل کیا ہے جو محمدؐ و علیؑ کے درمیان تھا۔ تاکہ اس سے بات واضح ہو سکے کہ محمدؐ و ابوطالبؑ کا قلبی تعلق بڑی حد تک ایک شاندار مستقبل کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اور یہ شجرۂ طیبہ بڑے اچھے پھلوں کا موجب و باعث بن گیا۔

"محمدؐ و علیؑ میں مودت و اخوت کے تعلقات برابر جاری رہے۔ پیغام الٰہی کی اشاعت میں دونوں برابر سے کوشاں رہے۔ اس اتحاد و اتفاق کی بنا دیں

1: صوت العدالۃ ج ۱ ص ۶۰ ۔

اس وقت قائم ہوئی تھیں جب محمدؐ نے ابوطالبؑ کو دیکھا تھا، اور علیؑ نے محمدؐ کو۔ ظاہر ہے کہ جب ایسے تین افراد ایک گھر میں جمع ہو جائیں تو عظمت کا کیا عالم ہو گا۔ یہی وہ خاندانی کمالات وخصوصیات تھے جو حضرت ابوطالبؑ محمدؐ اور علیؑ کی عظمت کی تحلیل پر آمادہ کر رہے تھے۔ جس کا نتیجہ ابوطالبؑ کے یہاں قربانی اور فداکاری کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اور علیؑ کے یہاں فکر رسا، شعور عمیق اور معجز نما قربانی کی صورت میں۔[۱]

ممکن ہے کوئی انسان یہ خیال کرے کہ جارج جرداق کے اس پورے کلام میں کوئی ایسا کلمہ نہیں ہے جس سے حضرت ابوطالبؑ کے اسلام وایمان پر روشنی پڑتی ہو، بلکہ مؤلف نے اپنے پورے کلام میں ان کی جاں نثاری، فداکاری اور قربانی ومحبت کا تذکرہ کیا ہے اور ظاہر ہے کہ اسے اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مؤلف کا اتنا ہی بیان میرے دعوے کے اثبات میں کافی ہے۔ نور کو دیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پھیلی ہوئی روشنی اس کے وجود کا ثبوت مہیا کر دیتی ہے۔ لہٰذا ہمیں اسکی ضرورت نہیں ہے کہ ہم ایک ایک لفظ پر انگلی رکھ کر بتائیں کہ اس لفظ سے ایمان ظاہر ہوتا ہے اور اس سے عقیدہ بلکہ صرف ایک کلمہ کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں جس میں مؤلف موصوف نے ابوطالبؑ کو ایک تاریخی ضرورت قرار دیا ہے اور ان کو اتنا وسیع النظر تسلیم کیا ہے جو تمام دنیا کے لوگوں سے بہتر حضرت محمدؐ کی معنویت کا انکشاف کر سکے۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ محمدؐ، عبدالمطلب، عبداللہ اور ابوطالبؑ کے اخلاق کے تسلسل کا نام ہو اور یہ تمام کے تمام غیر مسلم ہوں۔ استغفر اللہ! بھلا یہ کونسا نفس تھا جو محمدؐ کے نفس میں اس طرح

۱۔ صوت العدالۃ، ۱، ص ۶

متحد و فنا ہو گیا تھا کہ دونوں کے اس معنوی امتزاج و اتحاد سے ایک نفس لایتجزی کی تشکیل ہو گئی تھی

مؤلف کا یہ کہنا کہ بیت طالبی کے خصوصیات نے باپ اور بیٹے کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ محمدؐ کی عظمت کی صحیح تحلیل کریں تا کہ یہ تحلیل ایک ایسی فداکاری اور قربانی کے جذبے کی شکل میں ظاہر ہو جس میں خیر کے تعلقات ہوں، رسالت کی کامیابی کی کوششیں ہوں، فکر و شعور، قربانی و ایثار کے معاملات ہوں۔ اور آخر میں یہ شعور ابوطالبؓ، محمدؐ اور علیؑ کو ایک نقطہ پر اس طرح جمع کر دے کہ اب یہ ایک ناقابل تقسیم وحدت ہو جائے اور ایک بلند و بالا باکمال اجتماع کی شکل اختیار کر لے، کیا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ابوطالبؓ مومن کامل تھے؟ کیا وہ خیر کے تعلقات جو ابوطالبؓ اور نبی کریمؐ میں قائم تھے وہ کفر و شرک کے تعلقات تھے۔ کیا کسی مشرک سے خیر کی امید ہو سکتی ہے؟ کیا مشرک میں کوئی ایسا خیر فرض کیا جا سکتا ہے جس کے تعلقات کے لیے دوسری طرف پیغامبر توحید ہو؟

حقیقت یہ ہے کہ جب تعلقات اتنے گہرے اور ایمانی رشتے اتنے مستحکم ہوں تو پھر محمدؐ کو ابوطالبؓ کی وفات کا ایک عمیق احساس ہونا ہی چاہیے اس لیے اُن کی وفات سے گھر کا وارث، تبلیغ کا رکن اعظم اور حمایت و حفاظت کا ایک بڑا ذمہ دار دنیا سے اٹھ گیا۔

یہ ضروری تھا کہ حزن و الم محمدؐ کے دل پر مسلط رہتے۔ یہ لازمی تھا کہ دل شکستگی کے آثار چہرۂ انور سے نمودار ہوتے۔ یہ قدرتی امر تھا کہ ابوطالبؓ کی وفات کا ایک بے پناہ اثر آپ پر ہوتا۔ خواہ آپ کو اس پر کتنا ہی یقین کیوں نہ ہو کہ دین کی نصرت اللہ کے حوالہ ہے، اس کی تکمیل خالق کے ذمے ہے اس لیے کہ ابوطالب فقط ایک مددگار ہی نہ تھے بلکہ روحانی تعلقات اور ایمانی معاملات کے طرف معاملہ بھی تھے

ایسا حزن انسان میں اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب کوئی ایسی ذات دُنیا سے اُٹھ جائے جو عزیز ترین شخصیت اور عظیم ترین حیثیت کی مالک ہو جس کی ہستی کا سرچشمہ اور جس کا ماضی اپنے حال کی بنیاد ہو۔

اگر ذکرِ خیر کی اس داستان کو کسی مقام پر موقوف ہونا ہے تو بہتر یہ ہے کہ اس سلسلے کو اسی مقام پر قطع کر دیا جائے اس لیے کہ عقیدت کے گلدستے، محبت کے نذرانے اور اعترافات کے خزانے شیخ بطحا کی خدمت میں پیش کیے جا چکے ہیں! زمانوں کی سیر ہو چکی، ادوارِ تاریخ کا مطالعہ ہو چکا، بزرگ شخصیتوں کے بیانات سُنے جا چکے، مختلف الخیال، متعدد العقائد اور مختلف الطبقات افراد کے افادات سامع نواز ہو چکے، اب قلم کو رُک جانا چاہیے۔

اب حق واضح ہو چکا، حقیقت عالم آشکار ہو چکی، باطل کی آواز دب چکی، مہموم فضا صاف ہو چکی، شور و شغب، چیخ و پکار ختم ہو چکی، فضیلت و رذالت کا امتیاز قائم ہو چکا، حق و باطل الگ الگ ہو چکے۔ اب داستانِ مدح و ثنا کے عطر بیز دفتر کو بند ہونا چاہیے۔

چند لمحے حدیدی کے ساتھ

باطنیہ

کلیاتِ غیبیہ

چند لمحے حدیدی کے ساتھ!

ہم پچھلے صفحات میں ایسے اشخاص کے کلمات سے استدلال کرچکے ہیں جن کی صداقت وحق بیانی میں کسی کلمہ گو کیلئے شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اسمیں ایک طرف رسول اکرمؐ کے فرامین ہیں اور دوسری طرف آئمہ اطہارؑ کے ارشادات اس کے بعد ان رجالِ فکر اور عظمائے مذاہب کے بیانات جنھوں نے اس نورانیت کا اظہار کیا اور دوسروں کی اس طرف رہنمائی کی حق کا ادراک کیا اور طریق مستقیم پر گامزن ہونے کی کوشش کی!

لیکن بہرحال چونکہ بیان کسی حدتک طولانی ہوچکا ہے اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ابن ابی الحدید کی شرح نہج البلاغہ کے بعض کلمات پر بھی تبصرہ کردیا جائے موصوف نے ایک طرف حضرت کی تعریف وتوصیف کے پل باندھ دیے ہیں اور دوسری طرف ایک کلمہ سے اس پوری عمارت کو منہدم کرنا چاہا ہے اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کلمہ کا صحیح محاسبہ کریں اور حقیقت مطلب واضح وآشکار کردیں۔

وقت بعثت پیغمبر کے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے آپ نے اس زمانہ کے افراد کو چند حصّوں پر تقسیم کیا ہے جن میں کچھ معطلہ تھے اور کچھ غیر معطلہ، معطلہ اس جماعت کا نام ہے جو خالقِ کائنات کی منکر، تناسخ[1] کی قائل اور بت پرست ہے غیر معطلہ لوگوں میں کچھ وہ تھے جو خدا پرست اور توحید کے قائل تھے، قبیح افعال سے اجتناب کرتے تھے اور تقویٰ وورع کے پابند تھے جیسے حضرت عبداللہ، عبدالمطلب اور ابوطالبؑ[2]۔

۱: ہندوؤں میں یہ عقیدہ آواگون کے نام سے مشہور ہے جسکا مطلب یہ ہے کہ انسان کی روح بعد موت نہ فنا ہوتی ہے نہ عالم برزخ کی طرف منتقل ہوتی ہے بلکہ ایک دوسرے جسم میں ڈالدیجاتی ہے یہ اعمال پر منحصر ہے اچھے افراد کی روح محلوں میں اور برے افراد کی روح کتوں کی بستی میں ہوتی ہے۔ ۲: شرح نہج ج ۱ ص ۹۰

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت ابوطالب خداپرست اور توحید شناس تھے۔ گناہوں سے اجتناب کرتے تھے اور تقویٰ و احتیاط کے پابند تھے۔ آپ ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو بت پرست، فاسق اور قائل تناسخ رہے ہوں!

ظاہر ہے کہ گناہوں اور قبیح باتوں سے اجتناب کرنیوالے انسان کیلئے یہ غیرممکن ہے کہ وہ نور ایمان کو اپنی آنکھوں سے دیکھے، صراط مستقیم کا مشاہدہ کرے اور پھر اُسے اختیار نہ کرے!

دوسرے مقام پر جناب امیر کے امتیازات و خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: "میں کیا مدح کر سکتا ہوں اس شخص کی جس کا باپ ابوطالب جیسا انسان سیّد البطحا، شیخ قریش اور رئیس مکّہ ہو۔"

پھر فرماتے ہیں:

"ابوطالب ہی وہ انسان کبیر ہے جس نے رسول اکرمؐ کا تحفظ کیا، ان کی نگرانی کی، کفّار و مشرکین کے شر سے انھیں محفوظ رکھا اور پھر ان کی خاطر زحمتیں مصیبتیں اور اذیتیں برداشت کیں۔ چنانچہ روایت میں ہے کہ جب آپ کا انتقال ہوگیا تو رسول اکرمؐ پر وحی نازل ہوئی کہ اب مکّہ چھوڑ دیجیئے اس لیے کہ آپ کا مددگار مرگیا ہے"[1]

بظاہر حدیدی کی نظر میں ابوطالبؑ کی طرف نسبت ایک شرف ہے ان کی اولاد میں شمار ہونا امامت کی خصوصیات میں سے ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ابوطالبؑ کی وجہ سے امیرالمومنینؑ کو خاندانی عظمت اور موروثی شرافت بھی حاصل تھی اس لیے کہ جس کا باپ اتنے صفات کا حامل ہو اس سے بہتر کون کریم النسل ہو سکتا ہے

۱: الحدیدی ج ۱ ص ۹ تا ۱۰ ؎

اس کے بعد ابوطالب کی خدمات اور زحمات کا تذکرہ کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ انھوں نے اسلام اور رسول اسلامؐ کی خاطر اذیتیں تکلیفیں اور مصیبتیں برداشت کی ہیں یہاں تک کہ اُن کے بعد رسولؐ کے لئے کوئی ایسا سایہ باقی نہ رہ گیا جہاں ٹھہر کر دم لے سکیں، کوئی ایسا قلعہ نہ رہ گیا جسکی پناہ میں اپنی جان بچا سکتے۔ اس لیے آپ کو ہجرت کرنا پڑی جیسا کہ خود فرماتے ہیں "جب ابوطالبؑ کا انتقال ہوا تو قریش نے آنحضرتؐ کو اذیتیں دینا شروع کر دیں نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو وطن چھوڑ کر ہجرت کرنا پڑی"۔[1]

"یہ بھی یاد رہے کہ حضرت علیؑ تمام افراد پر تقدم، شرف اور احسان کے مدعی تھے۔ اس لیے ان کے بھائی رسول اکرمؐ اور ان کے باپ ابوطالب تھے اور ابوطالب اس شخصیت کا نام ہے جس کے بارے میں ہر سیرت کا مطالعہ کرنیوالا جانتا ہے کہ اگر وہ نہ ہوتے تو اسلام لم یکن شیئاً مذکوراً کوئی قابل ذکر چیز نہ ہوتا۔ اب اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ ابوطالب کی یہ تعریف خلاف حقیقت ہے اس لیے کہ پروردگار نے خود ترویج دین کی ذمہ داری لی ہے خواہ ابوطالبؑ زندہ رہیں یا مر جائیں؟ تو میں یہ جواب دوں گا کہ پھر رسول اکرمؐ کی مدح وثنا بھی بیکار ہے اور یہ کہنا بھی غلط ہے کہ رسول اکرمؐ نے لوگوں کو ضلالت سے نکالا جہالت سے بچایا اور آپ کا مسلمانوں پر کوئی حق ہے۔ یا اگر آپ نہ ہوتے تو زمین پر کوئی خدا پرست نہ ہوتا اس لیے کہ یہ تمام باتیں بھی اللہ ہی کی طرف سے ہوئی ہیں"۔

پھر فرماتے ہیں: "اگر کوئی یہ کہے کہ رسول اکرمؐ کی مدح وثنا اس لیے کی جاتی ہے کہ پروردگار عالم نے اپنے افعال کو ان کے ہاتھوں انجام دیا ہے، اپنے خیر و برکات کے لئے ان

۱: الحدیدی ج ۴ ص ۳۲۲ ۔

وسیلہ و واسطہ قرار دیا ہے تو میں بعینہٖ یہی بات ابوطالبؑ کے بارے میں کہوں گا۔[1]

شاید اس مقام پر یہ مناسب ہوگا کہ ہم اس نکتہ کو بھی واضح کر دیں کہ ابن ابی الحدید کے یہ تمام بیانات اس خطبہ کی شرح ہیں جو حضرت امیر المومنینؑ نے جنگ صفین سے واپسی پر ارشاد فرمایا تھا جس کا خلاصہ یہ ہے:

"آل محمدؐ کا قیاس اس امت کے کسی فرد پر نہیں ہو سکتا اس لیے کہ ساری کائنات پر ان کے احسانات ہیں اور احسان مند کبھی محسن کے برابر نہیں ہو سکتا یہ دین کی بنیاد، در یقین کے ستون ہیں۔ حد سے بڑھنے والا ان کی طرف پلٹتا ہے اور پیچھے رہ جانے والا ان سے ملحق ہوتا ہے یعنی یہ کمال و شرف کے نقطۂ اعتدال پر ہیں، انھیں حق ولایت حاصل ہے اور انھیں میں پیغمبرؐ کی وصیت و وراثت منحصر ہے۔"

کیا اس وضاحت کے بعد بھی ابن ابی الحدید کے ان کلمات کی شرح کی ضرورت ہے، کیا اب بھی یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ مؤلف کی نظر میں حضرت علیؑ کے لیے ابوطالبؑ اسی طرح باعث فخر تھے جس طرح رسول اکرمؐ؟ میرے خیال میں تو صرف اتنا ہی اشارہ کافی ہے کہ فاضل مؤلف نے کمال شرف اور عظمت کا ایک مجموعہ تیار کیا ہے جس کے اجزا ابوطالبؑ، محمدؐ اور علیؑ ہیں۔ ہمیں اس بیان کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ ابن ابی الحدید نے حضرت ابوطالبؑ کے نام کے ساتھ "علیہ السلام" کا لفظ استعمال کیا ہے اور یہ وہ مقدس لفظ ہے جس کا استعمال صرف امام، نبی، وصی یا اس کے ہم مرتبہ افراد کیلئے ہوتا ہے۔ صحابہ کرامؓ میں ہزاروں افراد ایسے ہیں جن کیلئے یہ لفظ استعمال نہیں ہوتا ہے۔

اور ظاہر ہے کہ ابوطالبؑ سے زیادہ سلام کا مستحق کون ہو سکتا ہے! یہی وہ انسان ہے جس نے اسلام کی بنیادوں کو مستحکم بنایا اگر یہ نہ ہوتا تو بقول حدیدی اسلام قابل تذکرہ شے نہ ہوتا

۱: شرح النہج ج ۱ ص ۴۷۔

اس کے بعد مؤلف نے خود اپنے دل سے ایک معترض فرض کر کے اس کا جواب بھی دیدیا تاکہ مدح وثنا، تعریف وتوصیف کا سلسلہ اپنی آخری منزل پر پہنچ جائے۔ اور آخر میں یہ بھی واضح کر دیا کہ اگر ابوطالب کے افعال قابلِ تعریف نہیں ہیں تو خود رسول اکرمؐ کے کارہائے نمایاں بھی قابلِ توصیف نہیں ہو سکتے۔

میں نے حدیدی کے یہ منتشر فقرات صرف اس لیے نقل کئے ہیں تاکہ ان کے ان آخری فقروں کا جائزہ لیا جا سکے جو انھوں نے اپنی گفتگو کے خاتمہ پر تحریر فرمائے ہیں۔[۱]
درحقیقت یہ فقرات وہ ہیں جو سابقہ بیانات سے پوری طرح تضاد رکھتے ہیں اس لیے کہ ان فقرات میں رسول اکرمؐ کے محسن وکفیل کے خلاف افترا پردازی کی گئی ہے۔
اگرچہ یہ تمام افترا پردازیاں اس طویل وعریض کتاب کی ۱۱ سطروں سے زیادہ نہیں ہے جس کے متعدد صفحات اُن براہین ودلائل سے پُر کیے گئے ہیں جن سے آپ کی شخصیت اور آپ کے ایمان وعقیدہ پر روشنی پڑتی ہے۔
لیکن پھر بھی مؤلف نے چاہا کہ ان چند سطروں کا اضافہ کر دیا جائے اس لیے ہمارا بھی فریضہ ہو گیا کہ ہم ہر ہر کلمہ کی کمزوری کو ظاہر کر کے یہ بتائیں کہ یہ خاتمہ انتہائی پوچ ہے۔

مؤلف کتاب اپنے تمام دلائل وبراہین نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:
حقیقت یہ ہے کہ میری نظر میں یہ مسئلہ بہت مشکوک ہے۔ اس لیے کہ یہ روایات آپس میں متعارض ومتضاد ہیں۔ اور حقیقت کا علم صرف خدا کو ہے بغیر میرے دل میں وہ رسالہ بھی کھٹک رہا ہے جو نفس زکیہ نے منصور کے نام لکھا تھا جس میں لکھا تھا کہ میں بہتر سے بہتر کا بھی بیٹا ہوں

۱: شرح النہج ج ۱ ص ۳۰۵-۳۱۸ ۲: ج ۳ ص ۳۱۰ ؎

اور بدتر سے بدتر کا بھی، ہیں سردار اہلِ جنّت کا بھی فرزند ہوں اور سردار اہلِ جہنّم کا بھی"۔

ظاہر ہے کہ یہ نفسِ ذکیہ کی طرف سے ابوطالب کے کفر کی گواہی ہے اور چونکہ وہ گھر کے آدمی ہیں اور رسول اکرمؐ سے قریب العہد بھی ہیں جس دور میں روایت سازی کا کاروبار شروع نہ ہوا تھا اس لیے ان کا قول قرین قیاس ہے۔

حدیدی کا کہنا ہے کہ اس مقام پر روایات متعارض ہیں۔ کونسی روایات؟ جن میں ایک طرف وہ روایتیں ہیں جن کا تعلق خود رسول اکرمؐ سے ہے وہ روایتیں ہیں جن کا تعلق آئمہ معصومین سے ہے۔ وہ اقوال و افعال ہیں جن کا تعلق حضرت ابوطالب سے ہے جن میں ہر روایت آپ کے ایمان و اسلام کا ببانگ دہل اعلان کر رہی ہے اور دوسری طرف وہ روایت ہے جس کا خریدار معاویہ اور بائع مغیرہ بن شعبہ جیسے افراد اور جس کا بازار شام میں قائم کیا گیا۔

یاد رکھئے تعارض ہمیشہ اس وقت ہوا کرتا ہے جب دونوں طرف کے راوی وثاقت اور اعتبار کے لحاظ سے برابر ہوں علم رجال کے میزان میں دونوں کے پلّے مساوی ہوں جس کا تصوّر بھی اس مقام پر محال ہے۔

اس لیے کہ عترت اطہار کی روایت، اور وہ بھی رسول اکرمؐ سے مغیرہ جیسے افراد کی روایت کے برابر فرض نہیں کی جا سکتی۔

اس کے بعد موصوف نے نفسِ ذکیہ محمدؐ بن عبداللہ بن الحسین بن امام الحسنؑ کے اس خط سے استدلال کیا ہے جو انھوں نے منصور کے نام تحریر کیا تھا۔

میں نے اس خط کی حتی الامکان تلاش کی مجھے اس میں یہ فقرات نظر آئے:

"اللہ نے جاہلیت اور اسلام دونوں ادوار میں مجھے منتخب آباواجداد

عطا کیے ہیں یہاں تک کہ جہنم" میں بھی ہمارا منتخب درجہ ہے۔ ہم ایک طرف جنت میں سب سے بلند درجے کے مالک ہیں تو دوسری طرف جہنم کے سب سے زیادہ خفیف عذاب کے۔ ہم خیر الاخیار بھی ہیں اور خیر الاشرار بھی۔ خیر اہل جنت کے بھی فرزند ہیں اور بہترین اہل جہنم کے بھی[1]"

اس کے بعد میں نے اس خط کے راویوں کو تلاش کیا تو کامل میں کچھ نہ مل سکا لیکن صاحب کتاب شیخ الابطحا نے اس کا راوی عثمان بن سعید بن سعد المدنی کو قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ سعید ایک مجہول راوی ہے۔

طبری نے اس رسالہ کی کئی پھٹی سندیوں درج کی ہے۔

"مجھ سے محمد بن یحییٰ نے بیان کیا ہے کہ میں نے اس رسالہ کو محمد بن اسیر سے نقل کیا ہے اس کے علاوہ اس رسالہ کو ابو عبدالرحمٰن نے کتاب اہل عراق سے نقل کیا ہے۔ اور اسی طرح حکم بن صدقہ بن نزار سے ابن ابی حبیر نے اس رسالہ کی تصحیح کی ہے[2]"

بھلا اس ابتر قسم کی سند پر کیونکر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ اس میں محمد بن یحییٰ ہے خدا جانے اس کا حدکون ہے؟ ہم نے میزان الاعتدال میں اس نام کے سترہ آدمی دیکھے ہیں لیکن سب ہی متروک ضعیف، ناقابل استدلال، دجال، وضع احادیث، صاحب احادیث منکرہ و منفردہ، غیر معتبر، راوی ضعفا، تزویر شعار اور بغیر سنے روایت کرنے والے ہیں

۱: طبری ج ۶ ص۱۹۶۔ کامل ابن اثیر ج ۵ ص۵۔ البتہ اسمیں لفظ "جہنم" کے بجائے شر ہے اور آخری فقرہ نہیں ہے محاضرات تاریخ الامم ص۲۵ کامل ج ۲ ص۱۲۴ (اس کتاب میں پورا رسالہ ہے لیکن یہ فقرے اصلاً موجود نہیں ہیں۔ ۲: طبری ج ۶ ص۱۹۵ ۳: الغدیر ج ۵ ص۲۲۹ محمد بن یحییٰ ابن زرین المصیصی یہ دجال اور واضع احادیث تھا میزان الاعتدال ج ۳ ص۱۴۷ ۴: میزان الاعتدال ج ۳ ص۱۴۶

۲ : اس کے بعد محمد بن بشیر ہے ۔ اس نام کے دو آدمی ہیں ۔ ایک محمد بن بشیر بن مروان الکندی الواعظ ۔ یہ غیر معتبر اور بقول دارقطنی غیر قوی ہے اور دوسرا محمد بن بشیر ابن عبداللہ القاص یہ بھی ابن معین کی رائے میں غیر موثق ہے[1]

۳ : ہمیں نہیں معلوم یہ ابوعبدالرحمن کون صاحب ہیں اور ابن ابی حرب کس بلا کا نام ہے

۴ : اتفاق سے حکم بن صدقہ کا بھی کوئی ذکر میزان الاعتدال میں نہیں ہے ۔

یہاں زیادہ بحث وتحقیق کی ضرورت بھی نہیں ہے ہم تو صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ مہمل رسالہ ابی الحدید کے دل میں کیسے کھٹک گیا ہمیں اس معنوی اختلاف سے تعجب نہیں جو ابن ابی الحدید، کامل، طبری اور حضری کی روایتوں میں پایا جاتا ہے بلکہ تعجب اس فخر ومباہات پر ہے کہ انسان اس بات پر بھی فخر کرے کہ میں سید الاشرار کا لال ہوں اور میں بہترین اہلِ نار کا فرزند ہوں ! کیا جہنم میں بھی کوئی بہتری ہے ؟

پھر یہ سردار اہلِ جہنم کا بیٹا ہونا بھی غلط ہے ۔ اس لیے کہ اگر جہنم میں سرداری ہوگی تو اس کو ملے گی جو شر الاشرار اور بدترین خلائق ہو نہ کہ اس کو ملے گی جو خیر الاشرار اور بقول رسول اکرمؐ خفیف ترین عذاب کا مستحق ہو ؟ استغفر اللہ !

پھر یہ خفت عذاب بھی شفاعت ہی کا نتیجہ ہے ، تو کیا صاحب خلق عظیم شفاعت میں اس قدر بخل سے کام لے گا ؟ معاذ اللہ ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ فخر ومباہات ایک دیوانے آدمی کیلئے تو سزاوار ہے لیکن نفس زکیہ جیسے انسان کے لیے جو ایک ریاست عظمیٰ کا طالب اور حکومت وقت سے معارض ہو قطعاً غیر ممکن ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ ہمیں منصور دوانیقی کے جواب میں یہ فقرے نظر آتے ہیں :

"تمہارا خیال ہے کہ تم خفیف ترین عذاب والے کے فرزند ہو تم خیر الاشرار

---

۱ : المیزان ج ۳ ص ۱۳

کے دلبند ہوں حالانکہ یہ غلط ہے کہ جہنم میں کم و زیادہ عذاب کا سوال نہیں ہے۔ کفر چھوٹا بڑا نہیں ہوتا ہے۔ بشر میں خیر غیر ممکن ہے مومن کیلئے اہل جہنم پر فخر کرنا مناسب نہیں ہے جیسا کہ عنقریب تمھیں معلوم ہو جائیگا۔

وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون[1]۔

حقیقت یہ ہے کہ منصور کا یہ جواب اس رسالہ کا بہترین علمی اور اخلاقی جواب ہے جیسا کہ ہم نے خود بھی واضح کیا ہے چاہے اس سوال و جواب کی کوئی واقفیت ہو یا نہ ہو

ابن ابی الحدید کی روایت میں نفس ذکیہ کا قول اس طرح درج ہے انا ابن شر الاشرار۔ دیکھنا یہ ہے کہ آیا یہ عنوان شر الاشرار حضرت ابوطالب پر منطبق ہو سکتا ہے یا نہیں ہمارا خیال یہ ہے کہ شر الاشرار سے مراد چاہے تمام عالمین کے اشرار ہوں یا صرف قریش اور اس دور کے اشرار بہر صورت اس عنوان کا اطلاق ابوطالب[2] پر غیر ممکن ہے۔ ابھی تک کوئی کاذب، جعلساز اور افترا پرداز ایسا پیدا نہیں ہوا جس کی شقاوت اس منزل تک پہنچ گئی ہو کہ وہ حضرت ابوطالب کا شمار اشرار میں کرے چہ جائیکہ شر الاشرار؟ کیا یہ ابوطالب وہی نہیں ہیں جن کے فیوض و برکات سے سارا عالم عرب مستفیض ہو رہا تھا اور جن سے آجتک تمام دنیا مستفید ہو رہی ہے۔ کیا شر الاشرار ایسا ہی ہوتا ہے جو اسلام کا ستون محکم ہو اور جس کے بغیر اسلام ناقابل ذکر ہو۔ کیا ایسے شریر انسان کا بھی کوئی احسان اس رسول پر ہو سکتا ہے جس کی ہر آن یہ دعا تھی کہ خدایا کسی فاسق و فاجر انسان کا احسان گردن پر نہ آجائے؟ کیا ابوطالب کی حالت اس ابولہب اور ابوجہل سے بھی بدتر تھی جس کے شر سے تمام عالم مملو اور جس کے فساد سے معمورۂ ارض اسلام متزلزل تھا!

۱۔ طبری ج ۹ ص ۱۹۹ کامل ج ۵ ص ۶ محاضرات الامم۔ العباسیہ ص ۶۶ کامل مبرد ج ۲ ص ۱۲۷ ۔ ۲

ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ رسول اکرمؐ کی حمایت و حفاظت سے ہو یا ان کو اذیت و تکلیف دینا کارِ خیر ہو۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ!

ہم نے مانا کہ یہ رسالہ نفسِ زکیہ ہی کا ہے۔ اور یہ تمام خلافِ عقل حرکات انھیں سے صادر ہوئی ہیں۔ (معاذ اللہ) لیکن سوال یہ ہے کہ شر الاشرار کا اطلاق ابوطالبؑ پر کس دلیل سے ہو گیا؟ کیا یہ صرف خیال آرائیاں نہیں ہیں کیا ان کے پس پردہ کوئی خاص مقصد کار فرما نہیں ہے؟

آخر اس سے مراد طلحہ بن عبید اللہ کیوں نہیں ہے؟ جبکہ وہ ام اسحٰق جدۂ نفس زکیہ کا باپ تھا۔ عبد العزیٰ کیوں نہیں ہے جبکہ وہ نفس زکیہ کا نانا تھا۔ اس لیے کہ نفس زکیہ کی والدہ صاحبہ ہند بنت ابی عبیدہ بن عبد اللہ بن زمعہ بن الاسود بن المطلب بن اسد بن عبد العزیٰ[۱] تھیں اور عبد العزیٰ کا کفر معروف بھی تھا۔

ہمارا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ نفس زکیہ کی مراد یہی دونوں ہیں بلکہ یہ بھی ابن ابی الحدید کی طرح کا ایک خیال ہے جس کے بعد یہ سوال رہ جاتا ہے کہ ابن ابی الحدید نے ان دونوں کے بارے میں کیوں احتمال نہیں کیا اور ابوطالب کو کیوں مراد لے لیا؟

ہم نے مانا کہ نفس زکیہ کی مراد ابوطالبؑ ہی ہیں تو اب سوال یہ ہے کہ حدیدی کے دل میں نفس زکیہ کا قول تو کھٹکنے لگا اور امام جعفر صادقؑ کے اقوال کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ جبکہ یہ اقوال بھی اس کے پیش نظر تھے۔ اور یہ دونوں حضرات ہمعصر بھی تھے۔ پھر نفس زکیہ کو جلالت و علم، معرفت، صداقت و امانت اور اعلاء کلمۃ الحق میں امام جعفر صادقؑ سے کوئی نسبت بھی نہ تھی۔

۱: نسب قریش ص۵۳، ۲۲۷۔ تنقیح الاسطح ص۵۲۔

حدیدی کی یہ حرکت بالکل ایسی ہی ہے کہ انسان سارا اونٹ نگل جائے اور پھر ایک بال حلق میں اٹکنے لگے۔ یہ عجیب حلق ہے کہ جب چاہے بڑی سے بڑی چیز بھی اتر جائے اور جب چاہے تو ایک معمولی جملہ بھی اٹک جائے۔

سوال یہ ہے کہ اس سینے میں امیر المومنینؑ اور دیگر آئمہ اطہار کے اقوال کیوں نہیں کھٹکتے جبکہ ان کی عظمت و شخصیت مسلّم اور ان کے اقوال و ارشادات بشمار اور شہرۂ آفاق ہیں۔ اگر نفس زکیہ ابوطالب کی خیر خواہ اولاد میں ہیں تو کیا امیر المومنین اور دیگر آئمہ اطہار اس کے خلاف تھے کہ ایک کافر کو مسلمان بتادیا کیا نفس زکیہ کا تقویٰ و ورع ان سب سے زیادہ تھا؟

ہمارا عقیدہ تو یہ ہے کہ یہ رسالہ نفس زکیہ کا نہیں ہے[1]۔ اور اگر ہے تو ان کی مراد ابوطالب جیسا مجاہد نہیں ہے اور اگر ہے تو آئمہ اطہار کے مقابلے میں ان کے اقوال کی کوئی قیمت نہیں ہے۔

حدیدی کا کہنا ہے کہ چونکہ نفس زکیہ کا عہد رسول اکرمؐ کے زمانہ سے قریب تھا اس لیے روایت میں جعل کے احتمالات نہیں ہیں۔

تعجب انگیز امر یہ ہے کہ حدیدی نفس زکیہ کے اقوال پر اعتماد فرما لیتے ہیں جن کا زمانہ حضرت ابوطالبؑ کے ڈیڑھ سو سال بعد کا ہے اور امیر المومنینؑ کے اقوال کو نظر انداز کر جاتے ہیں جنھوں نے ابوطالبؑ ہی کی آغوش میں تربیت پائی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ چونکہ ان کا زمانہ رسول اکرمؐ سے قریب تھا لہٰذا روایت جعلی نہیں ہے۔ اور پھر خود ہی معاویہ کے دور کی جعلی روایتیں نقل کرتے ہیں جس کا زمانہ رسول اکرمؐ ہی کا زمانہ تھا۔

۱: حق تو یہی ہے کہ یہ رسالہ نفس زکیہ کا نہیں ہے اور اگر ہے تو سیاست عباسیہ نے اس میں ان فقرات کا اضافہ کر دیا ہے ورنہ ایک عاقل ایسی باتیں نہیں کر سکتا جس سے خود اسکی توہین و تنقیص ہوتی ہو۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قول کا مقصد کیا ہے؟ اس کا منبع کہاں ہے؟ یہ فقرہ دل میں کیسے اٹک گیا؟ بہرحال ہم اس لیے خاموش ہوئے جاتے ہیں کہ غزالی کے قول کی بنا پر مسلمان سے بدظنی حرام ہے۔ اور مسلمان کی حرمت کعبہ کی حرمت سے زیادہ ہے!

حدیدی اپنی اس کج رفتاری سے ایک ایسا قدم بھی اٹھاتے ہیں جو پہلے سے زیادہ مضحکہ خیز اور تعجب انگیز ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"بعض طالبین نے ایک کتاب اسلام ابوطالب کے موضوع پر لکھ کر میرے پاس تقریظ کیلئے بھیجی کہ میں ان بیانات کی تائید کروں تو میں پریشان ہو گیا اس لیے کہ میری نظر میں معاملہ صاف نہ تھا۔ چنانچہ میں نے بھی صرف ابوطالبؑ کے حقوق اور ان کی عظمت کا لحاظ کرتے ہوئے جلد کے اوپر یہ چند شعر لکھ دیے

ولولا ابوطالب وابنه	لما مثل الدين شخصا فقاما
فذاك بمكة آوى وحامى	وهذا بيثرب جس الحماما
تكفل عبد مناف بامر	وأودى فكان على تماما
فقل في ثبير مضى بعد ما	قضى ما قضاه وأبقى شماما
فلله ذا فاتحا للهدى	ولله ذا للمعالي ختاما
وما ضر مجد ابي طالب	جهول لغا او بصير تعاما
كما لا يضر اياة الصباح	من ظن ضوء النهار الظلاما

اگر ابوطالب اور ان کے فرزند نہ ہوتے تو آج دین قائم نہ ہو سکتا ان میں سے ایک نے مکہ میں حمایت و حفاظت کی اور دوسرے نے مدینہ میں موت سے پنجہ آزمائی کی

۱: الحجۃ علی الذاہب الی تکفیر ابوطالب ۔ السید شمس الدین ؛

حقیقت یہ ہے کہ ابوطالبؑ نے ایک ذمہ داری لی تھی جس کو علیؑ نے پورا کر دیا۔

کوہ ثبیر کے پھول تو مرجھا گئے لیکن خوشبو آج تک باقی ہے

خدا بھلا کرے انھوں نے مکہ سے خیر کا آغاز کیا اور انھوں نے بلندیوں کا خاتمہ کر دیا

ابوطالبؑ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا خواہ کوئی لغویت کرے یا تجاہل عارفانہ

اس لیے کہ اُن کی وضاحت کسی کے انکار سے نہیں چھپ سکتی"

اور اس طرح میں نے حضرت ابوطالبؑ کے تعظیمی حق کو بھی ادا کر دیا۔ اور اپنے موقف کو بھی باقی رکھا۔ اس لیے کہ کوئی حزمی فیصلہ نہیں دیا[1]

العجب ثم العجب! ابوطالب کا ایمان مشکوک ہے لیکن ان کا حق تعظیم قیامت تک مسلمانوں کی گردن پر ہے۔ وہ خود مسلمان نہ تھے لیکن اگر نہ ہوتے تو اسلام بھی نہ ہوتا خدا جانے یہ اتنا بڑا حق کفر سے پیدا ہوا ہے یا ضلالت سے؟ لطف یہ ہے کہ اشعار میں بھی اسی عظمت کا اعتراف ہے۔ باپ بنیاد اسلام بیٹا تکمیلِ اسلام، باپ محافظِ رسول، بیٹا موت کا مقابل، باپ ذمہ دار اسلام، بیٹا تمام جہاد و دفاع، باپ ابتدائے خیر و ہدایت بیٹا انتہائے بلندی و رفعت!

کیا اس ہدایت سے مراد غیر اسلام ہے یا ہدایتِ اسلامی کا آغاز کرنے والا انسان کافر تھا، استغفر اللہ! حضرت ابوطالب کا حق بھی ادا ہو گیا اور ایمان کا اعتراف بھی نہیں کرنا پڑا" پانی بھی پی لیا اور اچھو بھی ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ حدیدی نے اپنی پوری حیثیت آخر کے دو شعروں میں واضح کر دی ہے!

---

[1] شرح النہج ج ۳ ص ۳۱۸ – ۳۱۷

ابوطالبؑ کے ایمان وعقیدہ کے لیے کیا نقصان ہے اگر حدیدی جیسے افرادِ تجاہلِ عارفانہ سے کام لے کر اس کا انکار کر دیں ۔ ان کی بزرگی وجلالت میں کونسا سقم پہنچتا ہے اگر حدیدی اپنے مخصوص اغراض وخواہشات کی بنا پر ان کو مشکوک بنا دیں !
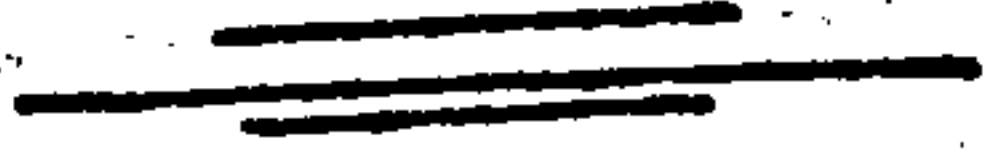
افترا پردازی

اور

جعل سازی

افترا پردازی اور جعلسازی

مقدمہ کتاب میں ہم اس چور بازاری کی نشاندہی کر چکے ہیں جسے معاویہ نے مسلمانوں کی دولت سے قائم کیا تھا اور جس میں جعلی حدیثیں اور جھوٹی روایتیں بکا کرتی تھیں جس کا مقصد حدیثوں کو وضع کرنا، قرآنی آیات کی من مانی تاویل کرنا اور احکام الٰہیہ کا مسخ کرنا تھا جس کے مختلف کارہائے نمایاں تاریخ کی پیشانی کو داغدار اور داستانِ عالم کے چہرہ کو سیاہ کر رہے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس بازار سے ابوطالبؑ کو وہی حصّہ ملنا چاہیے تھا جو قلعہ خورنق کے معمار کو ملا تھا کہ جب قلعہ تیار ہو گیا تو اسے پشتِ بام سے نیچے پھینک کر ہلاک کر دیا گیا اسلامی داستان نے یہی سلوک حضرت ابوطالب کے ساتھ کیا ہے مختلف افسانے صرف اس لیے گھڑے گئے کہ آپ کی عظمت وجلالت اور آپ کے ایمان اور عقیدہ کو بدنما بنایا جائے۔ آپ کے اس جہاد مسلسل کو بھلا دیا جائے جس نے رسالت کو روزِ اول ہی قتل ہو جانے سے بچا لیا تھا۔

ہمارا فریضہ ہے کہ ہم اس مقام پر اُن تمام افترا پردازیوں کی طرف اشارہ کریں جو غرضمند اور ضمیر فروش لوگوں نے اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے کی ہیں اور جن سے حقیقتاً ابوطالبؑ کا دامنِ ایمان پاک و پاکیزہ ہے۔

ہم چاہتے ہیں کہ ایسی تمام روایات کو تبصرہ تنقید کی منزل میں لا کر دیکھیں کہ ان کی صحت کہاں تک ہے اور ان کا پس منظر کیا ہے؟

ملاحظہ ہو پہلی آیت:

ومنهم يستمع اليك وجعلنا على قلوبهم اكنة أن يفقهوه وفي اذانهم

وقروا ان یروکل ایۃ لا یومنوا بہا حتیٰ اذا جاؤک یجادلونک یقول الذین کفروا ان ھذا الا اساطیر الاولین وھم ینھون عنہ وینأون عنہ وان یھلکون الا انفسھم ومایشعرون، ولو تری اذ وقفوا علی النار فقالوا یالیتنا نرد ولا نکذب بآیات ربنا ونکون من المومنین ۵

ان تینوں آیتوں میں قرآن کریم نے ان مشرکین کے حالات کی طرف اشارہ کیا ہے جو رسول اکرمؐ کے بیانات سنتے تھے لیکن ان کو قبول نہیں کرتے تھے۔ گویا کہ ان کے کان بہرے اور ان کے دلوں پر پردے پڑے تھے۔ رسول اکرمؐ سے بحث کرتے تھے اور کہتے تھے یہ تمام آیتیں تو پرانی داستانیں ہیں۔ ان میں جھوٹ اور افترا کے علاوہ اور کیا ہے یہ تھا ان کا انتہائی کفر اور ان کی آخری گمراہی!

یہی نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر یہ لوگوں کو قرآن سننے سے بھی منع کرتے تھے۔ اس لیے کہ انھیں اس بات کا خوف تھا کہ کہیں قرآن کی حیثیت وجلالت ان کے دلوں میں جگہ نہ کر لے۔ یا یہ کہ یہ لوگ رسول کریمؐ کے اتباع سے روکتے تھے کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائیں اور اس طرح وہ اپنے مقصد میں ناکام رہیں یہ لوگ خود بھی رسول اکرمؐ سے دور بھاگتے تھے اور یہ فرار درحقیقت نور الٰہی سے تھا جس کا نتیجہ گمراہی کے علاوہ کچھ نہیں ہے جو واقعی ہلاکت ہے۔

ایک دن وہ آئیگا جب یہ لوگ جہنم کے کنارے کھڑے کیے جائیں گے فرط ندامت سے سر جھکائے ہونگے غصہ سے اپنے ہونٹ چباتے ہونگے اور یہ سوچتے ہونگے کہ کاش ہم نے آیات الٰہیہ کا انکار نہ کیا ہوتا کاش ہم دوبارہ واپس کر دیے جاتے اور دنیا میں

۱: زمخشری نے کشاف ج ۱ ص ۴۴۱ پر نقل کیا ہے کہ یہ آیت ابو سفیان، ولید، نضر، عتبہ، شیبہ ابوجہل وغیرہ کیلئے نازل ہوئی ہے۔ یہ رسول اکرمؐ کی باتیں سن کر مذاق میں اڑا دیتے تھے۔ یہی بات بیضاوی ج ۲ ص ۱۶۴ پر اور مجمع البیان ج ۷ ص ۳۳ پر موجود ہے۔

جا کر یا ایمان بن جاتے [1]

ظاہر ہے کہ ان تینوں آیات کا ایک ہی مفہوم ہے یہ سب مشرکین ہی کے طرز عمل کو بیان کر رہی ہیں اور انہی کی مذمت کر رہی ہیں لیکن خدا بُرا کرے تحریف کرنیوالوں کا کہ انھوں نے درمیانی آیت کو اپنی منزل سے ہٹا کر اسے حضرت ابوطالبؑ کی طرف پھیر دیا۔ چنانچہ طبری نے سفیان ثوری کے حوالہ سے حبیب بن ابی ثابت سے اور انھوں نے ایک شخص کے حوالہ سے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ ان کی رائے میں یہ آیت ابوطالبؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے اس لیے کہ وہ لوگوں کو رسول اکرمؐ کی اذیت سے روکتے تھے لیکن خود اسلام سے دور بھاگتے تھے [1]۔ اس روایت کے سلسلے میں ہمارے حسب ذیل ملاحظات اور مواخذات ہیں :

۱ : اس سلسلہ سند میں ایک سفیان ثوری ہے جس کا کام روایت میں جعلسازی کا تھا، کاذبین کا کاتب [2] اور ضعفاء کا راوی تھا [3]۔ ابن مبارک کہتے ہیں کہ ایک دن سفیان ایک روایت میں خرد برد کر رہا تھا۔ دفعتہً مجھے دیکھ لیا تو شرما گیا۔ کہنے لگا میں اسے آپ کی طرف سے نقل کرتا ہوں [4]۔ ابن معین کا قول ہے کہ سفیان کی روایتیں مشکوک ہیں [5]۔ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں نقل کیا ہے کہ سفیان نے فریابی سے نقل کیا ہے کہ اگر میں روایت کو بعینہٖ نقل کرنے پر اتر آؤں تو اسکا مطلب ہے نقل کرنا ہی چھوڑ دوں [6]۔ سفیان کی روایتیں صلت بن دینار ازدی سے بھی ہوتی ہیں جس کا بغض علیؑ مشہور عالم ہے اور اسی لیے اس کو ارباب رجال نے مطعون قرار دیا ہے لیکن سفیان بڑے اطمینان سے اس سے روایت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھ سے ابوشعیب نے بیان کیا ہے

۱: تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۱۲۷، الغدیر ج ۸ ص ۳۔ ۲: میزان الاعتدال ج ۲ ص ۱۲، الغدیر ج ۸ ص ۳۔

۳: اصحاب السیاط ص ۲، دلائل الصدق ج ۱ ص ۳۴، ۴: دلائل الصدق ج ۱ ص ۳۴، اعیان الشیعہ ج ۳۵ ص ۱۳۰ ۔ ۵، ۶: دلائل الصدق ج ۱ ص ۳۴۔

اس کا نام نہیں لیتا۔ اسی لیے تو شیعہ نے کہا ہے کہ جب سفیان کوئی روایت بغیر نام کے بیان کرے تو مت قبول کرو اس لیے کہ یہ ابو شعیب مجنوں کی روایت ہے[1] بعض لوگوں نے سفیان کو شیعہ قرار دیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ تشیع اور یہ روایتیں؟ دونوں متضاد چیزیں ہیں بھلا یہ ممکن ہے کہ آئمہ اہلبیتؑ کا ماننے والا شیعہ ان کے اخبار و احادیث پر ایمان لانیوالا انسان حضرت ابو طالبؑ جیسی با عظمت شخصیت کے بارے میں ایک ایسی مہمل روایت نقل کرے؟ ہرگز نہیں، یا تو یہ شخص شیعیت سے خارج ہے یا اس کی یہ روایت غلط ہے!

علامہ محسن امین عاملی نے اعیان الشیعہ[2] میں اس کے حالات نقل کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ میری نظر میں یہ شخص خراب ہے اس لیے کہ اس نے مذہب شیعہ کے امام حضرت صادقؑ پر بھی اعتراضات کیے ہیں[3] یہ اور بات ہے کہ بعض اسے شیعہ[4] کہتے ہیں اور بعض زیدی ہے[5]۔

ب: اب اس حدیث میں حبیب اور ابن عباس کا درمیانی شخص معلوم نہیں ہے اور یہ وہ بات ہے جس سے بڑے بڑے سربستہ راز کھلتے ہیں اور بڑے بڑے بزرگ رسوا ہو جاتے ہیں

ج: علامہ امینی دام ظلہٗ کا کہنا ہے کہ یہ روایت صرف حبیب نے بیان کی ہے اور اس کے بارے میں ابن حیان اور ابن خزیمہ کی رائے یہ ہے کہ یہ جعلساز تھا عقیلی کا کہنا ہے کہ یہ عطا سے حدیث بیان کرتا ہے لیکن نا قابل قبول ہے۔ آجری نے ابن داؤد سے نقل کیا ہے کہ حبیب نے عاصم بن ضمرۃ سے کوئی صحیح روایت نہیں بیان کی[6]۔ ابن جعفر نحاس کا کہنا ہے کہ اگر کسی حدیث کو سُن کر میں خود بھی نقل کر دوں تو یہ دلیل صحت ہے[7]۔

۱: دلائل الصدق ج ۱ ص۳۱ میزان الاعتدال ج ۱ ص۴۲۸ ۲: اعیان الشیعہ ج ۳۵ ص۱۳۷، ۱۴۸
۳: اعیان الشیعہ ج ۳۵ ص۱۴۲، ۱۴۸ ۴: اعیان الشیعہ ج ۳۵ ص۱۴۱ ۵: اعیان الشیعہ ج ۳۵ ص۱۳۹
۶: الغدیر التہذیب ج ۲ ص۱۷۹ ۷: دلائل الصدق ج ۱ ص۲۶

اب آپ غور کریں کہ یہ شخص کس قدر لاپرواہ اور مسخرہ تھا!

د : قرطبی کہتے ہیں کہ "یہ آیت تمام کفار کے بارے میں ہے کہ وہ رسول اکرمؐ کے اتباع سے روکتے ہیں اور خود بھی بھاگتے ہیں۔ یہی معنی حسن و عباس سے منقول ہیں[1]۔

علامہ امینی نے نقل کیا ہے کہ طبری، ابن منذر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ نے علی بن ابی طلحہ اور عوفی کے واسطے سے نقل کیا ہے کہ ابن عباس اس آیت کو تمام کفار کے بارے میں جانتے تھے[2]۔ آپ فرماتے ہیں کہ سب کی رائے میں روکنے کا تعلق رسول یا قرآن سے ہے جس طرح کہ بھاگنے کا تعلق بھی انھیں سے ہے[3]۔

ھ : علاوہ سفیان کے کسی ایک شخص نے بھی ابن عباس سے ایسی روایت نقل نہیں کی پھر ابن عباس کا مسلک ہمیں پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے۔ لہٰذا ان کی طرف نسبت دینا افترا ہے۔

و : جب ہم آیات کے تسلسل پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں یہ صاف نظر آتا ہے کہ ان تینوں آیتوں کا ہدف اور مقصد ایک ہے۔ لہٰذا یہ کیونکر ممکن ہے کہ درمیان سے ایک آیت کو الگ کر کے اسے کسی دوسرے انسان کی شان میں نازل کر دیں

ز : درمیانی آیت کا کسی الگ مقصد کیلئے ثابت کرنا آیت کے ظاہر کے بھی خلاف ہے اس لیے کہ مفسرین کے قول کی بنا پر آیت میں نہی کا تعلق رسول یا قرآن سے ہے یعنی یہ لوگ رسول کریمؐ کے پاس آنے سے یا قرآن مجید کے آیات سننے سے منع کرتے اور روکتے ہیں۔ حالانکہ اگر ان لوگوں کی تاویل قبول کر لی جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ رسول کریمؐ کو اذیت کرنے سے روکتے ہیں۔ حالانکہ ضمیر کے مرجع میں اذیت کا کوئی ذکر نہیں ہے

ح : اس تاویل سے بدتر خیال ان ثر خمنددں کا ہے جو آیت کو صرف حضرت ابو طالبؑ

۱۔ ۲۔ ۳ : الغدیر ج ۸ ص ۳۔ ۲

کی شان میں ثابت کرنا چاہتے ہیں اس لیے کہ آیت میں صیغے جمع کے ہیں اور ایک شخص کیلئے مفرد کے صیغے استعمال ہوتے ہیں۔ پھر یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ ابوطالب رسولِ اکرمؐ سے بھاگتے تھے جبکہ انھوں نے ایک آن کیلئے بھی رسولؐ سے جدائی اختیار نہیں کی تو کیا نصرت وحمایت، دفاع وجہاد ہی کا نام فرار ہے۔ کیا دین کی ترویج اسلام کی اشاعت ہی کو اسلام اور رسولِ اکرمؐ سے فرار کہتے ہیں۔؟

ط: بہتر یہ ہے کہ ہم اس مقام پر مفسرین کے باقی اقوال بھی نقل کر دیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ یہ آیت کن کن لوگوں کے بارے میں ہے؟ ہمارے اس بیان کا دارومدار علامہ امینی کی تحقیقات پر ہے۔ اور نہایت ہی معتبر اور امین عالم ہیں۔

"امام رازی نے اپنی تفسیر میں دو قول نقل کئے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ آیت کفار و مشرکین کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور دوسرے یہ کہ ابوطالب کے بارے میں ہے اور پھر فرمایا ہے کہ پہلا قول ہی صحیح ہے اور اس کی دو دلیلیں ہیں:

۱: چونکہ آیات کے تسلسل میں مذمت پائی جاتی ہے لہٰذا اس آیت میں بھی مذمت ہونی چاہیے اور ظاہر ہے کہ ابوطالبؑ کا رسولِ اکرمؐ کو اذیت کرنے سے روکنا کوئی مذموم کام نہیں ہے لہٰذا وہ مراد نہیں ہیں۔

۲: اس آیت کے بعد بیان ہوا ہے کہ یہ لوگ اس عمل سے ہلاک ہو رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ نبی کی حفاظت وحمایت موجب ہلاکت وتباہی نہیں ہو سکتی پھر اگر یہ کہا جائے کہ ہلاکت کا تعلق دوسرے فقرہ سے ہے یعنی چونکہ یہ دین نبی سے بھاگتے ہیں اس لیے ہلاک ہو رہے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس جملہ کا ظاہر یہ ہے کہ اس کلمہ کا تعلق پورے کلام سابق سے ہے نہ کہ صرف ایک فقرہ سے جیسا کہ ہم خود بھی استعمال کرتے ہیں کہ فلاں شخص فلاں شے سے بھاگتا ہے اور نفرت کرتا ہے حالانکہ اس میں اسی کا نقصان ہے۔ ظاہر

ہے کہ اس جملہ میں نقصان کا تعلق بھاگنے اور نفرت کرنے دونوں ہی سے ہے''۔
ابن کثیر نے اپنی تفسیر ج ۲ ص۱۲۷ پر پہلے قول کو ابن حنفیہ، قتادہ، مجاہد اور ضحاک سے
نقل کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ یہی قول صحیح ہے اور یہی ابن جریر کا بھی مسلک ہے
نسفی نے تفسیر خازن کے حاشیہ پر ج ۲ ص۱۰ میں لکھا ہے کہ قول اوّل صحیح ہے یہ اور
بات ہے کہ لوگوں نے ابوطالبؑ کو بھی مراد لیا ہے۔
زمخشری نے کشاف ج ۱ ص۴۴۸ اور شوکانی نے اپنی تفسیر ج ۲ ص۱۰۳ پر قول اوّل
کو نقل کر کے قول ثانی کو ضعیف قرار دیا ہے[1]۔
بعض لوگوں نے اس آیت کو رسول اکرمؐ کے ہر چچا کے بارے میں بیان کیا ہے
کہ یہ سب بظاہر ساتھ تھے لیکن باطناً مخالف تھے[2]۔
ظاہر ہے کہ انہیں اعمام میں سے حضرت حمزہ اور عباس بھی ہیں۔ اب اگر حمزہ و عباس
کا یہ انجام تصور کیا جا سکتا ہے جو آیت نے بیان کیا ہے تو پھر آگے جائے دم زدن
نہیں ہے میری نظر میں یہ قول بھی اس قول سے زیادہ تعجب خیز نہیں ہے جس میں علیؑ و
عباس کو جہنمی فرض کیا گیا ہے۔ استغفراللہ!

ی: ان تمام قرائن سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس روایت کا پس منظر کیا تھا؟ اور اس
غلط تاویل کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ بھلا یہ کیونکر ممکن تھا کہ کفار و مشرکین کے
سلسلے کی آیت اس مومن اوّل پر منطبق ہو جاتی جس کے ایمان کامل پر رسول اکرمؐ
کے احادیث، آئمہ اطہار کے ارشادات، صحابہ کرام کے اقوال، عظماء فکر کے بیانات
اور خود حضرت ابوطالبؑ کے قصائد اور خطبے شہادت دے رہے ہوں کہ سعد رسوا کن
نبی اور معنویت برہم کن شیرازۂ قرآں!
انھیں اسباب کی بنا پر ہر مسلمان کا فرض ہے کہ ایسی روایات کو درخور اعتنا نہ سمجھے!

۱: الغدیر ج ۸ ص۷ ۲: اسباب النزول ص۱۹۸، تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص۱۲۷

ان کا منشاء و مصادر ایسے ہی اشخاص ہیں جو ابھی حضرت علیؑ اور حضرت عباس کے ناری ہونے کی شہادت دے چکے ہیں۔ استغفر اللہ!

آیت نمبر ۲ و ۳:

۱: ماکان للنبی والذین امنوا ان یستغفروا للمشرکین ولو کانوا اولی قربی من بعد ما تبین لہم انہم اصحٰب الجحیم ○

۲: انک لا تہدی من احببت ولکن اللہ یہدی من یشاء و ھو اعلم بالمہتدین ○

پہلی آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی کو مشرکین کیلئے استغفار کرنے کا حق نہیں ہے۔ خواہ وہ کتنے ہی عزیز قریب کیوں نہ ہوں اس لیے کہ وہ جہنمی ہیں اور دوسری آیت کا مطلب یہ ہے کہ نبی اپنے پاس سے کسی کی ہدایت نہیں کر سکتا۔ یہ تو صرف اللہ کا کام ہے وہ ہی بہتر جانتا ہے۔

ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ خواہش پرست افراد نے ان آیتوں کو حضرت ابوطالبؑ پر کس طرح منطبق کر دیا ہے اس لیے زیادہ مناسب ہے کہ ان تمام اقوال کو نقل کر دیں جو اس سلسلے میں سامنے آتے ہیں۔

۱: اسحٰق بن ابراہیم نے عبدالرزاق، معمر، زہری، سعید بن المسیب کے واسطے سے نقل کیا ہے کہ جب ابوطالب کا وقتِ وفات آیا تو رسول اکرمؐ تشریف لائے ابوجہل بھی وہاں موجود تھا۔ عبداللہ بن ابی امیہ بھی حاضر تھا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا چچا کلمہ توحید پڑھو تاکہ یہ قیامت میں کام آئے۔ ابوجہل اور عبداللہ نے کہا ابوطالب دیکھو عبدالمطلب کے دین کو نہ چھوڑنا۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا اچھا خیر میں تمھارے لیے اس وقت تک استغفار کرتا رہوں گا جب تک اللہ کی طرف سے ممانعت نہ ہو جائے ادھر فوراً

آیت اتر پڑی۔ دیکھو خبر دار مشرکین کے لیے استغفار نہ کرنا[1]

۲: ابی الیمان نے شعیب، زہری، سعید بن المسیب کے واسطہ سے مسیب سے نقل کیا ہے کہ جب ابو طالب کا وقت آخر آیا تو رسول اکرم تشریف لائے۔ اتفاقاً وہاں ابو جہل اور ابن امیہ بھی موجود تھا۔ حضرت نے فرمایا چچا کلمہ پڑھو تاکہ قیامت میں اللہ کے سامنے پیش کرسکوں۔ دونوں بول پڑے دیکھو عبد المطلب کے دین سے اعراض نہ کرنا، پھر تو آنحضرت اپنی فرمائش کرتے رہے اور یہ دونوں اپنی سی کہتے رہے۔ یہاں تک کہ ابو طالب نے کہہ دیا کہ ہم عبد المطلب کے دین پر ہیں۔ اور کلمہ نہیں پڑھا۔ حضرت نے استغفار کا قصد کیا آیت نازل ہوگئی پھر اللہ نے تسلی دی کہ تم خود کسی کو ہدایت نہیں کرسکتے یہ صرف ہمارا کام ہے[2]!

۳: حرملہ بن یحییٰ التجیبی نے عبد اللہ بن وہب، یونس، ابن شہاب، سعید کے واسطہ سے مسیب سے یہی روایت نقل کی ہے[3]۔

۴: محمد بن عبادہ اور ابن ابی عمر نے مروان، یزید بن کیسان، ابی حازم کے واسطہ سے ابو ہریرہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اکرم نے ابو طالب سے وقت وفات کلمہ پڑھنے کے لیے کہا تو آیت اتری، تم کسی کی ہدایت نہیں کرسکتے[4]۔

۵: محمد بن حاتم بن میمون نے یحییٰ بن سعید، یزید ابن کیسان، ابی حازم اشجعی کے واسطے سے ابو ہریرہ سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت نے ابو طالب سے کلمہ پڑھنے کیلئے کہا

۱: بخاری ج ۲ ص ۱۷۵ ج ۳ ص ۸۵ ۲: بخاری ج ۳ ص ۱۰۶ ۳: مسلم ج ۱ ص ۴۰ ۴: مسلم ج ۱ ص ۴۰

تو انھوں نے جواب دیا کہ اگر قریش کی اس ملامت کا خوف نہ ہوتا کہ موت سے ڈر گئے تو تمھارا دل خوش کر دیتا۔ اس پر آیت اتری۔ اے رسول ہدایت تمھارے بس کی نہیں ہے[1]!

پہلی تین حدیثوں کے رواۃ

(۱)

اس مقام پر ہمارے حسب ذیل ملاحظات و مواخذات ہیں

حدیث اوّل :

۱ : ان راویوں میں ایک اسحٰق بن ابراہیم ہے جس کا مکمل نام درج نہیں کیا گیا۔ خدا جانے یہ اسحٰق ضعیف ہے یا وہ ہے جس کا استاد ہی ساقط ہے، یا وہ ہے جو غیر معتبر ہے، یا وہ ہے جس کا علم ذہبی کو نہیں ہے، یا وہ ہے جسے دار قطنی نے ضعیف قرار دیا ہے، یا وہ ہے جس کو ابن عدی اور ازدی نے واضع حدیث اور کاذب قرار دیا ہے، یا وہ ہے جسے حاکم نے غیر قوی اور ضعیف کہا ہے یا وہ ہے جسے دار قطنی نے غیر قوی، نسائی نے غیر ثقہ ۔۔ ابو داؤد نے لاشئ محض، محمد بن عوف طائی نے کاذب قرار دیا ہے۔ یا پھر وہ ہے جس کی احادیث منکر اور ناقابل عمل ہیں؟[2]!

شاید یہ اسحٰق بن ابراہیم دبری ہے جو عبد الرزاق کا ساتھی تھا جس کو ذہبی نے صاحب حدیث نہیں تسلیم کیا ہے بلکہ بعض منکر حدیثوں کا راوی بھی قرار

۱: مسلم ج ۱ ص۲۱   ۲: میزان الاعتدال ج ۱ ص۸۱، ۸۴ تا ۸۷

دیا ہے۔ اب خدا جانے یہ روایت اس کی ذاتی ہے یا اسی عبدالرزاق سے ماخوذ ہے جس کا ذکر ذہبی نے کیا ہے[1]۔

صاحب شیخ الابطح کی نظر میں اس سے مراد اسحٰق بن ابراہیم راہویہ ہے[2]۔ جس کے بارے میں ذہبی کا خیال یہ ہے کہ ابو عبید آجری نے ابو داؤد سے نقل کیا ہے کہ اسحٰق بن راہویہ اپنی موت سے پانچ مہینے پہلے ہی متغیر ہو گیا تھا اسی لیے میں نے اس کے روایات کو رد کیا ہے۔ ابو الحجاج نے سے اس کی روایت کا ذکر کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ وہ آخر میں گڑبڑ ہو گیا تھا اس کے بعد اس کے منکر احادیث کا تذکرہ کیا ہے[3]۔

لیکن میری نظر میں اس سے مراد دبری ہی ہے اس لیے کہ وہ عبدالرزاق کا مصاحب تھا اور یہ روایت بھی عبدالرزاق ہی سے ہے۔

ب: اس کے بعد عبدالرزاق کا ذکر آتا ہے۔ یہ کون ہے؟ شاید عبدالرزاق بن عمر الثقفی ہو جو ضعیف، غیر معتبر، منکر الحدیث تھا۔ اور بقول دارقطنی اس کی کتاب بھی ضائع ہو گئی تھی۔ بلکہ بقول ابو مسہر جب از ہری کی روایات کی کتاب گم ہو گئی تو اس نے اپنے پاس سے دوسری روایتیں شروع کر دیں[4]۔

اس کی شخصیت کے متعلق ذہبی کا قول ہے کہ اس کے احادیث منکرات ہیں۔ بلکہ یہ وہ شخص ہے جس نے معمر بن راشد سے دس ہزار روایتیں نقل کی ہیں[5]۔

ج: اس کے بعد معمر کا ذکر ہے جو کذاب، مجہول اور راوی منکرات کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے۔ شاید یہ وہی ابن راشد ہے[6] جس کے بارے میں ذہبی

۱: المیزان ج ۱ ص ۸۵ ۲: شیخ الابطح ص ۲۸ ۳: المیزان ج ۱ ص ۸۶ ۴: المیزان ج ۱ ص ۱۲۶
۵: المیزان ج ۲ ص ۱۸۱، الغدیر ج ۵ ص ۲۵۳ (عبدالرزاق عثمان کی بھی توہین کیا کرتا تھا)
۶: شیخ الابطح ص ۲۸

کا قول ہے کہ اس کے اوہام مشہور ہیں۔ اور ابو حاتم کا قول ہے کہ بصرہ کے اس کے تمام روایات مشکوک ہیں۔ خود عبدالرزاق نے کہا ہے کہ میں نے اس سے کئی ہزار حدیثیں نقل کی ہیں[1]

ماشاء اللہ یہ کثیر مقدار۔ خدا اور زیادہ کرے اور مبارک بھی کرے۔

فرمائیے! اس سلسلہ میں کوئی معقول آدمی بھی نظر آیا، یا سب کے سب ...؟

(۲)

حدیث ثانی

ا : اس سلسلہ سند میں ایک ابی الیمان ہے جس کی ایک ہی حدیث ہے اور وہ بھی غیر مستند!

ب : دوسرا شعیب ہے جس نام کے سب کذّاب، ضعیف، راوی منکرات اور مجہول وغیرہ ہیں۔

(۳)

ان دونوں حدیثوں کا سلسلہ زہری پر آکر مل جاتا ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس زہری کی روایات کو کس طرح قبول کروں جبکہ اس کی بیان کردہ وہ حدیث بھی ہے جس میں حضرت علیؑ اور عباس کے جہنمی اور بے دین ہونے کا تذکرہ ہے کیا ایسے بدنفس بدطینت اور رذیل آدمی کی روایت ابوطالبؑ کے بارے میں قبول ہو سکتی ہے جو امیر المومنینؑ پر اتنا بہتان عظیم رکھتا ہو!

اس کی بے دینی کے اسباب بالکل واضح ہیں اور حضرت ابوطالبؑ کے بارے میں اس شخص سے اس سے زیادہ کوئی اور توقع بھی نہیں ہو سکتی جبکہ اسکے تیر ستم کا نشانہ خود حضرت علیؑ ہیں اور حضرت ابوطالب انھیں کے والد ماجد ہیں!

ا ۲ ؛ المیزان ج ۳ ص ۱۳ ؎

ہمیں اس تذکرہ کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ یہ جعلساز تھا[1] اس لیے کہ علیؑ و عباس کے معاملے میں اس کی روایت جعلسازی کا اعلیٰ ثبوت ہے البتہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر اس نکتہ کی طرف اشارہ کر دیا جائے کہ عبدالرزاق اور معمر نے اس روایت میں زہری کا ساتھ دیدیا ہے لیکن زہری بے ایمانی اور بے دینی کی اس منزل پہ تھا کہ یہ لوگ آخر تک اس کا ساتھ نہ دے سکے۔ عاجز آکر راستے سے الگ ہو گئے۔ چنانچہ عبدالرزاق نے معمر سے نقل کیا ہے کہ زہری کے پاس عروہ کی دو روایتیں علیؑ کے بارے میں تھیں میں نے اس سے ان کے بارے میں سوال کیا تو اس نے جواب دیا کہ تم سے انکا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بہرحال ان روایتوں کو تو خدا ہی جانے البتہ بنی ہاشم کے بارے میں زہری اور عروہ پہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا![2]

اس مقام پر زہری کا ایک واقعہ اور بھی ملتا ہے اور وہ یہ کہ ایک شخص مدینہ کی مسجد میں آیا کیا دیکھا کہ زہری اور عروہ بن زبیر علیؑ کا تذکرہ کر رہے ہیں اور ان کی مذمت کر رہے ہیں۔ اس نے اس بات کی اطلاع امام زین العابدینؑ کو دی۔ آپ تشریف لائے اور فرمایا اے عروہ تو وہی ہے جسکے باپ نے میرے والد سے مقدمہ بازی کی اور آخر کار ہار گیا۔ اور اے زہری اگر تو مکہ میں ہوتا تو تجھے تیرے باپ کا گھر بھی دکھا دیتا۔

(۴)

حدیث ثالث :

ا : حرملہ بن یحییٰ التجیبی۔ یہ انوکھی حدیثوں کا راوی تھا۔ ابوحاتم نے اسے قابل استدلال نہیں سمجھا۔ عبداللہ بن محمد فرہاذان نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ مشہور ہے کہ اس کے پاس ابن وہب کی تمام روایتیں علاوہ دو کے محفوظ تھیں

۱: المیزان ج ۳ ص ۱۲۶ ۲: شرح النہج ج ۱ ص ۳۵۸ ۳: شرح النہج ج ۱ ص ۳۷۱

۴: المیزان ج ص ۲۱۹ ۷

ب : تعجب یہ ہے کہ ابن وہب کے بارے میں تاریخ میں ہے کہ اس کے پاس ایک لاکھ ۲۰ ہزار حدیثیں تھیں جنھیں حرملہ نے محفوظ کیا تھا۔ صرف دو کو چھوڑ دیا تھا۔
امام احمد بن حنبل سے اس کی روایات کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ ان کا قبول کرنا مناسب نہیں ہے [1]
کیا ناقابلِ قبول ہونا اور سوا لاکھ روایات کا تنہا راوی ہونا اس کی کمزوری کیلئے کافی نہیں ہے۔ آخر اتنی وافر مقدار کہاں سے آگئی ؟ اب تو ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلسل روایتیں گھڑتا رہے تاکہ یہ مقدار پوری ہو جائے۔ اور اپنے دعوے کا بھرم رہ جائے۔

ج : یونس کا بھی پتہ نہیں ہے کہ یہ کون ہے ؟ اس نام کے سب ہی کاذب بدبخت منکر الحدیث بلکہ کذوب لقب کے مالک ہیں [2]

د : ابن شہاب کی تو رجال میں خبر ہی نہیں ہے کہ یہ کیا چیز ہے اور کہاں ملتی ہے ؟

(۵)

ان تینوں حدیثوں کا سلسلہ سعید ابن مسیب اور اسکے باپ پر آکر مل جاتا ہے۔

أ : ہم اس روایت کو اس لیے قبول نہیں کر سکتے کہ اس سعید کے بارے میں شدید اختلاف ہے کسی نے اس کی تعریف کی ہے اور کسی نے مذمت۔ ابن ابی الحدید نے اسے دشمنانِ علیؑ میں شمار کیا ہے! اور مشکوک فیہ قرار دیا ہے۔
ظاہر ہے کہ دشمنِ علیؑ بنص رسول اکرمؐ منافق ہوتا ہے اس لیے اسکی روایت قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ چہ جائیکہ اگر روایت بھی حضرت علیؑ ہی کے والدِ ماجد کے بارے میں ہو۔ ہم اس مقام پر سعید کی اس گفتگو کو نقل کرنا چاہتے ہیں جو اس سے

---

۱ : المیزان جلد ۲ صفحہ ۸۲

۲ : المیزان ج ۳ ص ۳۳۲ - ۳۴۰ ـ

عمر بن علی سے ہوئی ہے ابن ابی الحدید نے اس واقعہ کو مفصل تحریر کیا ہے۔
"عبدالرحمٰن بن الاسود نے ابوداؤد ہمدانی سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں میں سعید ابن مسیّب کے پاس بیٹھا تھا کہ عمر ابن علی بھی آگئے سعید نے ان سے کہا آپ اپنے بھائیوں کی طرح مسجد میں کیوں نہیں آتے ان لوگوں کی تو آمد ورفت زیادہ ہے حضرت عمر نے جواب دیا کہ کیا یہ بھی ضروری ہے کہ میں مسجد میں آؤں تو تم کو گواہ بنالوں۔ اس نے کہا کہ نہیں غصّہ کی کوئی بات نہیں ہے میں نے تمھارے باپ کو کہتے سنا ہے کہ میرے لیے ایک ایسا مرتبہ ہے جو اولاد عبدالمطلب کیلئے پوری کائنات سے بہتر ہے حضرت عمر نے جواب دیا کہ میرے باپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر کوئی کلمہ حکمت کسی منافق کے دل تک پہنچ گیا ہے تو وہ مرنے سے پہلے ہی اس کو ظاہر کر دے گا سعید نے کہا کہ آپ نے مجھے منافق بنا دیا۔
انھوں نے فرمایا کہ جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا اور یہ کہہ کر چل دیے [1]
مقصد یہ تھا کہ ابن مسیّب نے مرنے سے پہلے ہی امیرالمومنین کی فضیلت کا اظہار کر دیا۔

حضرت عمر بن علی کی یہ تند و تیز گفتگو اور آپ کا یہ سخت لہجہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آپ کی نظر میں ابن مسیّب دشمن اہلبیت اور حق سے منحرف انسان تھا۔ بلکہ تاریخ میں اس انحراف کا شاہد ایک واقعہ بھی ملتا ہے اور وہ یہ کہ جب سیدالساجدین کا انتقال ہوا تو اس شخص نے آپ کے جنازہ پر نماز نہیں پڑھی کسی شخص نے اعتراض کیا تو جواب دیا کہ دو رکعت نماز پڑھ لینا

۱: شرح النہج ج ا ص۳۷۰ الغدیر ج ۸ ص۹۰ اعیان الشیعہ ج ۳۵ ص۳۰۴
۲: شرح الابطح ص۶۶ الغدیر ج ۸ ص۹۰ اعیان الشیعہ ج ۳۵ ص۲۰۳، ص۳۰۴

ایسے رجل عظیم کی نماز جنازہ پڑھنے سے بہتر ہے۔ ظاہر ہے کہ اب ایسے افراد کی روایت کا کیا بھروسہ ہے یا انہیں ابن مسیّب کی ایک روایت اور بھی نظر آتی ہے جسمیں فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ابوبکر عمر عثمان اور علیؑ کی محبت میں عشرہ مبشرہ پہ ایمان لاکر اور معاویہ کیلئے دعائے رحمت کر کے مرجائے تو اللہ پر یہ فرض ہوجاتا ہے کہ اس سے حساب کتاب نہ کرے[1]

ابن مسیّب نے تو معاویہ کے بارے میں یہاں تک کہہ دیا ہے کہ "معاویہ کی تمام تر رغبت ذات احدیت کی طرف تھی۔ اس لیے مجھے امید ہے کہ اللہ اس پر عذاب نہیں کرے گا[2]

ذرا غور تو کریں اس شخص نے کس طرح ہزارہا ناحق خون، بے شمار پامال شدہ حقوق اور بے حد و انتہا خیانتوں اور برائیوں کو طاق نسیاں کی نذر کر دیا اور معاویہ کے اس قول سے استدلال شروع کر دیا جو اس نے اس وقت کہا تھا جب موت اس کے سر پر منڈلا رہی تھی اور حیات کے سلسلے قطع ہو رہے تھے:

"خدایا لغزشوں کو معاف کر دے، غلطیوں کو بخش دے۔ صرف تجھی سے امید رکھنے والے سے حلم کا سلوک کر، تو بڑا معفرت والا اور گنہ گاروں کا ملجا و ماوی ہے[3]

بظاہر معاویہ کا یہی مقولہ اس فرقہ کی جان ہے جو ہر گناہ کو آخر وقت کی توبہ کے لیے جائز جانتے ہیں اور شاید اسی لیے اسے فرقہ کا رئیس تسلیم کیا گیا ہے۔

۱: الغدیر ج ۱ ص ۱۳۱، تاریخ ابن کثیر ج ۸ ص ۱۳۹ - ۱۴۰،

۲: اعیان الشیعہ ج ۳۵ ص ۸۰،

۳: اعیان الشیعہ ج ۳۵ ص ۸۰،

درحقیقت اس فرقہ نے ان بنیادوں کو مستحکم کر کے انسان کو بُرے اعمال کی جرأت دلائی ہے اور یہ ایک ایسا راستہ کھول دیا ہے کہ انسان زندگی بھر گناہ و جرم کر کے آخر وقت میں چند ایسے کلمات جاری کرے جن کو دل کی گہرائیوں سے معاویہ کی طرح کوئی تعلق نہ ہو

فائدہ یہ ہوگا کہ بعد کے آنے والے ایسے بُرے شخص کے لیے رحمت خدا کی امید کریں گے اور یہ خیال کریں گے کہ ان کی طرح اللہ نے بھی ان کی تمام برائیوں کو فراموش کر دیا ہے۔ استغفراللہ!

اس موقع پر بہتر ہے کہ ہم سعید بن مسیب کی معاویہ پرستی اور بنی امیہ دوستی کو اور بھی واضح کر دیں۔ تاریخوں میں ہے کہ اس شخص سے سوال کیا گیا کہ سب سے زیادہ بلیغ اللسان کون ہے؟ تو اس نے کہا "رسول اللہ" سائل نے کہا کہ میرا سوال ان کے بارے میں نہیں ہے۔ کہنے لگا پھر معاویہ، اس کے بعد یزید، سعید بن العاص اور اس کا بیٹا عمرو[1]

اس حدیث سے بڑے واضح طریقے پر ابن المسیب کے اس انحراف کا پتا چلتا ہے جو اسے اہلبیت رسولؐ سے حاصل تھا۔ ممکن ہے کوئی شخص اس مقام پر یہ تاویل کرے کہ چونکہ راوی نے رسولِ اکرم کو مستثنیٰ کر دیا تھا۔ اس لیے اس نے جواب میں حضرت علیؑ کا نام نہیں لیا اس لیے کہ وہ انہی کے نفس و روح تھے۔ لیکن میری نظر میں یہ تاویل بھی اسی وقت صحیح ہوتی جب اس شخص کے اس شدید انحراف کا سراغ نہ مل سکتا۔

بعض لوگوں نے اس شخص کو شیعہ قرار دیتے ہوئے حضرت امام زین العابدینؑ کے خاص احباب میں شمار کیا ہے۔ حالانکہ یہ بات کسی طرح بھی قرین قیاس نہیں ہے

۱: البیان والتبیین ج ۱ ص ۳۰۲

بھلا جو شخص اہلبیتؑ کی توہین کرے، حضرت ابوطالبؑ کو کافر بتائے، امام سجادؑ کے قول کی مخالفت کرے کیا وہ انہیں کے خاص اصحاب میں شمار ہو سکتا ہے؟

یہی وجہ ہے کہ شیخ مفید نے فرمایا ہے کہ اس کا ناصبی ہونا قابلِ تردید نہیں ہے بلکہ امام مالک نے تو اسے خوارج میں شمار کیا ہے[1]

بہرحال اگر کسی صورت سے اس شخص کی وثاقت ثابت بھی ہو جائے تو پھر اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہوگا کہ یہ روایت اس کی نہیں ہے اور اس کے شاید قوی وہ دوسرے افراد بن جائیں گے جنھوں نے سعید کی طرف اس روایت کو منسوب کیا ہے

ب : سعید کے باپ جناب مسیب بن حزن تھے جن کو اپنے باپ سے میراث میں بداخلاقی ملی تھی[2] اور یہ فتح مکہ کے مسلمانوں میں سے تھے[3]

ظاہر ہے کہ ایسے شخص کا حضرت ابوطالبؑ کے احتضار کے وقت موجود ہونا غیر ممکن ہے۔ شاید اس کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح کی روایت وضع کر کے مشرکوں کی جماعت میں کچھ اضافہ کر دیا جائے۔ مختصر یہ ہے کہ ہمیں اس سلسلے میں کوئی وثاقت کی سند نہیں ملی۔ اس لیے ہم یہ بات بہ آسانی کہہ سکتے ہیں کہ یہ روایت سند کے اعتبار سے انتہائی مہمل اور واہیات ہے۔

اس کے بعد ہم چوتھی اور پانچویں روایت پر تبصرہ شروع کرتے ہیں۔

آخری دو حدیثوں کے رواۃ

(۱)

پہلے حدیث نمبر ۱ کے رواۃ پر نظر ڈالتے ہیں تاکہ ان کے بارے میں علماء کے اقوال

۱: اعیان الشیعہ ج ۳۵ ص ۸۰ ۲: نسب قریش ص ۳۲۵ ۳: اصابہ ج ۳ ص ۱۰۲ ؎

کا جائزہ لے سکیں ۔

ا : محمد بن عباد ۔ اس نام کے جتنے اشخاص بھی ہیں ان میں کوئی مجہول النسب کوئی حدیث سے جاہل، کوئی مذموم، کوئی مشتبہ اور دار قطنی کی نظر میں ضعیف ہے[1]

ب : ابن ابی عمر ۔ اس کا کچھ حال ہی نہیں معلوم ۔ تذکرہ بیکار ہے ۔

ج : مروان ابن نام سے تو ایک ٹوکری بھر سکتی ہے جسمیں کچھ کاذب، کچھ مجہول، کچھ ضعیف و منکر الحدیث، کچھ لاپروا، کچھ غیر معتبر اور کچھ ناقابل استدلال ہونگے[2]

(۲)

حدیث نمبر ۵ کے رواۃ حسب ذیل ہیں :

ا : محمد بن حاتم میمون القطیعی المعروف بالسمین ۔ ابن معین و ابن مدینی نے اسے کذاب اور فلاس نے لاشیٔ قرار دیا ہے[3]

ب : یحییٰ ابن سعید ۔ بخاری و ابو حاتم نے منکر الحدیث، نسائی نے راوی احادیث مجہولہ، ابن عدی وغیرہ نے راوی اباطیل، ابن حبان نے خطاکار[4] یحییٰ ابن بن سعید قطان نے جعلساز اور دمیاطی نے مشہور جعلساز قرار دیا ہے[5]

یاد رہے یہ وہی یحییٰ بن سعید ہے جس نے کہا تھا کہ "مجھے جعفر صادقؑ کی طرف سے کچھ شک و شبہ ہے"[6]

(۳)

دونوں حدیثوں کا سلسلہ یزید بن کیسان ۔ ابی حازم ۔ ابو ہریرہ پر آکر مل جاتا ہے

---

۱ : المیزان ج ۳ ص ۳ ، ۲ : المیزان ج ۳ ص ۱۵۹-۱۶۱ ،

۳ : المیزان ج ۳ ص ۳ ، دلائل الصدق ج ۲ ص ۵۹ ، ۴ : المیزان ج ۲ ص ۲۵۹ ،

۵ : دلائل الصدق ج ۱ ص ۶۸ ، ۶ : الغدیر ج ۵ ص ۲۱۲ ،

ا : یزید ابن کیسان ۔ ذہبی نے اس نام کے دو آدمیوں کا ذکر کیا ہے ایک وہ ہے جو ابو حازم سے روایت کرتا ہے اور یہی وہ یزید ہے جس سے ہماری بحث و گفتگو ہو رہی ہے۔ اس کو ابو حاتم نے ناقابلِ استدلال، یحییٰ بن سعید قطان نے ناقابلِ اعتماد قرار دیا ہے[1]۔ ذہبی کا کہنا ہے کہ یزید کی روایتیں یحییٰ قطان نے بیان کی ہیں۔ خدا جانے یہی قطان ہے جس نے اسے ناقابلِ اعتماد قرار دیا ہے یا کوئی اور ہے ؟

ب : ابو حاتم اشجعی ـــ اس نام کا اب تک سراغ نہیں مل سکا ہے۔

ج : ابو ہریرہ ۔ یہ وہ بزرگ ہیں جن کے نام، نسب سبھی میں اختلاف ہے بلکہ یہ لقب متعدد حضرات کو دیا گیا ہے[2]۔ بہرحال آپ وہی حضرت ہیں جنکی روایات کا مقابلہ غیر ممکن ہے[3]۔ چنانچہ صرف بقی بن مخلد کی مسند میں آپ کی پانچہزار تین سو کے قریب روایتیں موجود ہیں[4]۔

یہی وہ حضرت ہیں جو بقول خود چادر بچھا کر روایتیں اکھٹی کیا کرتے تھے[5]۔ خدا جانے اس چادر میں کیا جمع کرتے تھے ؟! اور وہی جانے کہ اس چادر والے جسدِ مبارک میں کیا تھا ؟

میرا خیال ہے کہ یہ عبارت بھی اسی چادر میں کہیں سے چپک گئی تھی۔ اور آپ نے جھاڑتے وقت اسے حدیث خیال کر کے بیان کر دیا ہے حالانکہ وہ واقعی حدیث نہیں تھی جسکے اسباب حسب ذیل ہیں :

ابو ہریرہ ان لوگوں میں سے تھے جن کا بیوپار معاویہ کے چور بازار میں ہوتا تھا جو حضرت علیؑ کے خلاف روایتیں وضع کر کے معاویہ کے ہاتھ بیچا کرتے تھے۔

---

۱ : المیزان ج ۳ ص ۳۱۱ ۲ : اصابہ و استیعاب ج ۴ ص ۲۰۲ ص ۲۰۰، اعلام النبلاء ج ۲ ص ۴۱۷، ۳ : اصابہ ج ۴ ص ۲۰۳

۴ : اصابہ، الغدیر ج ۷ ص ۱۱۱، ۵ : اعلام النبلاء ج ۲ ص ۴۵۳، ۶ : اصابہ ج ۴ ص ۲۰۵،

جیسا کہ ابن ابی الحدید نے ابوجعفر اسکافی سے نقل کیا ہے:

"معاویہ نے صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت کو حضرت علیؑ کی مذمت میں روایتیں وضع کرنے کے لیے متعین کیا اور پھر ہر ایک کے لیے کافی انعام بھی مقرر کیے چنانچہ ان لوگوں نے بھی خوب خوب حدیثیں گھڑیں انہی کرایہ کے راویوں میں ابوہریرہ، عمرو بن العاص، مغیرہ بن شعبہ اور عروہ بن زبیر تھے"[1]

ابوہریرہ امیر المومنینؑ کے خلاف روایتیں وضع کرنے کے لیے کرایہ پر چلا کرتے تھے۔ جیسا کہ ہماری مقدمہ والی روایت سے واضح ہے کہ آپ نے حضرت علیؑ کو فتنہ گر ثابت کر کے خدا اور رسول و ملائکہ اور انسانوں کی لعنت کا مستحق بنا دیا تھا۔ استغفر اللہ!

آپ کا سلوک معاویہ کے ساتھ بھی فقط طمع دنیا کی وجہ سے رہا ہے جب اس نے کچھ دے دیا چپ ہو گئے جب ہاتھ روک لیا شروع ہو گئے[2]

ہم آپ کے بارے میں علماء امت کے اقوال پیش کرنے سے پہلے آپ ہی کی زبانی آپ بیتی سن لینا چاہتے ہیں۔:

"مجھ سے رسول اکرمؐ نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ میں نے عرض کی میں دوس کا رہنے والا ہوں۔ فرمایا کہ دوس میں تو کوئی خیر والا سنا ہی نہ تھا"[4]

ظاہر ہے کہ اس کلام میں حضرت نے کسی کو ایک کو بھی مستثنیٰ نہیں کیا لہذا آنجناب کو بھی شامل ہونا چاہیے۔

ابوجعفر اسکافی کہتے ہیں:

۱: شرح النہج ج ۱ ص ۳۵۸ ۲: شرح النہج ج ۱ ص ۳۵۹

۳: سیر اعلام النبلاء ج ۲ ص ۴۴۲ ۴: کتاب مذکور ج ۲ ص ۴۲۵

"ابوہریرہ ہمارے بزرگوں کی نظروں میں مشکوک ہے اس کی روایتیں ناپسندیدہ ہیں حضرت عمر نے اس کو تازیانہ سے یہ کہہ کر مارا تھا کہ اتنی زیادہ روایتیں خود ہی جھوٹ کی دلیل ہیں[1]۔ دوسرے موقع پر فرمایا تھا کہ ان حدیثوں کو چھوڑ دو ورنہ پھر تمھیں دوس یعنی یمن کی طرف واپس کر دونگا[2]۔

کیا آپ کا خیال ہے کہ حضرت عمر نے اس مار پیٹ میں ظلم کیا ہوگا اور ایک غیر مستحق کو شہر بدر کرنے کی دھمکی دی ہوگی؟

میں تو خلیفہ کے بارے میں یہی فیصلہ کرونگا کہ آپ کے ضمیر نے یہ گوارا نہیں کیا کہ آپ اس قسم کی جعلی روایتیں رسول اکرمؐ کی طرف منسوب ہوتے ہوئے دیکھیں اور کوئی اقدام نہ کریں اسی لیے آپ نے مرمت کر کے شہر بدر کرنیکی دھمکی دیدی اتفاق سے یہ مرمت کا واقعہ صرف ایک ہی دفعہ کا نہیں ہے بلکہ خود ابوہریرہ کا بیان ہے کہ جب وہ بحرین میں حضرت عمر کے عامل تھے تو انھوں نے ان سے کہا تھا کہ اے دشمن خدا و کتاب خدا تو نے مال خدا سے چوری کی ہے[3]۔

بھلا وہ انسان جو عمر جیسے سخت گیر اور تند مزاج انسان کے عہد خلافت میں ایسی جرأتیں کر سکتا ہے ان کے بعد اس کا کیا عالم رہا ہوگا؟ یہی تو وجہ تھی کہ جب عہد عمر کے بعد ابوسلمہ نے اس سے سوال کیا کہ کیا یہی عالم عمر کے دور میں بھی تھا تو جواب میں فرمایا کہ اگر عمر کے عہد میں اس طرح بیان کرتا تو وہ تازیانہ سے اصلاح کر دیتے[4]۔ دوسری مرتبہ فرمایا کہ اگر ان احادیث کو عمر بن الخطاب کے زمانہ میں بیان کرتا تو دُرّہ سے مرمّت کرتے[5]۔

۱: شرح النہج ج ۱ ص ۳۶۰ ۲: اعلام النبلاج ۲ ص ۴۳۴ العدیرج ۶ ص ۲۹۵ ۳: شرح النہج ج ۳ ص ۱۰۴ فتوح البلدان ص ۱۱۲، اعلام النبلاج ۲ ص ۴۴۰، الغدیرج ۶ ص ۲۷۱ ۴: العدیرج ۶ ص ۲۹۵ اعلام النبلاج ۲ ص ۴۳۳، ۵: العدیرج ۶ ص ۲۹۵، اعلام النبلاج ۲ ص ۴۳۳ تا ۴۳۴

لیکن افسوس کہ یہ تصور بھی ان کو اس حرکت سے باز نہ رکھ سکا۔ یہاں تک کہ حضرت عمر کو تازیانہ اٹھانے کی ضرورت پڑ ہی گئی اور کچھ تھوڑا سا خون بھی بہہ گیا۔ ظاہر ہے کہ جب عمر کے رد و کد کا یہ حال ہے تو معاویہ کے دور میں کیا رنگ ہوگا؟ جبکہ بجائے تازیانہ کے کافی مقدار میں انعامات مل رہے ہوں اور ایک ایک جھوٹی روایت پر دولت لٹ رہی ہو۔

ابراہیم تیمی کا کہنا ہے کہ ہمارے بزرگ حضرات ابوہریرہ کی صرف اُن روایتوں پر اعتماد کرتے تھے جن میں جنّت و جہنّم کا تذکرہ ہو[1]
الحمدللہ کہ مذکورہ روایت دونوں سے خارج ہے، علاوہ اس کے کہ جب ان تمام روایتوں کو صرف بے اعتباری کی وجہ سے ترک کیا گیا تھا تو پھر دیگر مسائل میں اس پر اعتماد کیسے ہو سکتا ہے؟ شعبہ کی رائے ہے کہ یہ جعلساز تھا[2] مگر افسوس کہ ذہبی نے صحابہ کی عدالت کا پردہ قائم کر کے اس کا بھرم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اعمش کہتے ہیں کہ ابراہیم ایک صحیح الحدیث بزرگ تھے ہیں تمام روایتیں انھیں سنا کر ان سے تصدیق کرایا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے ابوصالح کی وہ روایات بیان کیں جو ابوہریرہ سے مروی تھیں تو انھوں نے فرمایا ابوہریرہ کا ذکر مت کرو۔ علماء نے اس کی اکثر حدیثوں کو ترک کر دیا ہے[3]
حضرت امیرالمومنینؑ سے روایت کی گئی ہے کہ رسول اکرمؐ پر سب سے زیادہ بہتان باندھنے والا ابوہریرہ تھا[4]
ظاہر ہے کہ امام کے اس ارشاد کے بعد ابوہریرہ کی افترا پردازیوں کی کوئی وقعت نہیں ہے

۱: شرح النہج ص۳۶۱، اعلام المنلاج ۲ ص۲۳۸ ۲: اعلام المنلاج ۲ ص۲۳۰
۳: شرح النہج ج۱ ص۳۶۰ اعلام النبلاج ۲ ص۲۴ ۴: شرح النہج ج۱ ص۳۶۰

رہ جاتی ہے، اس لیے کہ ہمارے سامنے دو ہی راستے ہیں یا ابوہریرہ کی خاطر امام کی تکذیب کریں یا امام کے قول پر اعتماد کرتے ہوئے ابوہریرہ کی روایات کو ترک کر دیں[1]

امام ابویوسف کہتے ہیں کہ میں نے ابوحنیفہ سے سوال کیا کہ اگر کوئی روایت ہمارے قیاس کے خلاف ہو تو کیا کریں؟ انھوں نے فرمایا کہ اگر راوی معتبر ہے، تو روایت پر عمل کرو ورنہ قیاس پر عمل ہوگا۔ آخر کلام میں آپ نے فرمایا کہ تمام صحابہ عادل ہیں علاوہ بعض کے اور اُن میں سے ایک ابوہریرہ بھی ہے[2]

کہا جاتا ہے کہ جب ابوہریرہ معاویہ کے ساتھ کوفہ آیا تو اس کا دستور تھا کہ شام کے وقت باب کندہ کے پاس نشست کیا کرتا تھا۔ اتفاقاً ایک دن ایک جوان بھی آکر بیٹھ گیا (یہ غالباً اصبغ بن نباتہ تھے) اور کہنے لگا اے ابوہریرہ خدا کو حاضر ناظر جان کر بتا کیا تم نے رسولِ اکرمؐ سے یہ حدیث سنی ہے؟ کہ "خدایا علیؑ کے دوست کو دوست اور علیؑ کے دشمن کو دشمن قرار دے" اس نے کہا ہاں۔ جوان نے برجستہ کہا خدا شاہد ہے کہ تو نے دشمن علی سے دوستی اور دوست علیؑ سے دشمنی کی ہے اور یہ کہہ کر روانہ ہو گیا[3]

ابوالاصبغ بن نباتہ امیرالمومنینؑ کا خط لیکر معاویہ کے پاس پہنچے گیا دیکھا کہ بے ایمانوں کا ایک ہجوم ہے عمرو بن عاص، ذوالکلاع، حوشب ابن عمر، ولید بن عقبہ، شرجیل ابوہریرہ، ابودردا سب ہی بیٹھے تھے۔

۱: شرح النہج ج ۱ ص ۳۶۰ ، ۲: ابوہریرہ ص ۳۹ ،

۳: شرح النہج ج ۱ ص ۳۶۰ ، ابوہریرہ ۲۹ ، الغدیر ج ۱ ص ۳۶۰ ،

ابو الاصبغ نے معاویہ سے سخت لہجے میں گفتگو کی اور آخر میں عمر عاص کی طرف مخاطب ہوئے۔ اے صحابیٔ رسول خدا ئے وحدہٗ لاشریک اور رسول اکرمؐ کی قسم یہ بتاؤ کہ آیا غدیر خم میں رسول اکرمؐ سے یہ سنا ہے یا نہیں من کنت مولاہ فھٰذا علی مولاہ۔ ابوہریرہ نے کہا سنا تو ہے۔ ابو الاصبغ نے جواب دیا تو پھر تو دشمنِ علیؑ کا دوست اور محبِ علیؑ کا دشمن ہے۔

ابوہریرہ نے ایک سرد آہ کھینچی اور کہنے لگا انا للّٰہ وانا الیہ راجعون[۱]۔

بسر بن ارطاۃ کے مظالم کے بعد جاریہ بن قدامہ السعدی مدینہ آئے۔ ابوہریرہ نماز جماعت کیلئے کھڑے ہو چکے تھے۔ جیسے ہی انھیں یہ خبر ملی فوراً فرار کر گئے۔ جاریہ نے کہا کہ خدا کی قسم اگر یہ بلی والا مل جاتا تو فوراً اسکی گردن اڑا دیتا[۲]۔

کہا جاتا ہے کہ ابوہریرہ روزانہ بارہ ہزار تسبیح پڑھتے تھے اور کہتے تھے بقدر گناہ تسبیح کرتا ہوں[۳]۔

ہمیں اس روایت پر کوئی اعتراض نہیں ہے نہ ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اتنی کثیر عبادات کے بعد اتنی بے انتہا روایتوں کیلئے وقت کہاں سے نکال لیتے تھے۔ جبکہ فکر معاش بھی دامنگیر تھی اور معاویہ کی مصاحبت بھی ضروری تھی۔

ہم تو صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جس مقدار میں آپ نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا ہے وہ بڑی ہولناک مقدار ہے اور میرے خیال میں گناہ نہ کرنا اس استغفار سے بہتر تھا افسوس یہ ہے کہ بعض ایسے اشخاص بھی پیدا ہو گئے جو گناہوں کی دعوت یہ کہہ کر دینے

۱: تذکرۃ الخواص ص ۹۱-۹۲، الغدیر ج ۱ ص ۲۰۲ ۲: طبری ج ۴ ص ۱۰۷، کامل ج ۳ ص ۱۹۳،

۳: سیر اعلام النبلاء ج ۲ ص ۴۳۹،

لگے کہ رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ اگر تم لوگ گناہ نہیں کرو گے تو اللہ تمھیں ختم کر کے ایک ایسی قوم پیدا کرے گا جو گناہ کرے تاکہ یہ لوگ استغفار کریں اور اللہ بخشے۔"

اس حدیث کی پوری پوری حمایت استاد خالد محمد خالد نے کی ہے، ہمیں کچھ کہنا نہیں ہے صرف اشارہ کافی ہے۔

ابوھریرہ فکری اعتبار سے کمزور اور عقلی لحاظ سے بڑا ضعیف تھا۔ ابتدائے عمر میں یہ ایک بے ارزش انسان تھا اس لیے معاویہ کے تقرب کے بعد اس کے حواس جاتے رہے۔ کبھی بچوں کے ساتھ کھیلتا تھا[1] اور شاید اس کے جواز کیلئے رسول اکرمؐ سے حدیثیں بھی بیان کرتا رہا ہو خصوصاً ایسے احوال میں جب حدیثوں کی تجارت کا بازار اپنے پورے شباب پر تھا۔ اور ایسی ایسی حدیثیں وضع ہوتی تھیں مثلاً "جس نے عکہ کی پیاز کھائی گویا مکہ کی زیارت کر آیا۔"

کبھی معاویہ کی طرف سے والی بن کر مدینہ میں علیؑ کی مخالفت میں بیان دیتا تھا اور انھیں خدا اور رسول و ملائکہ اور انسان کی لعنت کا مستحق قرار دیتا تھا۔ استغفرک یارب!

روایات میں یہاں تک ہے کہ یہ شخص مدینہ میں خطبہ پڑھتا تھا: "شکر ہے اس خدا کا جس نے دین کو استحکام اور ابوہریرہ کو امام بنایا ہے" اور تمام حضار بزم ہنستے تھے۔

۱: شرح النہج ج ۱ ص ۳۶۰۔ ۲: ابوہریرہ کی حکومت مدینہ معاویہ کی طرف سے کوئی جدید اقدام نہ تھا۔ بلکہ اس سے پہلے یہ عہدہ بسر ابن ارطاۃ کے حوالہ ہو چکا تھا جس کا انجام اہل تاریخ سے پوشیدہ نہیں ہے یہی وہ حکومتیں تھیں جنھوں نے یزید کو واقعہ حرہ کا موقع دیدیا تھا۔ معاویہ نے جب ابوہریرہ کو والی بنایا تو اعلان کر دیا کہ بسر کے بعد ابوہریرہ حاکم ہوا ہے لہٰذا اسکی مخالفت نہ کرنا (شرح النہج ج ۱ ص ۱۱۵ ابوہریرہ ص ۲۵ الغدیر ج ۱۱ ص ۲۴ طبری ج ۴ ص ۱۰۶ کامل ج ۳ ص ۱۹۳)

۳: شرح النہج ج ۱ ص ۳۶۰، سیر اعلام النبلاء ج ۲ ص ۴۲۴۔

یعنی خطبہ تبلیغ، دعوت نشر و اشاعت اور تہذیب و اخلاق سے گزر کر مضحکہ خیزی اور تماشہ کا موضوع بن گیا تھا۔

کبھی بازار میں چلتے چلتے لوگوں کو لات مار کر گرا دیتا تھا اور کہتا تھا "دیکھتے نہیں امیر آرہا ہے"[1]

ابن ابی الحدید نے ان تمام حالات کو نقل کرنے کے بعد تحریر کیا ہے کہ ان تمام بیانات کا ماخذ ابن قتیبہ کی کتاب المعارف ہے۔ اور ابن قتیبہ کا قول اس مسئلے میں حجت ہے اس لیے کہ وہ ایک بے غرض انسان تھا[2]

ابوہریرہ نے جب سے یہ دیکھ لیا تھا کہ میری خواہشات کا علاج صرف معاویہ کے پاس ہو سکتا ہے۔ اس وقت سے برابر اسی کے پاس رہا کرتا تھا۔ اٹھنا، بیٹھنا، چلنا پھرنا سب اسی کے ساتھ یہاں تک کہ ایک مرتبہ معاویہ نے اسے[3] اور نعمان بشیر کو یہ پیغام دیکر

۱: ۲: شرح النہج ج ۱ ص ۳۶۰   ۳: بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوہریرہ کا ہمسفر ابودرداء تھا۔ بنابریں ممکن ہے کہ یہ واقعہ دو مرتبہ پیش آیا ہو بلکہ بعض روایات میں یہاں تک ہے کہ جب ابوہریرہ پلٹ کر آیا تو عبدالرحمٰن بن غنم نے اس پر عتاب کیا: "عجیب بات یہ ہے کہ تم دونوں نے یہ اقدام کیونکر کیا؟ تم نے خلافت کو شوریٰ کے حوالہ کیا۔ اور جب انصار و مہاجرین اہل حجاز و عراق بلکہ مخالفین سے بہتر افراد نے بیعت کر لی تو تم نے انحراف شروع کر دیا۔ بھلا طلقاء کو خلافت سے کیا تعلق ہے یہ سب تو حزب مخالف کے رئیس تھے" یہ سن کر دونوں نے اظہار ندامت کیا اور توبہ کر لی (استیعاب ج ۲ ص ۴۱۱ الغدیر ج ۱۰ ص ۳۲۰، ۳۲۱۔ اسد الغابہ ج ۳ ص ۳۱۸) ہمیں اس توبہ سے بحث نہیں ہے کہ آیا یہ صحیح ہے یا غلط۔ ہمارا سوال تو صرف یہ ہے کہ کیا اس توبہ کے بعد بھی معاویہ کا ہم جلیس ہونا جائز تھا۔ کیا خون عثمان کا ناحق مطالبہ اس توبہ سے ساز گار تھا؟ کیا امیر المومنینؑ اور ان کے والد بزرگوار کی تنقیص و توہین یہ سب توبہ کے ارکان میں داخل تھے، ابودرداء کا تو صریحی قول ہے کہ میں اپنے دل کو باطل کا عادی بناتا ہوں تاکہ باطل اسکی نظر میں حق سے زیادہ قوت پیدا کر لے۔ کامل مبرد ج ۲ ص ۱۶۸۔

بھیجا کہ علیؑ سے قاتلانِ عثمان کا مطالبہ کریں، معاویہ کا مقصد صرف یہ تھا کہ علیؑ کا انکار ایک بہانہ بن جائے۔ اور یہ جانے والا پلٹ کر لوگوں کے سامنے ان کی مذمت کرے۔ ورنہ اسے حضرت علیؑ کے موقف سے پوری پوری واقفیت تھی!

جب دونوں نمائندے حضرت کے پاس پہنچے تو ابوہریرہ نے اپنی درخواست پیش کی، نعمان نے اس کی تائید کی، حضرت نے ابوہریرہ سے رُخ موڑ کر نعمان کو سمجھانا شروع کر دیا تھوڑی دیر کے بعد نعمان نے رضامندی کا اظہار کر دیا تو حضرت نے سکوت فرمالیا لیکن ابوہریرہؓ نے صاف صاف کہہ دیا کہ ہمیں معاویہ کا ساتھ دینا ہے[1] اس لیے کہ اس کی خاطر خواہ رقم تو وہیں مل سکتی تھی بلکہ اگر کچھ کمی بھی پڑ جائے تو بے شمار حدیثیں ہی کافی تھیں۔

یاد رہے کہ یہ پانچ ٹوکریوں کی روایت ہماری طرف سے نہیں ہے بلکہ یہ خود حضرت ابوہریرہ کا بیان ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میرے پاس پانچ ٹوکری احادیث ہیں جن میں سے میں نے دو ٹوکریوں کو ظاہر کیا ہے اگر کہیں تیسری کو ظاہر کرتا تو مجھے پتھروں سے مارتے[2]

شاید آپ نے انہی دو کو ظاہر کیا تھا جس پر فرماتے تھے "میری اتنی تکذیب کی گئی کہ لوگ مجھے کنکریاں مارنے لگے اور مجھ پر کوڑا پھینکنے لگے"[3] اور اگر کہیں تیسری کو ظاہر کر دیتے تو لوگ بنگنیوں سے مرمت کرتے[4] پھر آپ تصور کریں کہ اگر چوتھی اور پانچویں کا اظہار ہو جاتا تو کیا حشر ہوتا؟

شاید اسی کی طرف ایک مقام پر اشارہ فرماتے ہیں "میں نے رسول اکرمؐ سے دو ظرف بھر روایتیں جمع کی ہیں۔ ایک کو منتشر کر دیا ہے اور ایک محفوظ ہے۔ اگر اس کو بھی ظاہر کر دوں تو میری گردن اڑا دی جائے"[5]

۱: شرح النہج ج ۱ ص ۳۱۳۔ ابوہریرہ ص ۲۲ تا ۲۳ ؛ ۲: ابوہریرہ ص ۳۸ حلیۃ ابی نعیم ص ۳۸۱۔ اعلام النبلاء ج ۲ ص ۴۲۹۔ ۴۴۲ تا ۳ : کامل مبرد ج ۲ ص ۱۲۴ تا ۴ : اعلام النبلاء ج ۲ ص ۴۴۲

۵ : اعلام النبلاء ج ۲ ص ۴۳۳ تا

ابوہریرہ نے اس مقام پر اپنے بیان میں بڑی ہنرمندی سے کام لیا ہے۔ آپ نے اپنے طرزِ بیان سے احادیث کو ایک مادی شئے ثابت کیا ہے جیسے ظرف و برتن، چادر یا رومال میں باندھ لیا جائے جس پر ایک طرف احادیث کا انبار ہو اور دوسری طرف جوں کی رفتار[1]!

حضرت علامہ شرف الدین موسوی طاب ثراہ نے اپنی کتاب "ابوہریرہؓ" میں ان تمام مطالب کو اس انداز سے بیان کر دیا ہے کہ اب مزید کسی گفتگو کی گنجائش نہیں ہے۔ آپ نے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے ان چالیس حدیثوں پر تنقید کی ہے جو ابوہریرہ نے خالقِ عالم، پیغمبران کرام اور اولیائے خدا کی توہین کے لیے جعل کی تھیں۔ چنانچہ انھیں چالیس میں سے ایک روایت یہ بھی ہے جس سے ہم بحث کر رہے ہیں۔

ہم ابوہریرہ کی روایت کو قبول کرنے سے معذور ہیں۔ ہمارے سامنے علمأ رجال کے اقوال ہیں۔ ہمارے سامنے ان کی انحرافی سیرت ہے اور ہمارے علم میں اس کے وہ بیانات ہیں جن میں حضرت امیرالمومنینؑ کو مستحق لعنت قرار دیا ہے استغفراللہ!

حدیثِ مذکور کے اندازِ بیان کو دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوطالب کے سامنے ابوہریرہ کھڑا دیکھ رہا تھا کہ رسولؐ اکرم کلمہ کی تلقین کرتے ہیں اور وہ انکار کر رہے ہیں۔ اور اس پر آیت نازل ہو رہی ہے۔ اس لیے کہ ابوہریرہ کا بیان اس طریقے سے ہے کہ آنحضرتؐ نے اپنے چچا سے وقت آخر اس طرح ارشاد کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ بیان وہی دے سکتا ہے جو روایت کا شاہد عینی ہو۔

۱: سیر اعلام النبلاء ج ۲ ص ۴۲۹ ؎

حالانکہ کھلی ہوئی بات ہے کہ جس دن حضرت ابوطالبؑ کا انتقال ہوا ہے
اس دن ابوہریرہ یمن میں تھا، بلکہ اس وقت تک اس نے نہ رسولِ اکرمؐ کی صورت
دیکھی تھی نہ آپ کے جمالِ مبارک پر اسکی نظر پڑی تھی۔ اس لیے کہ حضرت ابوطالبؑ
کا انتقال ہجرت کے تقریباً تین سال پہلے ہوا تھا۔ اور ابوہریرہ نے ارضِ اسلام پر
اس وقت قدم رکھا ہے جب آنحضرتؐ خیبر میں تشریف لے گئے تھے یعنی ۷ھ میں[1]
اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ واقعہ ابوہریرہ کے مکہ آنے سے دس سال پہلے کا
ہے اور ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اس قسم کے بیانات کی کیا قیمت رہ جاتی ہے۔
البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ اس وقت ابوہریرہ نے خواب دیکھا ہو اس لیے کہ خواب کے
حدود غیر معین اور اس کی وسعت غیر محدود ہے۔

آیت مَاکَانَ النَّبِیُّ پر ایک نظر

جب ہم اس حدیث کے اسناد کا صحیح مواخذہ کر کے اس کے تار و پود بکھیر چکے
تو اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مزید وضاحت کیلئے آیتِ مبارکہ پر بھی ایک نظر
ڈال لی جائے۔ تاکہ آیت کی روشنی میں بھی حدیث کی موضوعیت اور مجہولیت ظاہر کی جاسکے

(۱)

بخاری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں مذکورہ بالا آیتیں حضرت ابوطالبؑ
کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ حالانکہ جب ہم تاریخ پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں
معلوم ہوتا ہے کہ پہلی آیت مدینہ میں نازل ہوئی ہے اسلئے کہ سورہ برأت مدنی ہے
اور تبلیغ برأت کا قصہ شہرۂ آفاق حیثیت رکھتا ہے بلکہ بعض اقوال کی بنا پر یہ قرآن

۱: اصابہ ج ۴ ص ۲۰۳۔ سیر اعلام النبلاء ج ۲ ص ۲۴-۴۲۳-۴۲۵-۴۳۶

کا آخری سورہ ہے[1]

جس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں آیتوں میں تقریباً دس سال کا فاصلہ ہے۔

(۲)

یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مذکورہ بالا آیت فتح مکہ کے بعد مدینہ میں نازل ہوئی ہے جیسا کہ سورۂ برأت کے نزول کے بارے میں معلوم ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آیت میں اور حضرت ابوطالب کی وفات میں کم از کم ۸ سال کا فاصلہ ہے۔

یعنی حضرت رسول اکرمؐ حضرت ابوطالبؑ کی وفات کے بعد ۸ سال تک ان کیلئے حسب وعدہ استغفار کرتے رہے اس کے بعد آیت مذکورہ نے آکر ممانعت کی کہ اب اس کے بعد نبی کو مشرکین کیلئے استغفار کرنے کا حق نہیں ہے۔

ہمارا سوال یہ ہے کہ وفاتِ ابوطالبؑ سے لیکر نزول آیت تک رسول اکرمؐ ان کیلئے کیونکر استغفار کرتے رہے جبکہ رسولؐ پر متعدد آیتیں کفار سے ترکِ موالات اور ان کیلئے ترکِ استغفار کے سلسلے میں نازل ہو چکی تھیں جیسا کہ ہم بعض کی طرف اشارہ کر چکے ہیں اور بعض یہ ہیں:

ا: لا تجد قوماً یومنون باللّٰہ والیوم الآخر یوادون من حاد اللّٰہ ورسولہ ولو کانوا اٰبائھم۔ (ایمان والے دشمنانِ خدا اور رسول سے دوستی نہیں کر سکتے، چاہے وہ ان کے باپ ہی کیوں نہ ہوں) یہ آیۂ مبارکہ مدینہ میں سورۂ برأت سے سات سورہ پہلے[2] بلکہ بقول بعض جنگ بدر کے موقع

۱: صحیح بخاری ج ۳ ص ۱۸۵، کشاف ج ۱ ص ۵۷۰ حاشیہ کشاف ج ۲ ص ۱۵۳ بیضاوی ج ۲ ص ۲۷۴ مجمع البیان ج ۱۰ ص ۵ تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۳۳۱۔ اتقان ج ۱ ص ۲۷، ۱۵، ۲۲ الغدیر ج ۸ ص ۱ بحوالہ ابن ابی شیبہ، بخاری، نسائی، ابن ضریس، ابن منذر، نحاس، ابو الشیخ، ابن مردویہ

۲: الغدیر ج ۸ ص ۱، اتقان ج ۱ ص ۱۷ (۱ ص ۲۶ فاصلہ چھ سورہ کا)

پر ۲ سنہ ھ میں نازل ہوئی ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ جنگ احد کے موقع پر ۳ سنہ ھ[2] میں نازل ہوئی ہے۔ بعض نے اسے مکی بھی شمار کیا ہے[3]۔

بہرحال ان تمام اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ آیت مذکورہ سے پہلے رسول اکرمؐ کو ممانعت کی جا چکی تھی لیکن وہ اپنی دُھن میں لگے ہوئے تھے۔ اور برابر استغفار کرتے چلے آرہے تھے۔ استغفراللہ!

۲: یاایہا الذین آمنوا لا تتخذوا الکافرین اولیاء من دون المومنین أتریدون ان تجعلوا للہ علیکم سلطانا مبینا ○

"اسے اہل ایمان کفار کو اپنا دوست مت بناؤ"

نحاس کے قول کے مطابق یہ آیت مکی ہے اور بعض اقوال کی بنا پر وقت ہجرت نازل ہوئی ہے[4]۔ بعض کے قول کی بنا پر مدنی ہے۔ اس لیے کہ حضرت عائشہ کا ارشاد ہے کہ سورۂ نساء میری حاضری کے بعد رسول پر نازل ہوا ہے[5] یعنی ہجرت کے کچھ بعد[6]۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ آیت سورہ برأت سے ۲۱ سورہ[7] پہلے نازل ہو چکی تھی۔ اور رسول اکرمؐ مسلسل استغفار میں مشغول تھے۔

۳: لا یتخذ المومنون الکافرین اولیاء من دون المومنین أیبتغون عندھم العزۃ ○

(یہ لوگ جو کافروں سے دوستی کرتے ہیں کیا انھیں ان سے کچھ عزت مل جائیگی؟)

یہ سورہ نسا کی آیت ہے اور وہ بھی برأت سے پہلے نازل ہوا ہے۔

۱: الغدیر ج ۸ ص ۱۰ بحوالہ ابوحاتم، ابوحاکم، ابونعیم، بیہقی، ابن کثیر ج ۲ ص ۳۲۹ تفسیر شوکانی ج ۵ ص ۱۸۹ ۲: الغدیر ۳: اکثر مفسرین ۴: اتقان ج ۱ ص ۱۲

۵: اتقان ج ۱ ص ۱۲ ۶: بخاری ج ۳ ص ۱۳۱ ۔ الغدیر ج ۸ ص ۱۱

۶: الغدیر ۷: اتقان ج ۱ ص ۲۶

۴ : لا یتخذ المومنون الکافرین اولیاء من دون المومنین ومن یفعل ذالک فلیس من اللہ فی شئ الا ان تتقوا منہم تقاۃ O

"اہل ایمان کو چاہیے کہ کافروں سے دوستی نہ کریں، اگر ایسا کریں گے تو اللہ سے کچھ نہ ملے گا۔ یہ اور بات ہے کہ تقیہ میں یہ جائز ہے"

یہ آیت ابتدائے آل عمران میں ہے اور یہ سورہ ۸۰ سے زیادہ آیتوں تک نجران کے وفد کی آمد پر نازل ہوا ہے[1] جو ہجرت کے بعد کا واقعہ ہے[2] بلکہ بعض کا خیال ہے کہ روز احزاب ۵ھ میں عبادہ بن صامت کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے[3]

بہرحال ان دونوں اقوال کی بنا پر یہ سورۂ برأت سے تقریباً ۲۴ سورہ پہلے ہے[4]

۵ : سواء علیہم استغفرت لہم ام لم تستغفر لہم

"اے رسول آپ استغفار کریں یا نہ کریں اللہ انھیں نہ بخشے گا"

اس آیت کا نزول غزوہ بنی مصطلق کے سال ہوا ہے جو نزول برأت سے پہلے کا واقعہ ہے[5]

بہرحال اس قسم کی نہ جانے کتنی آیتیں ہیں جن میں سورۂ برأت سے پہلے پہلے بھی رسول اکرمؐ کو استغفار سے روک دیا گیا تھا لیکن اس کے بعد بھی آپ سورۂ برأت کے نزول تک برابر استغفار کرتے رہے۔

حدیث مذکورہ میں صراحت کے ساتھ ذکر ہوا ہے کہ رسول اکرمؐ آیت مذکور کے

۱: السیرۃ الہشامیہ ج ۱ ص ۲۲۵، اسباب النزول ص ۴۳، تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۳۴۳

۲: ۳: الغدیر ج ۸ ص ۱۱۰ ۴: الغدیر ج ۸ ص ۱۱۰ اتقان ج ۱ ص ۱۱ (ص ۲۶ پر پندرہ سورتوں کا فاصلہ مذکور ہے اور منظور بیان جبری میں ۲۵ سورتوں کا) ۵: الغدیر ج ۸ ص ۱۱۰ اتقان ج ۱ ص ۱۱

نزول تک برابر استغفار کرتے رہے ہیں۔ حالانکہ اس قدر اہتمام انتہائی مودت و محبت کی علامت ہے جس سے قرآن کریم نے صریحی طور پر منع کیا ہے۔ کیا کوئی مسلمان رسول اکرمؐ کو بھی مخالفِ قرآن کہہ سکتا ہے؟ کیا اس آیت کے نزول سے پہلے حضرت کی نظر میں آیاتِ الٰہیہ کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی؟ کیا اسی سورۂ مبارکہ کی باقی آیتیں حضرت کو نہ روک سکی تھیں کہ اس آیت کی نوبت آ گئی! خدا معلوم ان تمام مشکلات کو کس طرح حل کیا جائیگا اور رسول اکرمؐ کی اس کھلی ہوئی توہین کو کس انداز سے سراہا جائیگا۔

خدایا ہمیں اس بات سے محفوظ رکھنا کہ ہم تیرے رسولؐ کو اذیت دے کر تیرے عذاب کے مستحق بنیں!

(۳)

جب ہم ان آیات اور اقوال پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ متعدد اقوال تو نزول آیت کے بارے میں ایسے ہیں جو اس روایت سے صریحی طور پر معارض ہیں اس کی حقیقت کو بے نقاب کر رہے ہیں جن میں سے ہم صرف بعض کا تذکرہ کر رہے ہیں:

۱: جناب امیرؑ سے منقول ہے کہ آپ نے ایک شخص کو اپنے مشرک باپ کے لیے استغفار کرتے ہوئے دیکھ کر ٹوک دیا تو اس نے کہا کہ آخر حضرت ابراہیمؑ نے بھی تو استغفار کیا تھا! آخر مسئلہ رسالتمآبؐ کی خدمت میں پہنچا تو آیہ مذکورہ نازل ہوئی[۱] اس حدیث سے صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ مشرکین کیلئے استغفار کی حرمت

۱: الغدیر ج ۸ ص ۱۲ بحوالہ طیالسی ابن ابی شیبہ، احمد ترمذی، نسائی، ابویعلیٰ، ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم، ابوالشیخ، حاکم، ابن مردویہ، بیہقی در شعب الایمان، ضیا، شیخ الابطح ص ۶۵، اتقان ج ۱ ص ۲۴، اعیان الشیعہ ج ۳ ص ۱۵۰، اسباب النزول ص ۱۳۷ تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۳۹۳، کشاف ج ۲ ص ۲۴۷

بالکل واضح تھی ورنہ آیت کے نازل ہونے سے پہلے جناب امیرؑ اس شخص کو ہرگز نہ ٹوکتے اور اگر ٹوکتے بھی تو اس کا یہ جواب ہرگز نہ ہوتا بلکہ کوئی اور انداز ہوتا یا وہ رسولِ اکرمؐ کے استغفار سے استدلال کرتا نہ کہ حضرت ابراہیمؑ کے استغفار سے جبکہ حضرت ابراہیمؑ کے استغفار کی یہ توجیہ ہوسکتی تھی کہ وہ اس طرح اپنے چچا کو دین سے قریب کرنا چاہتے تھے اور رسول اکرمؐ کے استغفار میں یہ فائدہ بھی متصور نہ تھا!

مؤرخ زینی دحلان اس روایت کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ یہ روایت صحیح ہے اور اس کا شاہد بھی ایک روایت صحیح ہی میں ذکر ہوا ہے۔ اور وہ ابن عباس کا یہ قول ہے کہ لوگ اپنے آباء و اجداد کیلئے استغفار کرتے تھے اسلیے یہ آیت نازل ہوئی۔ جب آیت آگئی تو اب مردوں کو چھوڑ کر زندہ بزرگوں کے لیے استغفار کرنے لگے۔ اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کے استغفار کی علت بیان کر کے اس سے بھی روک دیا۔ اور چونکہ یہ شاہد صحیح ہے لہٰذا اسی پر عمل کرنا چاہیے۔ اور یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ یہ آیت عام لوگوں کے بارے میں ہے نہ کہ حضرت ابوطالب کے بارے میں[1]!

ب : مسلمانوں نے رسولِ اکرمؐ سے عرض کی کیا ہم لوگ اپنی جاہلیت کے بزرگوں کیلئے استغفار نہ کریں۔ آیت نازل ہوئی کہ ہرگز نہیں یہ مومن کا شعار نہیں ہے[2]۔

ج : مومنین کہتے تھے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے استغفار کیا ہے تو ہم بھی استغفار کریں گے۔ آیت نازل ہوئی کہ اُس کی مصلحت اور تھی۔ اب تمھارے لیے حرام ہے[3]!

۱: الغدیر ج ۸ ص۱۲ اسنی المطالب ص۱۸ شیخ الابطح ص۶۷ ۲: اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص۱۵۸، مجمع البیان ج ۱۰ ص۴۱۵ ۳: تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص۳۹۴ ، کشاف ج ۱ ص۵۷

د : رسولِ اکرمؐ غزوۂ تبوک سے پلٹ کر اپنی والدہ کی قبر پہ گئے اور اللہ سے اجازت چاہی کہ وہ استغفار و شفاعت کی اجازت دیدے۔ آیت نازل ہوگئی کہ یہ حق نہیں ہے [۱]

ھ رسولِ اکرمؐ مکہ آئے تو تمازتِ آفتاب میں ماں کی قبر پر کھڑے ہو کر استغفار کی اجازت چاہی اللہ نے اس آیت کے ذریعے منع کر دیا [۲]

و : رسول اکرمؐ اپنی والدہ کی قبر پہ گئے، خود بھی روئے اور ساتھیوں کو بھی رلایا اور فرمایا کہ میں نے استغفار کی اجازت چاہی تھی لیکن یہ آیت آگئی اب صرف زیارت کرنے کی اجازت ہے۔ لہٰذا تم لوگ بھی زیارتِ قبور کر لیا کرو۔ اس لیے کہ اس سے آخرت کی یاد آتی ہے [۴]۔ اتفاق سے یہ روایت بھی حضرت ہریرہ ہی کی ہے اور تعجب خیز بات یہ ہے کہ حضرتؐ نے زیارتِ قبور کی اجازت دیدی ہے اور بعض ابوہریرہ پرست لوگ اسے بھی ناجائز خیال کرتے ہیں۔

ز : سال حدیبیہ میں حضرتؐ اپنی والدہ کی قبر کے پاس سے گزرے، اللہ سے زیارت کی اجازت مانگی، اجازت مل گئی، زیارت کر لی پھر استغفار کی اجازت مانگی اجازت نہ ملی تو روتے ہوئے گھر چلے آئے پھر تمام مسلمانوں کو بھی رلایا [۵]

ح : ابن مسعود کہتے ہیں کہ ایک دن رسول اکرمؐ قبرستان کی طرف تشریف لے گئے اور ایک قبر پر بیٹھ کر خوب روئے اور فرمایا کہ یہ میری والدہ کی قبر ہے لیکن افسوس کہ اللہ نے استغفار کی اجازت نہیں دی اور یہ آیت نازل کر دی ہے [۶]

۱: العذیر ج ۸ ص ۱۳ طبری، حاکم، ابن ابی حاتم، بیہقی، طبرانی، ابن مردویہ [۲] ۲: العذیر ج ۸ ص ۱۳ تفسیر طبری ج ۱ ص ۳۱ ۳: مسلم ج ۳ ص ۶۵ العذیر ج ۸ ص ۱۳۔ تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۳۹۳ السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۱۰۷ [۴] ۵: علی ہامش السیرۃ ج ۱ ص ۱۹۳ [۴] ۶: اسباب النزول ص ۱۲۷ تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۳۹۳ السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۱۰۷ [۴] اتقان ج ۱ ص ۲۴ [۶]

ط : بریدہ کہتے ہیں میں رسول اکرمؐ کے ساتھ تھا، آپ نے اپنی والدہ کی قبر دیکھ کر ذہد کیا، نماز پڑھی اور رو دیے پھر فرمایا کہ میں نے استغفار کی اجازت چاہی تھی لیکن نہ مل سکی بلکہ یہ آیت اتر آئی ہے[1]

ی : زمخشری ابوطالب کے بارے میں آیت کا نزول نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فتح مکہ کے وقت آنحضرتؐ نے سوال کیا کہ میرے والدین میں کون زیادہ قریب العہد ہے، لوگوں نے عرض کیا آپ کی والدہ آمنہ بنت وہب آپ نے مقام ابوا میں ان کی زیارت کی اور پھر قبر سے روتے ہوئے اٹھ کھڑے فرمایا کہ میں نے اپنے پروردگار سے زیارت کی اجازت چاہی تو مل گئی لیکن جب استغفار کی خواہش کی تو روک دیا گیا۔ یہی قول زیادہ صحیح ہے اس لیے کہ ابوطالب کی وفات ہجرت سے قبل واقع ہوئی ہے اور یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی ہے[2]

ک : قسطلانی کہتے ہیں کہ تحقیقی طور پر یہ بات ثابت کہ رسول اکرمؐ اپنی والدہ کی قبر پر آئے اور استغفار کرنا چاہا تو یہ آیت نازل ہو گئی۔ یہی روایت حاکم، ابن ابی حاتم نے ابن مسعود سے اور طبرانی نے ابن عباس سے نقل کی ہے۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت حضرت ابوطالبؑ کے بعد نازل ہوئی ہے اور اصل یہ ہے کہ دو مرتبہ نازل نہیں ہوئی۔

اس مقام پر قسطلانی اور سیوطی کی رائے میں ایک تضاد پایا جاتا ہے سیوطی نے اتقان میں جعلی روایتوں کو ثابت کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ آیت چند مرتبہ نازل

۱: اسباب النزول ص۱۲۷

۲: کشاف ج ۱ ص۵۷ ، بیضاوی ج ۲ ص۲۹

۳: الغدیر ج ۸ ص۱۲ ۔ ارشاد الساری ج ۷ ص۲۷۰ ۔ السیرۃ الحلبیہ ج ۱ صفحہ ۱۲۲ ۔

ہوئی ہے جبکہ قسطلانی کی نظر میں تکرار نزول خلاف قانون ہے۔

ل : اصحاب رسول کی ایک جماعت نے حضرت سے عرض کی کہ ہمارے بزرگ بڑے محسن، خوش اخلاق اور وفادار تھے تو کیا ہم ان کے لیے بھی استغفار نہ کریں۔ حضرت نے فرمایا کہ میں بھی اپنے باپ کے لیے استغفار کروں گا جیسے کہ حضرت ابراہیم نے کیا تھا! لیکن آیت آگئی کہ تمھیں حق نہیں ہے وہ ابراہیم کا معاملہ ایک خاص نوعیت کا تھا[1]

م : رسول اکرمؐ نے چاہا کہ اپنے باپ کے لیے استغفار کریں تو یہ آیت نازل ہوگئی آپؐ نے عرض کی خدایا پھر ابراہیمؑ نے کیوں استغفار کیا تھا۔ جواب ملا کہ وہ خاص معاملہ تھا![2]

ن : فتح مکہ کے موقع پر رسول اکرمؐ مکہ میں داخل ہوئے، ایک مقام پر آپؐ کو ایک قبر نظر آئی۔ آپؐ نے وہاں ٹھہر کر اللہ سے استغفار کرنے کی اجازت مانگی ادھر سے اذن نہیں ملا تو روتے پیٹتے چلے آئے لوگوں نے بھی رونا شروع کر دیا، بلکہ اس دن سے زیادہ گریہ کبھی نہیں ہوا[3]

ڈاکٹر طہٰ حسین نے اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اس قبر کے بارے میں اختلاف ہے بعض کا خیال ہے کہ یہ ماں باپ کی قبر تھی حالانکہ یہ بعید ہے اس لیے کہ ان کی قبر ابواء میں ہے۔ بنابریں ممکن ہے کہ یہ آپ کے جدِ بزرگوار حضرت عبدالمطلب کی قبر رہی ہو[4] ہماری سمجھ میں آتا کہ ایسی عظیم شخصیت کی توہین کیلئے یہ لفظ ممکن و شاید کیونکر کافی ہو گیا۔ کیا تاریخی محاسبات اسی اندازہ سے کیے جاتے ہیں؟ اور کیا شخصیت نوازی کا معیار یہی ہے؟

۱: الغدیر ج ۸ ص ۱۲ تفسیر طبری ج ۱۱ ص ۳۱ تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۳۹۴ ۔ ۲: الغدیر ج ۸ ص ۱۲ درمنثور ج ۳ ص ۲۸۳ ۔ ۳: علی ہامش السیرۃ ج ۱ ص ۱۹۳ تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۳۹۳ ۔ ۴: علی ہامش السیرۃ ج ۱ ص ۱۹۳ ۔

ڈاکٹر طہٰ حسین کے متعلق ہمیں یہ معلوم ہے کہ ان کا موقف بڑا تشکیک آمیز ہوا کرتا ہے وہ چمکتے ہوئے سورج کو یہ کہہ کر پوشیدہ کر دیتے ہیں کہ شاید ابھی طالع نہ ہوا ہو لیکن اس تشکیک پسندی کا تقاضا کسی وقت بھی یہ نہ تھا کہ موصوف ایک محترم شخصیت کی توہین کرتے اور ایک بے عیب ذات کو معیوب بناتے؟ کیا ڈاکٹر صاحب کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ اپنی تشکیک پسندی پر اعتماد کرتے ہوئے یہ کہہ دیتے کہ شاید یہ واقعہ ہی غلط اور خلاف حقیقت ہو مگر افسوس کہ ایسا نہ ہوا بلکہ موصوف ایک قدم اور آگے بڑھے فرمایا کہ رسول اکرمؐ نے اپنے چچا پر اسلام کو انتہائی تاکید و اصرار کے ساتھ پیش کیا اور قریب تھا کہ وہ قبول کر لیتے لیکن جاہلیت کی عزت آڑے آ گئی اور وہ قبول نہ کر سکے مرنے کے بعد آنحضرتؐ نے چاہا کہ استغفار کریں لیکن قرآن کریم نے نازل ہو کر سخت تنبیہہ اور ملامت کر دی![1]

ہماری نظر میں اس بات کی زیادہ اہمیت نہیں ہے کہ طہٰ حسین نے ابوطالبؑ کی مذمت کی ہے جنھیں دوسرے مقام پر اسلام کا حامی اور محافظ تسلیم کر چکے ہیں بلکہ اہمیت اس بات کی ہے کہ موصوف نے رسول اکرمؐ کو سخت ملامت کا محتاج بنا دیا۔ خدا جانے موصوف کا ایمان قرآن کے بارے میں کیا ہے اور وہ رسول کو کیا سمجھتے ہیں؟ ویسے اتنا تو معلوم ہے کہ موصوف نے قرآن کو اس وقت تسلیم کر لیا تھا جب ان کی کتاب الشعر الجاہلی پر ان کی کافی لے دے کی گئی تھی۔

یہ بھی قابل غور بات ہے کہ اگر رسول مقبولؐ نے ابوطالب کے سامنے اسلام کو پیش ہی کر دیا تو انہیں اتنی سخت ملامت و تنبیہہ کی کونسی بات تھی؟ کیا رسولؐ کا فریضہ یہ نہیں تھا کہ وہ اسلام کو تمام نوع بشر کے سامنے پیش کرتے بالخصوص اپنے قرابتداروں کے سامنے جسکا امر پہلے ہی روز آ چکا تھا۔ کیا اوامر کی اطاعت بھی باعث ملامت بن

۱: حاشیہ السیرۃ ج ۱ ص ۱۹۳۔ ۲: الفتنۃ الکبریٰ عثمان ص ۱۵۱۔

جاتی ہے کیا قرآن کو بھی بتی کی حیثیت سمجھنے میں اسی طرح دھوکا ہو گیا جس طرح طٰہٰ حسین کو قبر کی صحیح نوعیت معلوم کرتے میں ہو گیا تھا۔

افسوس کہ مصیبت اسی حد پر تمام نہیں ہوتی اور جسارت کے بھی حدود متعین نہیں ہوتے بلکہ موصوف رسول اکرمؐ کو ان مسلمانوں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیتے ہیں جن پر آیت کریمہ نے اس وقت عتاب کیا تھا جب یہ لوگ اپنے مُردوں کے لیے استغفار کر رہے تھے چنانچہ فرماتے ہیں کہ قرآن کا یہ واضح انصاف اور بیباک لہجہ ہے کہ اس نے نہایت ہی واضح طور پر بلا کسی رو رعایت کے رسولؐ اور مسلمانوں کو استغفار کرنے پر ٹوک دیا[1]

معلوم ہوتا ہے کہ طٰہٰ حسین بھی دیگر مورخین کی طرح شک و وہم کی بھول بھلیاں میں چکر کاٹ رہے ہیں ان کا خیال ہے کہ وہ اپنی تحقیقات سے علم و یقین کی دنیا میں سرگرم سفر ہیں۔ حالانکہ واقعاً ان کا عالمِ پرواز شک در شک اور وہم در وہم ہے ورنہ شاید و باید سے تحقیقات نہیں ہوا کرتی۔

ہماری نظر میں طٰہٰ حسین کے ان بیانات اور بے بنیاد دعووں کی اہمیت اس لیے بھی نہیں ہے کہ ہم نے یہ کتاب بھی اسی لیے لکھی ہے کہ اس قسم کے بے بنیاد اور واہیات دعووں کی تردید کر کے یہ ثابت کریں کہ ابوتراب کے باپ کی مخالفت کے لیے یہ باتیں کی دیواریں کارآمد نہیں ہو سکتیں۔

س: طبری وغیرہ کا خیال ہے کہ اس آیت میں استغفار سے مراد نماز ہے جیسا کہ عطاء بن ابی رباح سے منقول ہے کہ ہم لوگ ہر مسلمان کی میت پر نماز ادا کیا کرتے تھے حتیٰ کہ وہ زن حبشہ جو زنا سے حاملہ ہو گئی ہو اس لیے کہ آیت شریفہ نے فقط مشرکین کی نماز میت سے ممانعت کی ہے[2]

---

[1]: علیٰ ہامش السیرۃ ج ۱ ص ۱۹۲

[2]: الغدیر ج ۸ ص ۱۰-۱۵ ، تفسیر طبری ج ۱۱ ص ۳۳

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت میں استغفار سے مراد نماز میت ہے اور ظاہر ہے کہ حضرت ابوطالبؑ اور خدیجہ کا انتقال نماز میت کا حکم وضع ہونے سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ لہٰذا ان سے اس آیت کا تعلق ہو ہی نہیں سکتا علاوہ اس کے کہ نماز میت مرنے پر پڑھی جاتی ہے نہ کہ چند سال کے بعد تو پھر حضرت ابوطالبؑ کے بارے میں آیت اترنے کا کیا مطلب ہے؟

ع: حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ جب آپ نے رسول اکرمؐ کو ابوطالبؑ کے انتقال کی خبر دی تو آپ نے فرمایا کہ جاؤ غسل و کفن دیکر دفن کرو۔ خدا ان پر رحمت نازل کرے اور بخش دے۔ اس کے بعد چند دنوں تک برابر استغفار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ آیت نے نازل ہو کر مشرکین کیلئے استغفار کرنے سے روک دیا[1]

اس سیاست آمیز اور حیرت انگیز روایت سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت حضرت ابوطالبؑ کے انتقال کے سال ہی نازل ہوئی ہے بلکہ اسی ہفتہ یا مہینہ میں، اس لیے کہ انہیں چند دن تک استغفار کرنیکا ذکر ہے حالانکہ یہ آیت آخری سورہ کی آیت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابوطالبؑ کے انتقال کے کم از کم دس سال بعد نازل ہوئی ہے۔ ببیں تفاوت رہ۔۔۔!

ف: جس وقت ابوطالبؑ کا انتقال ہوا تو رسول اکرمؐ نے کہا جس طرح ابراہیمؑ نے اپنے مشرک چچا کے لیے استغفار کیا ہے اسی طرح میں بھی اپنے چچا کیلئے استغفار کروں گا جس پر آیت نازل ہو گئی کہ نبی کو یہ اختیار نہیں ہے۔ حضرت کو یہ حکم بڑا شاق گزرا تو آیت نے حضرت ابراہیمؑ کے استغفار کی وجہ بیان کر دی اور اس طرح رسول کو تسکین ہو گئی[2]

۱: الغدیر ج ۸ صہ ۵ طبقات ابن سعد ج ۱ صہ ۱۰۵ در منثور ج ۳ صہ ۲۸۲ ۲: الغدیر ج ۸ صہ ۱۱ در منثور ج ۳ صہ ۲۲۳

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت حضرت ابوطالبؑ کے انتقال کے موقع پر نازل ہوئی ہے۔

ص : جس وقت ابوطالبؑ کا انتقال ہوا رسول اکرمؐ نے کہا " اللہ آپ پر رحمت نازل کرے اور آپ کو بخش دے۔ میں تو اس وقت تک استغفار کروں گا جب تک قرآن منع نہ کر دے، یہ دیکھ کر تمام مسلمانوں نے جاہلیت زدہ مُردوں کیلئے استغفار شروع کر دیا اور اللہ نے فوراً آیت نازل کر دی، خبردار استغفار نہ کرنا![1]

یہ اٹھارہ علاوہ نزول آیت کی داستانیں ہیں جن کو احادیث و روایات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ہمیں نہ ان پر تنقید و تبصرہ کرنا ہے اور نہ ان کے متعلق کوئی فیصلہ دینا ہے۔ یہ بات ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ہماری نظر یہ سب ہی بے ربط و بے بنیاد ہیں۔ ہمارا مقصد تو صرف یہ واضح کر دینا ہے کہ آیت کے نزول کے بارے میں کتنا شدید اختلاف اور کتنا عظیم تعارض ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ آیت کو اس مرکز سے ہٹانے کیلئے کتنے خواہشات کس کس طرح بروئے کار لائے گئے۔ اور قرآن کو کس کس انداز سے برباد کیا گیا!

لطف کی بات یہ ہے کہ ان غرض کے بندوں نے حضرت علیؑ اور عباس ہی کی طرف دو متضاد اقوال کی نسبت دیدی ہے، اب سمجھ میں نہیں آتا کہ کس قول کو اختیار کریں اور کسے ترک کر دیں، ایک ہی آیت ہے کبھی رسول اکرمؐ کے جد امجد کی شان میں اتاری جا رہی ہے کبھی مادر گرامی کی شان میں اور کبھی عم محترم کی شان میں!

حقیقت یہ ہے کہ حضرت عبد المطلب اور حضرت آمنہ پر یہ مصیبت صرف

۱: الغدیر ج ۸ ص ۱۵ ،

ابوطالب کی وجہ سے نازل ہوئی ہے۔ ورنہ اگر آیت کو ابوطالبؑ کی شان میں نازل کرنیکی فکر نہ کی جاتی تو کسی اور کا تذکرہ بھی نہ ہوتا۔

بہرحال ان تمام روایات سے اتنی بات تو واضح ہو ہی جاتی ہے کہ رسولِ اکرمؐ ان تمام احکام اور نواہی کے باوجود مشرکین کیلئے استغفار کیا کرتے تھے۔ نہ محبت سے ممانعت کی آیتیں انھیں سمجھا سکیں اور نہ ترکِ موالات کے اوامر۔ نہ پہلے سورے سے بات سمجھ میں آسکی نہ قبلِ برائت کے سورے سے!

ان حضرات کا مقصد صرف یہ ہے کہ آنحضرتؐ کی ہر ممکن توہین کی جائے۔ ان کو اذیت پہنچائی جائے، چاہے اس کا تعلق براہ راست انہی کی اہانت سے ہو۔ یا ماں، چچا اور دادا کی توہین سے۔ ظاہر ہے کہ یہ وہ خبیث مقصد اور ناپاک ارادہ ہے جو اسلامی تقاضوں سے بالکل متضاد ہے۔ اسی لیے تو حلبی اس مقام پر آکر متحیر ہو گئے۔ ان کا مقصد تھا کہ ان روایات کی تصحیح کریں لیکن ادھر یہ روایت بھی سامنے آگئی کہ ایک شخص نے آنحضرتؐ سے سوال کر لیا کہ آپ کے باپ کہاں ہیں تو آپ نے فرمایا کہ میرے اور تیرے دونوں کے باپ جہنم میں ہیں [1]

یہاں پہنچ کر حلبی کے حواس بالکل مختل ہو گئے اور چند بیجا اور مہمل قسم کے بیانات دیتے ہوئے یہ فرما گئے کہ اس حدیث میں باپ سے مراد ابوطالبؑ ہیں [2]

یہ ہے حلبی کا اندازِ فکر! گویا کہ جہنم انہی کے قبضے میں ہے جسے چاہیں نکال لیں اور جسے چاہیں جھونک دیں۔

بہرحال ان روایات کے بارے میں اتنا تو ضرور ہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب کے سب آپس میں متعارض ہیں لہٰذا قانونی اعتبار سے درجۂ اعتبار سے ساقط ہیں بلکہ مزید لطیفہ یہ ہے کہ ایک ہی شخص کے بارے میں جتنی روایتیں ہیں انہیں باہمی تعارض پایا۔

۱: السیرۃ الحلبیہ ج ۱ ص ۱۰۶، مسلم ج ۱ ص ۱۳۲ ۔ ۲: السیرۃ الحلبیہ ج ۱ ص ۱۰۶

جاملہ ہے جیسا کہ ایک دقیق مطالعے سے واضح ہو سکتا ہے۔

حضرت ابوطالبؑ کی شان کی یہ تمام روایتیں علاوہ اپنے تعارض کے ایسے ایسے نامور راویوں سے نقل ہوئی ہیں جن کی حیثیت سابق میں واضح کی جا چکی ہے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ یہ حدیثیں یا یہ افسانے قرآنِ کریم کی ان آیتوں سے بھی متعارض ہیں جنمیں آباد اجداد رسولؐ و آئمہ اطہارؑ کی طہارت کا اعلان کیا گیا ہے بھلا اس سے بڑی گندگی اور کیا ہوگی کہ انسان کی زندگی کے لمحات رجس ونجاست اور کفر وشرک میں گزر جائیں!

یہ بھی قابلِ لحاظ بات ہے کہ ان روایات میں رسول اکرمؐ کی احکام الٰہیہ اور تعلیماتِ قرآنیہ کی مخالفت کا بھی ذکر ہے جیسا کہ مفصل طور پر بیان ہو چکا ہے۔

(۴)

وہ آیۂ مبارکہ جس کی تاویل یا تحریف میں اب تک بحث ہو رہی تھی۔ اگر اس کے الفاظ پر ایک غائر نظر ڈالی جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ آیت میں کسی مقام پر بھی استغفار سے ممانعت نہیں کی گئی ہے، بلکہ اس کا انداز بیان یہ ہے کہ نبی اور اس کا اتباع کرنے والے مومنین کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ مشرکین کے لیے استغفار کریں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ نبی سے اس قسم کا استغفار صادر ہو ہی نہیں سکتا۔ نہ یہ کہ نبی اس قسم کا استغفار کرتا ہے اور پھر قرآن کو ممانعت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

اب جب آیت کا مطلب یہ ہے تو اس کا کھلا ہوا نتیجہ یہ ہوگا کہ جسکے لیے نبی کا استغفار ثابت ہو جائے اس کیلئے اس گفتگو کی گنجائش ہی نہ رہ جائیگی کہ کس مذہب و ملت کا آدمی تھا، بلکہ خود حضرت کا استغفار کر دینا اس کے ایمان و اسلام کی سند بن جائیگا۔

۱۔ وتقلبک فی الساجدین . . . آیت شریفہ طہارت و اسلام آباء نبیؐ پر دلالت کرتی ہے۔

چونکہ آیت میں مبالغت کا کوئی پہلو نہیں ہے اس لیے یہ آیت کو ایسے مہمل افسانوں پر محمول کرنا حضرت رسول اکرمؐ کی توہین اور ان کی احکام الٰہیہ سے سرتابی کا اثبات کرنا ہے اور اس امر کا ارتکاب کسی مسلمان کیلئے جائز نہیں ہے۔

ان تمام روایات کو دیکھتے ہوئے آیت کا مطلب یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے حضرت ابوطالبؑ کے ایمان کامل اور عقیدہ راسخہ کی بنا پر ان کیلئے استغفار شروع کیا اور چونکہ حضرت کا ایمان پوشیدہ تھا اس لیے مسلمانوں نے یہ خیال کیا کہ مشرکین کیلئے استغفار جائز ہے اور انھوں نے بھی اس کا ارادہ کر لیا آیت نے اتر کر صحیح حیثیت واضح کر دی کہ نبی غیر مسلم کے لیے استغفار نہیں کرتا۔ تمہارا یہ توہم غلط ہے۔ ابوطالب مسلمان تھے لہٰذا تمھارے لیے یہ استغفار شایانِ شان نہیں ہے۔ رہ گیا حضرت ابراہیم کا معاملہ تو اس کی علت آیت میں صراحتہً ذکر ہو گئی ہے

علاوہ اس کے کہ زندہ اور مُردہ کے استغفار میں ایک فرق بھی ہے اور وہ یہ کہ زندہ کیلئے استغفار کو تالیفِ قلب پر محمول کر سکتے ہیں لیکن مُردہ کیلئے یہ بات بالکل غیر ممکن ہے معلوم ہوا کہ آیت کریمہ نے نازل ہو کر دو اہم باتوں کا فیصلہ کر دیا ہے ایک یہ کہ رسول قرآنی احکام اور تعلیمات الٰہیہ کی مخالفت کر کے مشرکین کے لیے ہرگز استغفار نہیں کر سکتا۔ وہ معصوم، مقدس اور تمام عیوب سے پاکیزہ ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ وہ جس کے لیے بھی استغفار کر دیتا ہے اسکے ایمان سے زیادہ کسی کا ایمان مستند و مستحکم نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ وہ غیر مسلم کیلئے استغفار کر ہی نہیں سکتا۔ یہی وہ نکتہ تھا جو اکثر مسلمانوں کے ذہن میں راسخ ہو چکا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ جب حضرت امیرؑ نے ایک شخص کو مشرکین کیلئے استغفار کرنے سے منع کیا تو اس نے رسول اکرمؐ کی سیرت کے بجائے حضرت ابراہیم کی سیرت پیش کی۔

---

(۵)

یہی بخاری و مسلم کی روایت جس کے بارے میں ہم اب تک بحث کر رہے تھے، بعض روایات کی بنا پر ایک ضمیمہ بھی رکھتی ہے اور وہ یہ کہ جب ابوطالبؑ کا وقتِ آخر آیا تو عباس نے دیکھا کہ ان کے لبوں کو جنبش ہو رہی ہے، کان لگا کر سنا تو کلمہ پڑھ رہے ہیں۔ عرض کی یا رسول اللہ خدا شاہد ہے جس کلمہ کیلئے آپ نے حکم دیا تھا ابوطالبؑ نے اسے پڑھ لیا ہے۔

اگر ہم سابق کی تمام باتوں کو تسلیم بھی کر لیں تب بھی اتنا کہیں گے کہ حضرت عباس کی شہادت کی بنا پر حضرت ابوطالبؑ کے آخری کلمات وہی تھے جن کی رسول اکرمؐ نے خواہش کی تھی۔ اب جو شخص ان احادیث کی صحت کا قائل ہے اس کا اخلاقی اور انسانی فریضہ ہے کہ پوری حدیث کو قبول کرے ورنہ پھر سرے سے ترک کر دے یہ کوئی انسانیت نہیں ہے کہ اپنے مطلب کے حصے کو الگ کر لیا جائے اور باقی کو بیکار قرار دیدیا جائے۔

(۶)

اگر ہم حضرت ابوطالبؑ کے اعتراف و اقرار، آپ کے اعمال و اقوال، ان کی وصیتیں اور نصیحتیں، ان سے رسول اکرمؐ کی محبت و مودت، ان کا اخلاص و التفات ان کا استغفار و طلبِ رحمت کرنا، آئمہ اطہار کی شہادت، صحابہ کرام ابوذرؓ و ابن عباسؓ و ابوبکر کی گواہیاں ان سب کو ترک کر دیں اور صرف اسی حدیث پر ایمان لے آئیں جس سے بحث کی جا رہی ہے تب بھی ابوطالبؑ کا یہ قول کہ "میں دینِ عبدالمطلب پر ہوں" آپ کے ایمان کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔

کیا عبدالمطلب کا دین ملتِ ابراہیمی نہیں ہے؟ کیا عبدالمطلب دینِ حنفا پر نہ تھے۔ کیا انھوں نے رسول اکرمؐ کی بعثت کا اقرار نہ کیا تھا، کیا انھوں نے وقتِ بعثت تک

زندگی کی تمنا نہ کی تھی۔ کیا مشاہدۂ جلوۂ نبوت اور مطالعہ نور حق کے جذبات ان کے سینے میں کروٹیں نہ لیتے تھے۔ یقیناً یہ سب کچھ تھا لیکن حضرت ابوطالب کی ابجرت نے آپ کو بھی محفوظ نہ رہنے دیا۔ اور آخر آپ کے دعوے اسلام کو بھی ملوث کرنے کی کوشش کی گئی۔

ہمارا موضوع حضرت عبدالمطلب کے ایمان کا ثابت کرنا نہیں ہے۔ اگر آپ کا ایمان بھی محتاج ثبوت ہو۔ اس لیے ہم اس موضوع کو ترک کرتے ہیں اس پر دوسرے حضرات نے مفصل بحثیں کی ہیں۔ یہاں تک کہ سیوطی نے آبا و اجداد رسول کریمؐ کی پاکیزگی کے بارے میں چھ کتابیں تالیف کی ہیں۔[1]

دوسری بات یہ ہے کہ اگر حضرت ابوطالب کا یہ جواب تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی آپ کا مقصد صرف یہ تھا کہ آپ کے موقف کو مشرکین پر ظاہر نہ ہونے دیں جیسا کہ آپ کی عالمانہ سیاست سے ثابت کیا جا چکا ہے کہ آپ ایک خاص طرز فکر کے بانی تھے۔ کہ اگر آپ کا انداز نظر ابتدائے امر سے ایسا نہ ہوتا تو آج اسلام ڈھونڈے سے بھی نہ مل سکتا۔

آیت انک لا تہدی پر ایک نظر

(۱)

بعض لوگوں نے گزشتہ آیت کے سلسلے کی حدیثوں کے علاوہ اس آیت شریفہ کے ذیل میں بھی کچھ حدیثیں تیار کی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ایک عبوری نظر اس کے اسناد پر بھی ڈال لیں۔ اس مقام پر صرف دو حدیثیں ہیں:

۱: الغدیر ج ۸ ص ۱، السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۔۔

۱ : ابوسہل سری بن ابی سہل، عبدالقدوس دمشقی ابوصالح کے واسطے سے ابن عباس سے نقل کیا گیا ہے کہ یہ آیت حضرت ابوطالب کی شان میں نازل ہوئی ہے رسول اکرمؐ نے بجید اصرار کیا کہ مسلمان ہو جائیں لیکن نہ ہوئے۔ آیت نے صاف کہہ دیا کہ اے رسول یہ تمھارے بس کی بات نہیں ہے۔

مواخذات و ملاحظات

الف : سری ذہبی کے قول کے مطابق ابن عدی کی نظر میں مہمل، حدیثوں کا چور اور ابن خراش کی نظر میں جھوٹا ہے۔ اسکی حدیثوں کو بلا اور مصیبت سے تعبیر کیا گیا ہے[۱] علامہ اکبر امینی دام ظلہ نے اسے سلسلہ کذابین میں شمار کیا ہے[۲]

ب : عبدالقدوس دمشقی۔ عبدالرزاق کا قول ہے کہ ابن مبارک نے صریحی طور پر جھوٹا صرف اسی کو کہا ہے۔ فلاس کا کہنا ہے کہ اس کے احادیث کو ترک کرنے پر اجماع قائم ہے۔ یہ نسائی کی نظر میں غیر معتبر اور ابن عدی کی نظر میں عجیب و غریب روایات کا راوی ہے[۳] اسماعیل بن عیاش کا مقولہ ہے کہ میں صرف عبدالقدوس کی کذب کی شہادت دے سکتا ہوں[۴] عبداللہ بن مبارک کا قول ہے کہ رہزنی عبدالقدوس سے روایت کرنے سے زیادہ اچھا کام ہے[۵]

ج : ابوصالح کا حال معلوم نہیں ہے البتہ خیال یہ ہوتا ہے یہ صالح نہیں بلکہ طالح[۶] تھا۔

د : ابن عباس کی روایت کی نسبت اس سازش کو صاف کر دیتی ہے جس کے تحت یہ ساری حدیثیں وضع ہوئی ہیں۔ ابن عباس شعب ابوطالب میں ہجرت کے تین سال پہلے

---

۱ : المیزان ج ۱ ص ۲ ۲ : الغدیر ج ۱ ص ۵-۲-۳-۱۴۳ ۳ : المیزان ج ۲ ص ۱۴۳

۴ : الغدیر ج ۵ ص ۲۳۳، ج ۸ ص ۲۱، الغدیر ج ۱ ص ۹۰

۶ : بدکردار

پیدا ہوئے ہیں اور اسی سال حضرت ابوطالب کی وفات واقع ہوئی ہے ابن عباس کو ان کی وفات کی کیا خبر کہ روایت کرنے بیٹھ گئے۔ ابن عباس کی شان ان افترا پردازیوں سے اجل وارفع ہے۔ ان کا مسلک و مشرب وہی ہے جو مقدمہ کتاب میں نقل کیا گیا ہے۔

دوسرے انداز سے یہی روایت سری اور عبدالقدوس جیسے جھوٹے لوگوں نے ابن عمر کی طرف منسوب کی ہے۔ حالانکہ ابن عمر بعثت کے تیسرے سال پیدا ہوئے ہیں وہ حضرت ابوطالبؑ کے انتقال کے وقت سات برس کے لگ بھگ رہے ہوں گے۔ اس سن کا بچہ وقتِ احتضار کی روایت نہیں بیان کر سکتا اور بحمداللہ ان دونوں کذابین کے علاوہ کوئی تیسرا ان خرافات و مہملات کا راوی بھی نہیں ہے۔

(۲)

آیت مذکورہ دو آیتوں کے درمیان واقع ہوئی ہے :

واذا سمعوا اللغو اعرضوا عنہ وقالوا لنا اعمالنا ولکم اعمالکم سلام علیکم لانبتغی الجاھلین انک لا تھدی من احببت ولکن اللہ یھدی من یشآء وھو اعلم بالمھتدین وقالوا ان نتبع الھدی معک نتخطف من ارضنا اولم نمکن لھم حرما اٰمنا یجبی الیہ ثمرات کل شیء رزقا من لدنا ولکن اکثرھم لایعلمون (القصص پ۲۰)

پہلی آیت میں مومنین کے اعمالِ خیر کا تذکرہ ہے اور آخری آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو صرف اس وجہ سے ایمان نہیں لائے کہ ان کی زمینیں چھن جائیں گی اور انھیں نکال دیا جائیگا۔ لہٰذا درمیانی آیت کا صاف صاف مطلب یہ ہوگا کہ اے رسولؐ یہ لوگ جو ایمان لائے ہیں یہ تمھاری خواہش اور تمھاری دعوت پر نہیں بلکہ حقیقتاً یہ ہماری توفیق

۱: اصابہ ج ۲ ص ۳۲۲ ۲: الغدیر ج ۸ ص ۲۱ ، درمنثور ج ۵ ص ۱۳۲ ۳: اصابہ ج ۲ ص ۳۴۳

امداد سے ہے۔ لہٰذا اگر دوسری جماعت ایمان بھی نہ لائے تو متقین کبیدہ خاطر ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

یہی وہ بات ہے جو قرآن کریم کی متعدد آیات میں بیان کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو:

ا : لیس لک ھداھم ولکن اللہ یھدی من یشاء (البقرہ پ۲)

ب : ان تحرص علی ھداھم فان اللہ لا یھدی من یضل (النحل پ۱۴)

ج : اتریدون ان تھدوا من اضل اللہ ۔ (النساء پ۴)

د : أفأنت تھدی العمی ولو کانوا لا یبصرون (یونس پ۱۱)

ھ : فیضل اللہ من یشاء ویھدی من یشاء (ابراہیم پ۱۳)

و : ومن یھدی اللہ فھو المھتدی ومن یضلل فلن تجد لھم ولیاً مرشداً ٥

ظاہر ہے کہ ہم ان تمام آیتوں کو بیان نہیں کرسکتے جو اسی ایک مطلب کی شرح کررہی ہیں کہ دنیا کا ایمان اللہ کی امداد و توفیق سے ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ توفیق اور یہ امداد جبر و اکراہ کا باعث نہیں بنتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ دیگر مقامات پر ہدایت و ضلالت دونوں کی نسبت خود انسان کی طرف دی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے فمن اھتدی فانما یھتدی لنفسہ ومن ضل فانما یضل علیھا۔ (الاسراء پ۱۵)

(۳)

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض ان اسباب و علل کا بھی تذکرہ کردیا جائے جن کی بنا پر آیت مذکورہ کا نزول بیان کیا گیا ہے:

ا : جب رسول اکرمؐ جنگ احد میں زخمی ہوکر زمین پر گرے تو آپ کے دندان مبارک

شکستہ ہوگئے خون چہرہ سے جاری ہوگیا۔ آپ نے دعا کیلئے ہاتھ اٹھا دیے خدایا! میری قوم جاہل ہے اسے ہدایت کر۔ اس وقت ایک آیت نازل ہوئی: "اے رسولؐ ہدایت تمھارے بس کا کام نہیں ہے"[1]

ب: مکہ میں ایک ایسی جماعت بھی تھی جو بظاہر مسلمان تھی۔ لیکن جب رسول اکرمؐ ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے تو اس نے اپنے نفاق کو ظاہر کر دیا اور اسلام کی مخالفت شروع کر دی۔ رسولِ اکرمؐ اور مومنینِ مدینہ کو یہ خبر ملی تو ان میں آپس میں بحث شروع ہوگئی کہ آیا یہ لوگ مومن بھی ہیں یا نہیں بعض نے کہا کہ یہ مخالفت صرف تقیہ کی بنا پر ہے۔ بعض نے کہا کہ یہ لوگ واقعاً کافر ہیں ورنہ ہجرت کر کے مدینہ چلے آتے۔ آخرکار سب جمع ہوکر آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور چاہا کہ ان لوگوں کے بارے میں کوئی فیصلہ کریں۔ حضرت فیصلے کو ٹالے رکھا، یہاں تک کہ ملک نے آکر یہ آیت سنائی جس کا مطلب یہ ہے کہ تم کسی کے ایمان و ہدایت یافتہ ہونے کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ یہ صرف اللہ کا کام ہے![2]

ج یہ آیہ مبارکہ حارث بن نعمان بن نوفل بن عبد مناف کیلئے نازل ہوئی ہے۔ آنحضرتؐ کی خواہش تھی کہ یہ مسلمان ہو جائے لیکن نہیں ہوسکا[3]۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس کے بعد والی آیت حارث ہی کے بارے میں نقل کی گئی ہے[4] بلکہ بعض لوگوں نے تو اس پر اجماع تک کا دعویٰ کیا ہے[5]

۱: اعیان الشیعہ ج ۳ ص ۱۵۹، الحجۃ ص ۲۹ (الحجۃ نے غلطی سے روز حنین لکھ دیا ہے صحیح روز احد ہے)

۲: الحجۃ ص ۱۰ - الاعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۲۵۹ ۳: شیخ الابطح ص ۶۹

۴: کشاف ج ۲ ص ۱۶۷ اسباب النزول ص ۱۲۹، مجمع البیان ج ۲۰ ص ۲۰۹، تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۳۹۴ تفسیر مصباح ج ۲ ص ۹، ۵: شیخ الابطح ص ۶۹

د : ملک قیصر کا ایک قاصد خط لیکر آنحضرتؐ کی خدمت میں آیا حضرتؐ نے خط لیکر پوچھا کہ اس کا تعلق کس قوم سے ہے۔ لوگوں نے فرمایا کہ تنوخ سے۔ فرمایا اے شخص کیا دینِ ابراہیمی کو قبول کرنا چاہتا ہے۔ اس نے کہا کہ میں ایک بادشاہ کا نمائندہ ہوں جب تک واپس نہ چلا جاؤں اس وقت تک دین کے تبدیل کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا حضرتؐ نے اصحاب کو دیکھا اور ایک تبسم آمیز لہجے میں فرمایا۔ انک لا تھدی [1]۔

یہ چار اقوال ہیں جو آیت کے نزول کے بارے میں عرض کیے گئے ہیں اور اصل قانون کی بنا پر آیت کے نزول میں تکرار نہیں ہو سکتی۔ اس لیے سوال یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ حضرت ابوطالب کا ذکرِ خیر کہاں سے آ گیا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بھی کاذبین اور آخرت فراموش افراد کی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہو۔۔۔!

(۴)

اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ یہ آیت مبارکہ حضرت ابوطالب ہی کی شان میں نازل ہوئی ہے تو یہ بھی ان کے اسلام کا اعتراف کرنے والوں کے ہاتھ میں ایک مضبوط حربہ ہوگا۔ جس کی تردید و تشکیک غیر ممکن ہوگی۔ جس کی توضیح یہ ہے :

ا : حضرت ابوطالب سے آیت کے متعلق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ رسولِ اکرمؐ انھیں دوست رکھتے تھے۔ جبھی تو آیت نے کہا کہ تم جس کو دوست رکھتے ہو اسے ہدایت نہیں کر سکتے۔ اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ رسولِ اکرمؐ کا محبوب بن جانا ایمان کی واضح ترین دلیل ہے وہ کسی غیر مومن سے محبت نہیں کر سکتے

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۳۹۵

ب : اس آیت کا مطلب یہ بھی ہوگا کہ حضرت ابوطالبؑ کا ایمان صرف رسولؐ کی دعوت کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اس میں خدا کی مشیت بھی شامل ہے اور کیا کہنا اس بندۂ پروردگار کا جس کے اسلام کی فکر خود حضرت پروردگار کو ہو اور جس کے اسلام کیلئے حضرت رسولؐ کی دعوت کو ناکافی خیال کیا گیا ہو۔

(۵)

کیا ان تمام بیانات کے بعد یہ دریدہ دہنی اور نافہمی نہ ہوگی کہ فاضل زجاج نہایت آسانی کے ساتھ یہ اعلان کردے کہ یہ آیت باجماع مسلمین ابوطالبؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے[۱] سوال یہ ہے کہ عالم وہم وخیال کے علاوہ یہ اجماع کہاں ہوا ہے؟ اس اجماع کی دلیل اور اس کا ثبوت کیا ہے۔ زجاج کو اس جرأت جسارت کے انجام کا تصور کیوں پیدا نہیں ہوا؟

آخر اس شخص نے آئمہ اطہار، صحابۂ کبار اور اعلام اخیار کے تمام اقوال کو نظر انداز کرکے انھیں دائرۂ اسلام سے کیونکر خارج کر دیا۔ کیا ابوطالبؑ کے اسلام کا اعتراف کرکے اسلام کی یہ تمام ہستیاں اس کے دائرہ سے خارج ہوگئیں۔ یا ان کی جدائی کے باوجود اجماع قائم ہوگیا؟

عجیب وغریب بات یہ ہے کہ زجاج نے اپنے اجماع کی سند میں صرف ایک حدیث پیش کی ہے اور اس کے اسناد بھی حذف کر دیے ہیں۔ شاید اسے اس امر کا خیال رہا ہو کہ اگر رواۃ کا اظہار ہوگیا تو روایت کی صحیح حدیث طشت از بام ہوجائے گی اور اجماع کا بھرم کھل جائیگا۔ لیکن ہمارا خیال ہے اس حدیث کا ماخذ بھی سابق ہی کی حدیثیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ اس میں زجاج کی بلند پروازی بھی شامل ہوگئی ہو۔

۱: کشاف ج ۳ ص ۲۲۲ ۔

حدیث یہ ہے کہ حضرت ابوطالبؑ نے رسول اکرمؐ سے کہا: بھتیجے میں جانتا ہوں کہ تم سچے ہو۔ لیکن یہ بُرا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ یہ کہیں کہ موت کے خوف سے جو اس بچانہ تھے بہرحال میں اپنے بزرگ عبدالمطلب، ہاشم اور عبدمناف کے دین پر مروں گا۔[1]

ہمیں اس مقام پر صرف یہ عرض کرنا ہے کہ زجاج کے بعد قرطبی نے بھی جب یہ دیکھا کہ اجماع مسلمین کا دعویٰ ضرورت سے زیادہ بڑا ہوگیا ہے تو خود اس کی اصلاح کی اور فرمادیا کہ اکثر مفسرین کا اجماع ہے کہ آیت ابوطالبؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے[2]۔ حالانکہ یہ دعویٰ بھی زجاج کے کلام کی طرح بے دلیل اور بے مغز ہے

اس سے عجیب یہ ہے کہ ابن کثیر نے بھی آیت کے ذیل میں یہ ارشاد کیا ہے کہ بخاری و مسلم سے ثابت ہوچکا ہے کہ یہ آیت عم رسول ابوطالب کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ وہ رسول کریمؐ کی حفاظت و رعایت اور حمایت و نصرت کرتے تھے۔ ان سے بعید محبت کرتے تھے لیکن طبعی محبت نہ کہ دینی محبت[3]۔ اس کے بعد سابقہ روایت سے استدلال بھی کیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس عبارت اور دریدہ دہنی کا مدرک و ماخذ کیا ہے؟ کیا اس قسم کے اہم فیصلے بھی بخاری حدیثوں کے بل بوتے پر کیے جاسکتے ہیں؟

اس سے زیادہ لطف کی بات یہ ہے کہ ترمذی نے اس سلسلے کی ایک حدیث کے بارے میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ حدیث تو حسن ہے لیکن غریب ہے۔ اسے صرف یزید بن کیسان نے نقل کیا ہے[4]۔

ہم اس سلسلے کی تمام روایتوں کے شیرازے بکھیر چکے ہیں اور حقیقت بے نقاب

۱: کشاف ج ۳ ص ۳۲۲ ۲: الغدیر ج ۸ ص ۲۲ تفسیر قرطبی ج ۱۳ ص ۲۹۹ ۲: تفسیر کثیر ج ۳ ص ۲۹۹

۳: تفسیر کثیر ج ص ۲۹۴ ۴: ایضاً

ہو چکی ہے۔ لیکن ہمیں اس کلمہ سے لطف آتا ہے کہ روایت غریب ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے۔ ابن کیسان تنہا اس کا راوی ہے لیکن پھر بھی حسن اور قابل قبول ہے۔

ہمارا مقصد ابن کثیر سے محاسبہ کرنا نہیں ہے ورنہ ہم ان سے پوچھتے کہ آخر ابوطالب کی اس بے پناہ محبت کو غیر دینی محبت پر محمول کرنے کا منشا کیا تھا۔ آخر یہ محبت دینی کیوں نہیں تھی؟ جب کہ بیشمار ادلہ و براہین سے روز روشن کی طرح واضح ہو چکا ہے کہ ابوطالب کی محبت محمد رسول اللہ سے تھی نہ کہ محمد بن عبداللہ سے۔

اس قسم کے خرافات میں سے جن کو کبھی تاریخ اور کبھی حدیث سے تعبیر کیا جاتا ہے ایک یہ مقولہ بھی ہے کہ ابوسعید بن رافع نے ابن عمر سے آیت انک لا تہتدی کے بارے میں سوال کیا کہ کیا یہ ابوجہل و ابوطالبؑ کے بارے میں ہے؟ تو انھوں نے فرمایا ہاں۔[2]

ہمیں اس روایت کی سند نہیں مل سکی ہے لیکن اس کے باوجود ہماری نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے اس لیے کہ یہ ابن عمر کی ذاتی رائے ہے۔ اسے حدیث سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ کونسی عقل ہے جو ابوجہل اور ابوطالبؑ کو ایک درجہ میں رکھنا چاہتی ہے۔ اور دونوں پر ایک ہی قسم کا اطلاق پسند کرتی ہے؟!

ابوطالبؑ وہ جس کی زندگی حمایت و رعایت اور کفالت و حفاظت رسول میں گزر گئی اور ابوجہل وہ جس کو ان باتوں سے کوئی ربط ہی نہیں اس کے بعد بھی دونوں کا درجہ ایک؟ اگر یہ ممکن ہے تو ابوجہل کا ولی ہونا بھی ممکن ہے، اس لیے اس قسم

۱: تفسیر کثیر ج۳ ص۳۹۴ ؎

۲: اسباب النزول ص۱۶۸ ؎۱۶۹

کے لوگوں سے کچھ بعید نہیں ہے۔ افسوس صد افسوس اقدار گر گئے معیار و میزان کھوٹے ہو گئے۔ عداوت و محبت کا فرق نہ رہا یعنی اسلام اور دشمنِ رسول سب ایک کر دیے گئے۔

ابتدائے کتاب میں ہم اپنے والد ماجد کا یہ قول اشارۃً نقل کر آئے ہیں کہ حضرت ابوطالب پر ان تمام تہمتوں اور بہتانوں کا ہدف خود ان کی ذات نہیں ہے بلکہ اس کا بالواسطہ حضرت امیرالمومنین علی ابن ابیطالبؑ سے ہے اور حضرت ابوطالبؑ کا قصور صرف یہ ہے کہ آپ حضرت علیؑ کے باپ ہیں!

اب ہم چاہتے ہیں کہ مرحوم کے اس قول کی تائید تاریخ سے بھی پیش کر دیں۔ گزشتہ صفحات میں ہم نے نقل کیا ہے کہ معاویہ نے سمرہ بن جندب سے ۴ لاکھ پر صرف اتنی سی بات کے لیے معاملہ کیا تھا کہ وہ ایک آیت کو حضرت علیؑ کی مذمت میں اور ایک کو ابن ملجمؑ کی مدح میں اتار دے بعینہ یہی بات حضرت ابوطالبؑ کیلئے نظر آتی ہے جیسا کہ بعض افراد کے اس قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ آیت انک لاتھدی حضرت ابوطالبؑ کے بارے میں ہے۔ کیونکہ رسول اکرمؐ ان کی ہدایت کے خواہاں تھے اور وہ نہ ہو سکی۔

اور آیت یاعباد الذین اسرفوا علی انفسھم لاتقنطوا من رحمۃ اللہ (اے میرے گنہ گار بندو! میری رحمت سے مایوس نہ ہو!) وحشی قاتل حضرت حمزہؑ کی شان میں میں نازل ہوئی ہے۔ رسول اکرمؐ اس کے اسلام کو نہ چاہتے تھے لیکن اللہ نے اسے ہدایت کر دی۔[1]

لطف یہ ہے کہ اس رائے کی نسبت بھی ابن عباس ہی کی طرف دی گئی ہے تاکہ بات کا کچھ وزن بڑھ جائے۔ اس بیچارے کو یہ خبر نہ تھی کہ ابن عباس کے دیگر اقوال سے تعارض و تضاد اس بات کی قیمت کو ختم کر دے گا۔

۱: مجمع البیان ج ۲ ص ۲۰۷۔ ۲۰۸

علاوہ اس شخص کے کہ اس شخص نے اپنے کلام کے تمام پہلوؤں پر بھی غور نہیں کیا۔ سب سے پہلے رسول اور خدا کی رائے میں اختلاف پیدا کیا۔ خداوند عالم ابوطالبؑ کے ایمان کا مخالف تھا اور رسولؐ موافق۔ آخرکار خدا کا ارادہ غالب آگیا اور ابوطالبؑ مسلمان نہ ہو سکے۔ خدا جانے اللہ اور ابوطالبؑ سے کونسی مخالفت چل رہی تھی۔ جس کا آخری وقت میں انتقام لیا گیا۔ کیا اس عداوت کا منشا اور باعث وہ خدمات تھیں جو زندگی بھر دین اسلام کے لیے انجام دی گئیں؟ یا وہ حمایت وحفاظت تھی جس میں آخر دم تک سرشار رہے۔ استغفر اللہ!

بعینہٖ یہی معاملہ وحشی کے ایمان میں بھی پیش آیا۔ اس نے رسولؐ کے چچا کو قتل کر دیا اس لیے ان کے دل میں کینہ بیٹھ گیا اور انھوں نے چاہا کہ یہ کسی طرح ایمان نہ لاسکے لیکن اللہ کو اپنے بندے کی حالت پر رحم آگیا، اس نے نہ رسولؐ کے جذبات کا لحاظ کیا اور نہ حمزہؓ کے اس خون ناحق کا جو اسی کی راہ میں بہا تھا۔ اور فوراً وحشی پر رحمت نازل کر دی اس لیے کہ اللہ کے ارادہ کا غالب آنا لازمی تھا۔ کاش یہ لوگ اتنا اور کہہ دیتے کہ وحشی کے ایمان میں کمال بھی پیدا ہو گیا۔ اس لیے کہ وہ آخر لمحۂ حیات تک شراب نہایت ہی پابندی سے استعمال کرتا رہا۔ اور کسی وقت بھی اپنے اس فریضہ سے غافل نہیں ہوا[1]۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ آیت وحشی کی شان میں کیسے نازل ہو گئی جبکہ آیت میں تمام مسلمانوں سے خطاب ہے۔ پھر آیت مکی بھی ہے اور جناب وحشی کی حیثیت کا اظہار مدینہ سے شروع ہوا[2]۔

حقیقت یہ ہے کہ مسئولیت اور مواخذہ کا یہ بارگراں ہر اس شخص کی گردن پر رکھا جائیگا جو زبان سے بات نکالتے ہوئے مسئولیت کا لحاظ نہ کرے گا۔ اور تمام اقدار و مفاہیم کو پامال کر کے صرف خواہش پرستی اور شکم پروری کی فکر کرے گا۔

۱: استیعاب ج ۳ ص ۶۱۱ ؎ ۲: مجمع البیان ج ۲۳ ص ۱۲۴ ؎

میراثِ ابوطالبؑ

انھیں تہمتوں میں سے جو شیخ بطحا حضرت ابوطالبؑ کے خلاف تراشی گئی ہیں کہ حضرت علی و جعفر نے ان کی میراث لینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ہم مسلمان ہیں وہ کافر تھے [1]۔

ہمارے سامنے اس تہمت کی سند موجود نہیں ہے ورنہ ہم اس رکیک روایت کی حقیقت بھی بے نقاب کرتے لیکن تاہم اتنا تو کہہ سکتے ہیں کہ اس روایت کا وضع کرنے والا اسلامی قانون توارث سے سراسر ناواقف تھا۔ ہم اس حدیث کو صحیح مانتے ہیں کہ لا توارث بین ملتین۔ دو مذہبوں کے درمیان میراث نہیں ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ کافر مسلم کا وارث نہیں ہوتا نہ یہ کہ مسلم کافر کا وارث نہیں ہوتا۔ مسلم کا مرتبہ بہر حال بلند ہے اس کی وراثت میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے

توارث کے معنی یہ ہیں کہ دو آدمیوں میں ایک دوسرے کا وارث ہو لہٰذا روایت کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ وراثت طرفین سے نہیں ہوتی۔ ایک طرف سے وراثت ثابت ہو جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے کافر کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ مسلمان عورت سے عقد کرے جبکہ مسلمان کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ اہلِ کتاب عورت سے عقدِ دائمی کر سکے جیسا کہ بعض علماء کا قول ہے یا عقد منقطع کر سکے جیسا کہ شیعہ علماء کا اجماع ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر ہم اس روایت کو تسلیم بھی کر لیں تو اس سے حضرت ابوطالبؑ کا کافر ہونا ثابت نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ میراث پانے والے وہ نہ تھے بلکہ ان کے مسلم الثبوت مسلمان وارث تھے۔

۱: السیرۃ الحلبیہ جلد ۱ صفحہ ۷۴، الحجۃ صفحہ ۳۲ - شیخ الابطح صفحہ ۷۸ ۔

حدیث ضحضاح

ہم سابق میں اس حدیث کی طرف اشارہ کر چکے ہیں جس میں حضرت ابو طالبؑ کو جہنم تک پہنچا دیا گیا ہے۔ اب اس کے صحیح الفاظ نقل کرنا چاہتے ہیں تاکہ اس کا مفصل تجزیہ کیا جا سکے۔

۱ : عبید اللہ ابن عمر القواریری، محمد بن ابو بکر المقدمی، محمد بن عبد الملک اموی نے ابو عوانہ، عبد الملک بن عمر، عبد اللہ بن حارث بن نوفل کے واسطے سے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ میں نے سوال کیا یا رسول اللہؐ کیا آپ کی حمایت ابو طالبؑ کے کچھ کام آئی؟ آپ نے فرمایا ہاں اس وقت وہ ضحضاح میں ہیں اگر میں نہ ہوتا تو درک اسفل میں ہوتے۔[1]

۲ : ابن ابی عمر نے سفیان، عبد الملک بن عمیر، عبد اللہ بن حارث کے واسطے سے عباس سے نقل کیا ہے کہ میں نے رسول اکرمؐ سے سوال کیا کہ کیا آپ کی حمایت و حفاظت ابو طالبؑ کے کچھ کام آئی؟ فرمایا ہاں وہ بڑی شدت میں تھے اب ضحضاح میں رکھ دیے گئے ہیں۔[2]

۳،۴ : محمد بن حاتم نے یحییٰ بن سعید، سفیان کے واسطے سے یہی روایت نقل کی ہے[3] اور اسی طرح ابو بکر ابن ابی شیبہ نے وکیع کے واسطے سے سفیان سے یہ روایت نقل کی ہے۔[4]

۵ : قتیبہ بن سعید نے لیث، ابن الہاد، عبد بن جناب کے واسطے سے ابو سعید خدری سے نقل کیا ہے کہ رسول اکرمؐ کے سامنے ابو طالب کا ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا شاید قیامت کے دن میری شفاعت ان کے کام آجائے اور ان کو ضحضاح میں

۱، ۲، ۳، ۴ : مسلم ج ۱ ص ۱۳۴ باب شفاعت النبی۔ ۵ : مسلم ج ۱ ص ۱۳۵۔

رکھ دیا جائے اس طرح کہ آگ پیروں تک ہو اور دماغ کا گودا ٹپک رہا ہو[1]

۶ : ابوبکر بن ابی شیبہ نے عفان، حماد بن سلمہ، ثابت، ابی عثمان، نہدی کے واسطے سے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت نے فرمایا کہ سب سے مختصر عذاب جہنم میں ابوطالب پر ہے۔ آگ کی دو جوتیاں پہنے ہیں اور بھیجا ٹپک رہا ہے[2]

۷ : مسدد نے یحییٰ، سفیان، عبدالملک، عبداللہ بن حرث کے واسطے سے عباس سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے حضرت سے سوال کیا کہ آپ کی حمایت ابوطالبؑ کے کچھ کام آئی۔ تو فرمایا کہ ہاں ابھی تو ضحضاح میں ہیں اگر میں نہ ہوتا تو درک اسفل میں ہوتے[3]

۸ - ۹ : عبداللہ بن یوسف نے لیث سے مثل حدیث ہفتم اور ابراہیم[4] بن حمزہ نے بھی ابن ابی حازم، دراوردی، یزید کے واسطے سے مثل حدیث خامس روایت کی ہے[5]

رواۃ کی حیثیتوں پر ایک نظر

تہمتوں کی فہرست نقل کرنے کے بعد ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کے رجال پر ایک نظر ڈال لیں تاکہ ان روایتوں کی صحیح قدر و قیمت معلوم ہو سکے۔

(۱)

۱ : عبداللہ قواریری کا کوئی ذکر میزان الاعتدال میں نہیں ہے۔ البتہ غدیر میں اس کی ایک روایت نقل ہوئی ہے۔ اور اس طرح پر تبصرہ ہوا ہے۔ اس سند میں

---

۱ : مسلم ج ۱ ص ۱۳۵ ۲ : ایضاً

۳ : ۴ : ۵ : بخاری ج ۲ ص ۱۰۲ ؎

عبیداللہ قواریری جس سے بخاری نے صرف پانچ حدیثیں نقل کی ہیں اور مسلم نے چالیس حالانکہ احمد بن یحییٰ نے اس سے ایک لاکھ حدیثیں سنی تھیں ۔ اب سوال یہ ہے کہ جب بخاری اور مسلم دونوں ہی نے ان تمام روایتوں کو ترک کر دیا ہے تو اس کی حدیثوں کی کیا قیمت رہ جاتی ہے جبکہ یہ فرض کر لینا ہمارے لیے مشکل ہے کہ بخاری و مسلم کو ان تمام روایتوں کی خبر نہ ہوئی ہو۔[1]

ب : محمد بن ابی بکر المقدمی کا بھی کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ صاحب غدیر نے اسے ضعیف قرار دیا ہے[2]۔ اور بغیر قید مقدمی کے ایک مجہول شخص کا ذکر رجال میں نظر آتا ہے[3]

ج : محمد بن عبدالملک الاموی۔ اس شخص کے لیے اموی ہونا ہی اس کی حیثیت کیلئے کافی ہے۔ اب اگر یہ مروان بن حکم ہے تو کیا کہنا۔ دونوں ہی رسول اکرمؐ کی دعا کے مصداق۔ اور مروان تو بقول حضرت عائشہ پیدائش سے پہلے ہی ملعون ہو چکا تھا۔ ویسے اس محمد کے بارے میں ابوداؤد کا خیال ہے کہ اسکی عقل محکم نہ تھی[4]

د : فی الحال ابوعوانہ کو صیغۂ راز ہی میں رہنے دیجیے۔

ہ : عبدالملک بن عمر شعبی کے بعد کوفہ کا حاکم بن گیا۔ اتنا زندہ رہا کہ بقول ذہبی اس کا حافظہ خراب ہو گیا۔ اور بقول ابوحاتم حافظہ بالکل بدل گیا۔ بقول امام احمد غلطیاں بہت کرتا تھا۔ ابن معین کی رائے میں خلط ملط بہت کرتا تھا۔ ابن فراش کے نزدیک شعبہ اسے پسند نہ کرتا تھا۔ امام احمد ضعیف سمجھتے تھے[5]۔ ابن حبان کی نظر میں دوٹ پٹانگ نکتا تھا[6]

اس قاضی کے فضائل میں یہ نقل کیا گیا ہے کہ جب ابن زیاد نے عبداللہ بن یقطر کو پشت بام سے پھینک دیا تو اس کا گزر ان کے قریب سے ہوا۔ اس نے بڑی رحمدلی سے

۱: التہذیب ج ۹ ص ۲۹۵ تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۲۱۲ ۲: میزان الاعتدال ج ۳ ص ۹۶ ۳: المیزان ج ۳ ص ۹۶

۴: المیزان ج ۲ ص ۱۵۱ ۵: دلائل الصدق ج ۱ ص ۴۵ ۶: اعیان الشیعہ ج ۱ ص ۲۲۲

ساتھ اپنے چاقو سے ان کا خاتمہ کر دیا[1] ماشاء اللہ!
اس کی خواہش پرستی اور شہوت رانی کی اس درجہ شہرت تھی کہ ایک مرتبہ کلثم بنت سریع اپنے گھر والوں کے خلاف مقدمہ لے کر آئی، اس نے فوراً اس کے حق میں فیصلہ دیدیا۔ لوگوں نے فیصلہ کے راز کو تاڑ لیا اور ہذیل بن عبداللہ اشجعی نے اشعار نظم کرنا شروع کر دیے جن میں اس کی عادلانہ قضاوت کا صحیح تجزیہ کیا گیا تھا[2]

(۲)

حدیث دوم:

ا: ابتدائے سند میں ابن ابی عمر کا ذکر ہے جو لاپتہ ہے۔
ب: اس کے بعد سفیان ہے جس کی کذابیت، جعلسازی اور لاپروائی ثابت ہو چکی ہے

(۳)

حدیث سوم: اس کے تمام رجال پر باقاعدہ تبصرہ ہو چکا ہے۔

(۴)

ا: ابوبکر بن ابی شیبہ ۔ ذہبی کی نظر میں مجہول الاسم ہے۔
ب: وکیع کا نام و نسب ہی نہیں معلوم ۔ شاید یہ وکیع بن جراح ہو جس کے بارے میں ابوالمدینی کا قول ہے کہ اکثر الفاظ کو غلط کر دیا تھا۔ امام احمد بن حنبل سے پوچھا گیا کہ اگر وکیع اور عبدالرحمٰن بن مہدی میں اختلاف ہو جائے تو کون مقدم ہے؟ فرمایا عبدالرحمٰن ٹھیک کہتا ہے بالخصوص سفیان کے بارے میں۔ اور اتفاقاً یہ روایت بھی سفیان ہی سے منقول ہے۔ ذہبی نے اس کی یہاں تک مذمت کی ہے کہ اس میں تشیع کا جذبہ بھی تھا اور یہ وہ بات ہے جو ذہبی کی نظر میں کفر و الحاد سے بھی زیادہ بدتر ہے۔ بہر حال ہمارا مقصد یہ ہے کہ یہ شخص ضعیف تھا

۱: اعیان الشیعہ ج ۱ ص ۲۲۳ ۲: البیان والتبیین ج ۳ ص ۲۷۱ ۳: المیزان ج ۳ ص ۳۰۵

اور اگر بفرض محال شیعہ بھی تھا تو پھر یہ روایت اس سے صادر ہی نہیں ہو سکتی۔

(۵)

حدیث پنجم:

ا : قتیبہ بن سعید۔ ذہبی کی نظر میں غیر معروف ہے[۱]

ب : لیث۔ اس نام کا ایک انبار ہے جس میں سب مجہول، ضعیف، منکر اور مضطرب قسم کے لوگ ہیں۔ صاحب شیخ الابطح کا خیال ہے[۲] کہ یہ لیث بن سعد ہے۔ بہر حال اگر یہ وہی ہے تو اس کے بارے میں ابن معین کا خیال ہے کہ روایت سننے میں تساہل کرتا تھا اور ربانی کی نظر میں[۳] یہ ضعفاء کی فہرست میں داخل تھا[۴]

ج : یزید بن عبداللہ بن الہاد۔ اسے ابن حذا نے رجال، موطا کے ضعفاء مجروحین میں شمار کیا ہے اور ابن معین کا خیال ہے کہ یہ ہر ایک سے روایت کرتا تھا[۵]

د : عبداللہ بن خباب۔ یہ جوزجانی کی نظر میں غیر معروف ہے[۶]

(۶)

حدیث ششم:

ا : ابو بکر ابن ابی شیبہ۔ اس کی حیثیت واضح ہو چکی ہے۔

ب : عفان بظاہر یہ عفان بن مسلم ہے اس لیے کہ روایت حماد اور ثابت سے ہے اور اسی قسم کی ایک روایت ذہبی نے اسکی طرف منسوب کی ہے بہر حال اس کے بارے میں ابن عدی کا خیال ہے کہ اگر یہ پوری قوت بھی صرف کر دے تو بھی ایک حدیث یاد نہیں کر سکتا۔ بدحافظہ، کند ذہن اور بقول ابو خثیمہ

۱: المیزان ج ۲ ص ۳۳۵ ۲: شیخ الابطح ص ۴۷ ۳: المیزان ج ۳ ص ۱۲ ۴: شیخ الابطح ص ۴۷

۵: المیزان ج ۳ ص ۳۱۴ ۶: المیزان ج ۲ ص ۳۳

مرنے سے پہلے ہی بگڑ چکا تھا[1]

ج : حماد بن سلمہ — بقول ذہبی صاحب اوہام ہے۔ بقول ابن مدینی یحییٰ بن ضریر کے پاس اس کی دس ہزار حدیثیں تھیں اور بقول عمرو بن سلمہ اس سے کچھ زائد[2] اب خدا جانے تیسرے شخص کے پاس کس مقدار میں رہی ہونگی؟ لطف تو یہ ہے کہ خود حماد کو ان احادیث کی خبر نہیں تھی۔ ایک مرتبہ اباد ان چلا گیا اور وہاں سے پلٹ کر یہ سب بیان کرنے لگا تو لوگوں نے کہا معلوم ہوتا ہے اسے کسی سمندری شیطان نے نکل کر یہ سب سکھا دیا ہے۔ عباد بن صہیب کا خیال ہے کہ یہ حافظ نہیں تھا۔ اس لیے اسکی روایتوں میں اضافے ہو گئے ہیں۔ بلکہ بعض کا تو کہنا ہے ابن ابی العوجاء نے ان میں دسیسہ کاریاں کر دی تھیں[3]۔ بہر حال کوئی اس کی کسی قدر تعریف کیوں نہ کرے ہمارے پاس اس کی وہ حدیثیں بھی ہیں جن میں تجسیم باری تعالیٰ کا افسانہ بڑی آزادی سے نقل ہوا ہے تو کیا اس کے بعد بھی ہم اسے معتبر مان سکتے ہیں؟ اسی حماد نے ثابت کے واسطے سے انس سے یہ روایت کی ہے کہ رسول اکرمؐ نے تجلی طور کی تفسیر انگلی کے چٹکیاں بجانے سے کی ہے۔ چنانچہ حماد نے ثابت سے سوال کیا تو اس نے کہا کہ جب رسول اکرمؐ نے کہا ہے تو میں کیوں نہ بیان کروں۔ ترمذی نے بھی اس روایت کی تصحیح کر دی ہے۔ استغفر اللہ! حماد ہی کا قول ہے کہ اللہ ایک حسین امرد لڑکے کی شکل کا ہے۔ اس کے کپڑے بھی سبزی مائل چمکدار ہیں[4]۔ یہ وہ روایتیں ہیں جن سے متاثر ہو کر ذہبی نے تمام تعریفوں کو بھلا کر کہہ دیا ہے کہ ایسے مہملات اس کے پاس بہت زیادہ ہیں اور شاید اب اس نے نیا خواب

۱: المیزان ج ۱ ص ۲۲۲ ۲: ایضاً ص ۲۷۲ ۳: ایضاً ص ۲۷۷ ۴: ایضاً ص ۲۷۸

۵: المیزان ج ۳ ص ۲۷۸ ۶: ایضاً ص ۲۲۸

دیکھا ہو۔ ابن عدی نے اس کے منفرد روایات کا تذکرہ کیا ہے اور بخاری نے بالکل اعراض کر لیا ہے[1]

د : ثابت ۔۔ اس کے متعلق ہمیں تفصیلاً علم نہیں ہے اس لیے کہ راویوں میں اس نام کا ایک ڈھیر ہے جس میں کوئی کاذب، کوئی ضعیف اور کوئی منکر الحدیث ہے خدا جانے موصوف کن صفات سے متصف تھے؟ شاید یہ ثابت ابن ابی ثابت یعنی حبیب کے بھائی ہوں جن کے متعلق ذہبی کی رائے ہے کہ یہ ایک مجہول شخص ہے[2] لیکن اس کے باوجود حماد نے اس سے روایتیں کی ہیں جیسا کہ ابھی تجسیم کی روایت میں دیکھا جا چکا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب ایسے اشخاص حضرت احدیت کو نہیں بخش سکتے تو حضرت ابوطالب[3] کس شمار میں ہیں؟

ھ : ابو عثمان النہدی ۔ خدا جانے کون اور کیا ہے[4]؟

(۷)

حدیث ہفتم:

ا : مسدد ۔ معلوم نہیں کہ یہ کون ہے؟ البتہ اس نام کا ایک شخص ذہبی نے نقل کیا ہے جس میں تساہلی بہت تھی[5]

ب : بقیہ سند میں یحییٰ، سفیان اور عبدالملک وغیرہ ہیں جن کی تحلیل کی جا چکی ہے

(۸)

حدیث ہشتم:

ا : عبداللہ بن یوسف اگر یہ تنیسی ہے جیسا کہ صاحب شرح الابطح[6] کا خیال ہے تو ابن عدی کے نزدیک ضعیف ہے[7]۔ اور اگر عبداللہ بن سلیمان بن یوسف ہے

---

۱ : المیزان ج ۱ ص ۲۲۳ ۲ : ایضاً ص ۱۷۹ ۳ : ایضاً ص ۱۲۶-۱۲۷ ۴ : ایضاً ص ۱۲۸ ج ۲

۵ : المیزان ج ۳ ص ۱۷۴ ۶ : ایضاً ص ۱۲۳ ۷ : شیخ الابطح ص ۱۰ ۸ : المیزان ج ۲ ص ۸۹ ج ۲

جو لیث سے روایت نقل کرتا ہے جیسا کہ میرا ذاتی خیال ہے تو یہ غیر معتبر[1] اور مشکوک[2] ہے۔ اس کے فضائل کی حدیثوں کا ذہبی نے انکار کر دیا ہے۔[3]

ب: لیث کے بعد سے آخر تک کے رواۃ پر تبصرہ کر دیا گیا ہے۔

(۹)

حدیث نہم:

ا: ابراہیم بن حمزہ ۔۔ اسے پردۂ اخفا ہی میں رہنے دیجئے۔

ب: ابن ابی حازم ۔۔ اس کا نام عبد العزیز تھا، اپنے باپ سے روایت کرتا تھا، اس کے علاوہ سلیمان بن بلال کی کتاب سے بھی نقل کرتا تھا لیکن لاپروائی کے ساتھ۔ فلاس کا قول ہے کہ ابن مہدی نے اس سے کوئی حدیث نقل نہیں کی۔ احمد کا قول ہے کہ اسے طلب حدیث میں شہرت نہ تھی اپنے باپ کے علاوہ ہر حدیث میں ضعیف ہے۔ ابن المدینی کا قول ہے کہ حاتم بن اسمٰعیل کو باپ سے نقل شدہ حدیثوں پر اعتراض تھا بلکہ ان کا مقولہ تھا کہ میں نے اسے منع بھی کیا ہے لیکن اس نے قبول نہیں کیا۔[4]

ج: الدراوردی ۔۔ یہ عبد العزیز بن محمد[1] ہے جس کے بارے میں امام احمد کا خیال ہے کہ اس کا حافظہ خراب تھا۔ یہ ایک لاشی محض الشان تھا۔ ہمیشہ خرافات نقل کرتا تھا۔ ابو حاتم کا خیال ہے کہ یہ ایک ناقابل استدلال شخص ہے اور ابو زرعہ کی نظر میں بدحافظہ ہے۔[2]

د: یزید ۔۔ اس کا علم نہیں یہ کون ہے؟ اگر ابن کیسان ہے تو اس کی حیثیت عرفی ظاہر کی جا چکی ہے۔

۱: المیزان ج ۲ ص۸۹ ۲، ۳: ایضاً ص۴۲ ۴: ایضاً ص۱۳۵ ۵: شرح الابطح ص۵

۲: ایضاً ص۱۳۷ ۔ ۱۳۹

اصل حدیث پر ایک نظر

ہمارا رواۃ کے سلسلے میں ایک سرسری مطالعہ اس بات پر مجبور کر رہا ہے کہ ہم ان تمام روایتوں کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیں اس لیے کہ ان کے راوی مجہول، کاذب ضعیف، جعلساز، بے ایمانوں کے علاوہ کچھ نہیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ ایک راوی کی خرابی بھی روایت کو درجۂ اعتبار سے ساقط کر دیتی ہے۔ چہ جائیکہ شروع سے آخر تک سب ایک ہی قسم کے راوی ہوں۔ لیکن بایںہمہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک طائرانہ نظر اصل حدیث کی حیثیت پر بھی ڈال لی جائے۔

(۱)

جس وقت ہم حدیث ضحضاح کی عبارت کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ان مختلف حدیثوں میں ایک عجیب قسم کا تضاد نظر آتا ہے۔

بعض روایات کا مفہوم یہ ہے کہ "ابوطالب ضحضاح میں ہیں اور اگر رسول اکرمؐ کی سفارش نہ ہوتی تو درکِ اسفل میں ہوتے"۔ اس عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ کی سفارش ہو چکی اور ابوطالبؑ اس سے مستفیض ہو چکے۔ جیسا کہ حدیث دوم میں صاف صاف مذکور ہے کہ "میں نے ان کو بڑی سختیوں میں پایا تو نکال کر ضحضاح تک پہنچا دیا"۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ رسول اکرمؐ کے اختیارات اتنے وسیع تھے کہ وہ ابوطالبؑ کو سختیوں سے نکال کر ضحضاح تک پہنچا دیں تو آپ نے اتنا کرم اور کیوں نہ کر دیا جہنم ہی سے نکال دیتے۔ مجھے تو اس وقت متنبی کا یہ شعر یاد آ رہا ہے:

ولم ار فی عیوب الناس شیئًا
کنقص القادرین علی التمام

دلوگوں کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ تکمیل پر قادر ہوں اور کام کو ناقص چھوڑ دیں۔)

پھر جبکہ رسول اکرمؐ انسانی اخلاق کے معلم اور بشری اقدار کے نمونۂ کامل تھے کیا خدائی تعلیم کا اثر یہی ہوتا ہے!

اس کے مقابلے میں بعض روایات وہ ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شفاعت قیامت کے روز کام آئیگی۔ بلکہ ان میں ایک کلمہ لعل بھی ہے جسمیں صرف امید کے معنی پائے جاتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ رسول کو اپنی شفاعت پر بھی اعتماد نہیں ہے۔ معاذ اللہ!

تیسری قسم یہ ہے کہ جسمیں ابوطالبؑ کو تمام اہل جہنم سے خفیف العذاب قرار دیا گیا ہے۔ اس میں شفاعت کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ جس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ شاید استحقاق ہی مختصر عذاب کا ہو۔ لیکن سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اس اختصار کی وجہ کیا ہے؟ اور اسے اختصار کیونکر کہیں گے کہ انسان کو آگ کی جوتیاں پہنادی جائیں اور وہ بھی اس طرح کہ پیر کی جوتیوں سے سر کا بھیجہ بہہ نکلے۔ اعوذ باللہ!

علاوہ اس کے کہ یہ روایت اس توجیہ کے بھی خلاف ہے جو بعض علماء نے کی ہے کہ چونکہ ابوطالبؑ باطل پر ثابت قدم تھے اس لیے عذاب بھی قدموں ہی پر ہوا ہے جیسا کہ قرآن کا قانون ہے کہ عذاب گناہ سے مشابہ ہوتا ہے[1]۔ اس لیے کہ اگر عذاب قدموں پر ہے تو بھیجہ کیوں بہتا ہے؟ اور پھر کیا بھیجہ بھی کوئی چشمہ ہے کہ جس قدر بہتا جاتا ہے اسی قدر بڑھتا جا رہا ہے۔

(۲)

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ رسول اکرمؐ ایک ایسے انسان کی کس طرح شفاعت

---

(۱) السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۸۳

کر سکتے ہیں جس کے قلب میں اسلام کا گزر ہی نہ ہوا ہو جبکہ قرآن مجید کی متعدد آیتوں نے آپ کو ایسے افراد سے محبت، مودت، موالات اور تعلقات سے منع کیا ہے چہ جائیکہ شفاعت جس کا درجہ ان سب سے مافوق ہے۔ پھر حضرت کو اس شفاعت کی ضرورت بھی کیا تھی؟ اگر یہ اس حمایت وحفاظت کا صلہ ہے جو ابوطالبؑ نے انجام دی تھی اور رسالت کا بوجھ اٹھانے میں ہاتھ بٹایا تھا تو ابوطالب ہی کو اس ہمدردی کی کیا پڑی تھی؟ اور اگر انھوں نے سلسلہ تبلیغ میں کوئی احسان کیا تھا تو حضرت نے اسے قبول کیسے کر لیا جبکہ آپ کی دعا یہ تھی کہ خدایا مجھ پر کسی کافر ومشرک کا احسان نہ ہونے پائے۔

پھر سوال یہ ہوتا ہے آیا رسول کی شفاعت کا نتیجہ ہی کیا تھا جبکہ قرآن کی آیت نے صاف صاف اعلان کر دیا تھا کہ کافروں پر رحمت الہٰی نہیں ہو سکتی۔ ان کے عذاب میں تخفیف غیر ممکن ہے، ان کیلئے شفاعت کی امیدیں نہیں کی جا سکتیں

ا : خالدین فیہا لا یخفف عنہم العذاب ولا ہم ینظرون
(اہل جہنم نہ باہر نکل سکیں گے اور نہ ان کے عذاب میں کمی ہوگی)

ب : اولئک الذین اشتروا الحیوٰۃ الدنیا بالاخرۃ فلا یخفف عنہم العذاب ولا ہم ینصرون۔
(آخرت کو دنیا سے بدلنے والوں کے عذاب میں تخفیف نہیں ہوگی۔)

ج : وذروا الذین اتخذوا دینہم لعباً ولہواً وغرتہم الحیوٰۃ الدنیا وذکر بہ ان تبسل نفس بما کسبت لیس لہا من دون اللہ ولی ولا شفیع وان تعدل کل عدل لا یؤخذ منہا اولئک الذین ابسلوا بما کسبوا لہم شراب من حمیم وعذاب الیم بما کانوا یکفرون۔

(دین کو بازیچہ بنانیوالوں کا کوئی شفیع نہیں ہو سکتا ان کے لیے دردناک عذاب ہے اس لیے کہ یہ کافر ہیں ۔)

د : واذا رای الذین ظلموا العذاب فلا یخفف عنھم ولاھم ینظرون
جب ان کے سامنے عذاب آجائیگا تو پھر تخفیف غیر ممکن ہے)

ہ : والذین کفروا لھم نار جھنم لایقضی علیھم فیموتوا ولا یخفف عنھم من عذابھا کذالک نجزی کل کفورا
(کافرین کے عذاب میں کسی طرح کی تخفیف ممکن نہیں ہے ۔)

و : وقال الذین فی النار لخزنة جھنم ادعوا ربکم یخفف عنا یوماً من العذاب قالوا أولم تک تاتیکم رسلکم بالبینات قالوا بلی قالوا فادعوا وما دعاء الکفرین الا فی ضلل ۔
(اہل جہنم ہزار تخفیف کی دعائیں کریں لیکن سب بیکار ہیں)

ز : فی جنات یتساءلون عن المجرمین ما سلککم فی سقر قالوا لم نک من المصلین ولم نک نطعم المسکین وکنا نخوض مع الخائضین وکنا نکذب بیوم الدین حتی اتانا الیقین فما تنفعھم شفاعة الشافعین ۔
(روز جزا کا انکار کرنے والے اور بے نمازی وغیرہ کی شفاعت نہیں ہو سکتی)

ح : وانذرھم یوم الآزفة اذ القلوب لدی الحناجر کاظمین ما للظالمین من حمیم ولا شفیع یطاع
ظالمین کی شفاعت نہیں ہو سکتی ۔

اسی مفہوم کی بعض حدیثیں بھی پائی جاتی ہیں ۔

ط : اذا دخل اھل الجنة واھل النار النار ثم یقوم موذن بینھم یا

اہل النار لاموت ویا اہل الجنۃ لاموت خلود

جنت وجہنم دونوں دائمی ہیں[1]

ی : یقال لاہل الجنۃ خلود لاموت ولاہل النار یا اہل النار خلود لاموت

اہل جنت وجہنم دونوں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے[2]

ان تمام احادیث وروایات سے صاف صاف واضح ہوتا ہے کہ کفار ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ ان کے عذاب میں تخفیف نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ یہ لوگ شفاعت کے حدود سے خارج ہیں۔

(۳)

علاوہ اس کے کہ حدیث کے رواۃ ضعیف اور کاذب ہیں، ماسوا اس کے کہ ان کی عبارتوں میں تناقض وتعارض ہے، علاوہ اس کے ان کا مفہوم صریح آیات قرآنیہ سے متصادم ہے۔

علاوہ ان تمام باتوں کے یہ حدیث اس احتضار والی حدیث سے بھی متعارض ہے جسے سابق میں نقل کیا جاچکا ہے۔ اور مزید لطیفہ یہ ہے کہ دونوں کے بعض راوی مشترک بھی ہیں یتعجب کی بات ہے کہ ابن عمر، محمد بن حاتم اور یحییٰ بن سعید وغیرہ کے یہاں تو شفاعت کی حدیث وضع کردی ہے اور یہ بھول گئے ہیں کہ وقت احتضار کے لیے جو حدیث وضع کی تھی اس میں آنحضرتؐ نے کہا تھا: چچا کلمہ پڑھ لو تاکہ شفاعت کے امکانات پیدا ہوجائیں) ۔ اور ابوطالبؑ نے پڑھا تھا[3] کسی نے سچ کہا ہے کہ دروغ گوئی کیلئے خاصے حافظے کی ضرورت ہوتی ہے۔

اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ ابوطالبؑ نے وقت احتضار کلمہ پڑھ لیا تھا تو پھر یہ

۱، ۲ : بخاری ج ۴ صفحہ ۶

۳ : الغدیر ج ۷، ص ۳۷۰، ج ۸ ص ۲۴ بحوالہ کتب مختلفہ۔

رسول کا بخل ہو گا کہ ان کو قعر جہنم سے نکال کر ضحضاح میں ڈال دیں۔ بھلا یہ بھی کوئی کرم و شفاعت اور تخفیف ہے کہ پیر میں جوتیاں ہوں اور سر سے بھیجہ اُبل رہا ہو۔ استغفر اللہ! اس کے علاوہ بخاری و مسلم میں ایسی روایتیں بھی ہیں جن میں کلمہ گو کو جنتی بتایا گیا ہے۔ تو بیچارے ابوطالبؑ ہی کا کیا قصور تھا کہ ان کا کلمہ ضحضاح بھر کا ہو کر رہ گیا ملاحظہ ہوں چند حدیثیں:

ا : من مات وھو یعلم انہ لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ۔

(جو خدا کو واحد جان کر مر جائے وہ جنتی ہے۔)

ب : لا یدخل النار احد یقول لا الٰہ الا اللہ۔

کلمہ گو جہنم میں نہیں جا سکتا[۱]

اس کے علاوہ متعدد حدیثیں ایسی ہیں جن میں شفاعت کو صرف ایمان و اسلام پر معلق کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ حدیثیں بھی اس حدیث ضحضاح کی مخالف ہیں جس میں باوجود شرک ابوطالبؑ کی شفاعت کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہوں چند احادیث:

ا : قیل لی سل فان لکل نبی قد سئل فاخرت سئالتی الی یوم القیامۃ فھی لکم شھد انہ لا الٰہ الا اللہ

(میرا سوال قیامت کے روز اہلِ توحید کے لیے ہوگا)[۲]

ب : اعطیت الشفاعۃ وھی نائلۃ من امتی من لا یشرک باللہ شیئاً۔

مجھے شفاعت کا حق دیا گیا ہے لیکن ان کے لیے جو مشرک نہ ہوں۔)

ج : ان شفاعتی لکل مسلم

(میری شفاعت مسلمانوں کے لیے ہے)

---

۱ مسلم ج ۱ ص ۴۱ الغدیر ج ۹ ص ۱۲۴ الغدیر ج ۱ ص ۹، ۱۱۹ ۲ : سیر اعلام النبلاء ج ۲ ص ۱۹۵

۳ : الغدیر ج ۸ ص ۲۴ ج ۴ ص ۱۵۰ ۱۵۸

د: اوحی اللہ الی جبریل ان اذھب الی محمد فقل لہ ارفع راسک سل تعط واشفع تشفع ۔ ادخل امتک من خلق اللہ من شھد ان لا الہ الا اللہ یوماً واحداً مخلصاً ومات ذالک ۔

(اللہ نے پیغمبرؐ کی طرف وحی کی کہ اگر کوئی ایک دن بھی خلوص سے توحید کا اعتراف کرلے تو جنت میں لے جاؤ ۔)

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ کا حق شفاعت صرف اہل اسلام سے مخصوص ہے ۔ کافر کے بارے میں شفاعت کرنے کا حق نہیں ہے علاوہ اس کے کہ پیغمبرؐ نے بھی اپنے حق کو قیامت پر اٹھا رکھا ہے جیسا کہ حدیث ا سے واضح ہوتا ہے ۔

ان روایات میں شفاعت کی مقدار بیان نہیں ہوئی ہے لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس کی شفاعت ہوجائیگی وہ جہنم میں نہیں جاسکتا اس لیے کہ سابق روایتوں نے اہل توحید کو جنتی ثابت کر دیا ہے ۔

اس کے بعد لمحۂ فکریہ یہ رہ جاتا ہے کہ ان تمام حدود وقیود کے باوجود حضرت رسول مقبولؐ نے دنیا ہی میں اور ایک مشرک کی شفاعت کیسے قبول کرلی ؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ حدیث صرف حدیث احتضار ہی سے متعارض نہیں بلکہ متعدد حدیثوں سے تعارض رکھتی ہے اور قاعدہ کی رُو سے یہی تعارض و تضاد روایت کے اعتبار کو ختم کرنے کے لیے کافی ہے ۔ یہ تو اتفاق ہے کہ دونوں روایتوں کے راوی بھی جعلسازی اور افترا پردازی میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہیں ۔

اس مقام پر بعض حدیثیں اور بھی ہیں جن کا نقل کر دینا لطف سے خالی نہ ہوگا

ملاحظہ ہوں:

أ: یدخل الجنہ من امتی سبعون الف بغیر حساب [1]

(میری امت کے ستر ہزار افراد بلا حساب جنت میں جائیں گے، بلکہ ایک احتمال ابوحازم کی نظر میں سات لاکھ کا بھی ہے [2])

ب: یبعث من ھذہ المقبرۃ البقیع - سبعون الفا ید خلون الجنۃ بغیر حساب [3]

(بقیع میں دفن شدہ ستر ہزار افراد بلا حساب داخل بہشت ہوں گے۔

ج: لیدخلن الجنۃ من امتی سبعون الفا لاحساب علیھم ولاعذاب مع کل الف سبعون الفا [4]

(میری امت کے ستر ہزار افراد بلا حساب جنت میں جائیں گے اور ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار ہوں گے۔)

د: انی وجدت ربی ماجد اکریما اعانی مع کل واحد من السبعین الالف الذین ید خلون الجنۃ بغیر حساب سبعین الفا [5]

(میرا رب بڑا کریم ہے اس نے ستر ہزار میں سے ہر ایک کے لیے ستر ہزار ساتھ کر دیے ہیں۔)

اس قسم کی بیشمار حدیثیں ہیں جن میں بے حساب شفاعت کا حساب لگایا گیا ہے۔ ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ آپ حضرات ستر ہزار کو ستر ہزار میں ضرب دیکر رسول اکرمؐ کے حق شفاعت کی وسعت کا اندازہ کریں بلکہ ہمیں تو صرف یہ

۱: مسلم ج ا ص۱۳۷ بخاری ج ۴ ص۴۲ ۲: الغدیر ج ۵ ص۲۸۳ طبرانی ج ۴ ص۱۳۱

۳: الغدیر ج ۵ ص۱۳ از مجمع الزوائد ج ۱۰ ص۴۰۵ ۴: الغدیر ج ۵ ص۲۸۳

پوچھنا ہے کہ کیا اس حدیث ضحضاح کے راوی نے اس ضرب وجمع کا حساب لگا کر ان تمام افراد کا جائزہ لے لیا ہے کہ اس میں حضرت ابوطالبؑ نظر نہیں آسکے۔ اور ان کی منزل ضحضاح قرار دیدی گئی۔

یاد رہے کہ ان تمام روایات کو نقل کرنے سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم ان تمام روایات پر ایمان لاچکے ہیں یا انھیں تسلیم کر چکے ہیں ہرگز نہیں ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ یہ روایتیں بھی انہی کتابوں میں درج ہیں جن میں یہ ضحضاح کی حدیث ہے اور مزید لطف یہ ہے کہ بعض کے راوی بھی ضحضاح والے ہی افراد ہیں۔

جی چاہتا ہے کہ اس مقام پر ایک مرد انصاری انیس نامی جسے معاویہ نے علیؑ پر سب وشتم کیلئے معین کیا تھا اس کے خطبے کا اقتباس بھی نقل کردوں یہ شخص منبر پر جا کر حمد باریتعالیٰ کے بعد یوں گوہر ریز ہوتا ہے:

لوگو! تم نے اس بیچارے پر بہت زیادہ سبّ وشتم کیا ہے۔ خدا کی قسم میں نے رسولِ اکرمؐ کو یہ کہتے سنا ہے کہ روز قیامت روئے زمین کے کنکر پتھر سے زیادہ افراد کی شفاعت کروں گا۔ خدا کی قسم رسولؐ بڑا صلۂ رحم کرنے والا رسولؐ تھا، تو کیا تم لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ہر ایک کی شفاعت کریگا؟[۱] اور اپنے اہلبیت کو چھوڑ دے گا۔!

حقیقت یہ ہے کہ یہ کلام اتنا پُرمغز اور حساس ہے کہ اس پر کسی تبصرہ وتنقید کی ضرورت نہیں ہے۔

(۴)

حدیث ضحضاح سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ رسولِ اکرمؐ اپنے چچا ابوطالبؑ کی

۱: الغدیر ج۰ ا ص۲۰ اسد الغابہ ج ا ص۱۳۴ اصابہ ج ا ص۵۹ استیعاب ج ا ص۴۷ (قدرے اختلاف کے ساتھ)

شفاعت ضرور کریں گے، اب سوال یہ ہوتا ہے کہ یہ شفاعت کلمہ پڑھنے کے بعد ہے یا کلمہ پڑھنے سے پہلے؟

اگر یہ کہا جائے کہ یہ شفاعت کلمہ پڑھنے کے بعد کی ہے تو سابق کے روایات کی بنا پر انھیں جنت میں ہونا چاہیے ضحضاح میں کیا کام ہے؟ اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ شفاعت کلمہ پڑھنے سے پہلے کی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آنحضرتؐ مشرکین کی بھی شفاعت کریں گے حالانکہ یہ بات ان صریح آیتوں کے خلاف ہے جن میں مشرکین سے ہمدردی کی ممانعت کی گئی ہے اور ظاہر ہے جو روایت قرآن کریم سے متعارض ہوئی اس کی جگہ دیوار ہوتی ہے خواہ اس کے راوی کتنے ہی ثقہ اور معتبر کیوں نہ ہوں! چہ جائیکہ یہ روایات جن کے رواۃ ایک سے ایک بڑھ کر بے ایمان اور جعلساز قسم کے لوگ ہیں۔

(۵)

لطیفہ یہ ہے کہ ان احادیث کو حضرت عباس کی طرف منسوب کیا گیا ہے حالانکہ یہ تمام حدیثیں اس حدیث احتضار سے صریحی تضاد رکھتی ہیں جسمیں حضرت عباس نے رسول اکرمؐ سے یہ عرض کی تھی کہ ابوطالب نے آپ کی بات رکھ لی اور کلمہ پڑھ لیا ہے۔ ہم سابق میں یہ کہہ چکے ہیں کہ جس شخص کو حدیث احتضار پر عمل کرنا ہے اس کا انسانی اور اخلاقی فرض ہے کہ حدیث کو آخر تک تسلیم کرے اور درمیان سے الگ نہ کرے!

اب اگر کوئی شخص ان دونوں حدیثوں کو صحیح طریقے سے اخذ کرے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ایک اچھے خاصے تعارض و تصادم میں گرفتار ہو گیا اور اگر چاہے کہ ایک کو ترک کر کے ایک کو قبول کرے تو یہ غیر ممکن ہوگا اس لیے کہ دونوں کے اکثر راوی ایک ہی ہیں اگر ایک راوی کی روایت قابل ترک ہے تو دوسری

روایت قابلِ عمل کیسے ہوگی؟

(۶)

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر رسولِ اکرمؐ کو کیا ضد ہے کہ ابوطالب کو ایک طبقۂ جہنم سے نکال کر دوسرے طبقے میں ڈالدیں جبکہ یہ ان کے جود و کرم کے علاوہ اس حدیث کے بھی خلاف ہے جو حضرت عثمان کی شان میں تیار کی گئی ہے۔
"عثمان کی شفاعت سے ستر ہزار مستحقِ جہنم بلاحساب جنت میں چلے جائینگے"۔[1]

ذرا ملاحظہ کیجئے ایک دو چار نہیں ستر ہزار۔؟ اللہ اکبر! خلیفہ کے اختیارات اتنے وسیع اور نبی کے اختیارات اتنے محدود! اس کا مطلب تو یہ ہے کہ صحابیٔ رسول کا درجۂ تقرب عظمت رسول سے ستر ہزار گنا زیادہ ہے وہ اتنے کی شفاعت کرسکتا ہے، اور یہ ایک کو بھی جنت میں لیجانے سے عاجز ہے۔؟

شاید اس امتیاز کا سبب یہ ہو کہ حضرت ابوطالبؑ اپنی حفاظت و رعایت اور نصرت و حمایت کی بناپر اس بات کے مستحق ہو گئے کہ عثمان کی سفارش سے اچھے خاصے گنہ گار جنتی بن جائیں اور وہ رسول کی شفاعت سے بھی جنتی نہ بن سکیں۔ بلکہ ایک طبقے سے نکل کر دوسرے طبقے میں رہ جائیں۔ اور اس طبقے کی حالت' العیاذ باللہ!

حقیقت یہ ہے کہ ابوطالبؑ کے بارے میں شفاعت نہ ہونے ہی کی روایت زیادہ مناسب ہے اس لیے کہ شفاعت اس شخص کی ہوتی ہے جو خود اپنے عمل سے جزا کا مستحق نہ ہو تو کیا ابوطالبؑ جیسا فداکار، جاں نثار اور محافظِ اسلام د

---

[1] الصواعق صفحہ ۷۵ ۔ الغدیر جلد ۹ صفحہ ۲۶۸ از فتوحاتِ اسلامیہ،
الغدیر جلد ۸ صفحہ ۳۰۲ ؎

رسولِ اسلام بھی مستحقِ جنت نہ ہوگا؟!

اگر جنت ابوطالبؑ جیسے مجاہد اور مخلص کے لیے نہیں ہے تو پھر کس کے لیے ہے؟ اللہ ایسے بعنوات و خرافات سے محفوظ رکھے جن میں احسان کا انکار اقدار کا انحطاط، ضمیر کی دشمنی، انسانیت کی عداوت، اللہ کا غضب، اولیائے خدا کا بغض، صراطِ مستقیم سے اعراض اور گمراہیوں کا راز پوشیدہ ہو!

مومن

مومن

لغت کے اعتبار سے لفظ ایمان کے معنی تصدیق کرنیکے ہیں جس کی بنا پر اس کا استعمال مسلم و کافر دونوں کیلئے ہو سکتا تھا، لیکن اصطلاحی اعتبار سے لفظ ایمان میں ایک مذہبی رنگ پیدا ہو گیا ہے جس کی بنا پر اب وہ کافر کی ضد بن گیا ہے۔

اس اصطلاح کا خلاصہ یہ ہے کہ ایمان دل سے تصدیق اور زبان سے معارف الٰہیہ کے اقرار کا نام ہے بشرطیکہ انسان ان تمام امور کا بھی پابند ہو جو اس تصدیق و اقرار کے لازمی نتائج ہیں۔

قلبی اعتقاد ایک ایسی شے ہے جس کا علم انسان کو نہیں ہو سکتا اسکی واقفیت صرف ذات علام الغیوب کیلئے ہے جو دلوں کی گہرائیوں سے واقف اور ضمیر کے اسرار سے باخبر ہے۔ انسان کا فریضہ یہ ہے کہ ہر شخص کے ظاہری حالات کی بنا پر اس کے ایمان و کفر کا فیصلہ کرے۔ اگر کوئی شخص اپنے کو مسلمان کہتا ہے تو کسی مسلمان کو یہ حق نہیں کہ اسکے اسلام سے انکار کرے۔ اسلیے کہ قرآن نے اسکی صریح مذمت و ممانعت فرمائی ہے۔

ولا تقولوا لمن القیٰ الیکم السلام لست مومنا (کسی مدعی اسلام کو غیر مومن مت کہو)

اللہ اکبر! جب عام مدعیان اسلام کے لیے قرآن کا یہ اہتمام ہے تو اس شخص کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے جس نے ایمان و اسلام کی بنیادیں مضبوط کر کے آخر وقت تک ان کی حفاظت کی ہے۔

عام طور سے اسلام و ایمان کو معلوم کرنے کے دو طریقے ہیں:

۱: خود انسان کے اقوال پر اعتماد کر کے اسے مسلمان کہا جائے بلکہ مستحق جنت بھی قرار

دیا جائے اگر اس کے قول و فعل کی ہم آہنگی کا علم ہو جائے۔

۲: رسول کریمؐ یا آئمہ معصومینؑ جو شیعہ نقطہ نظر کی عصمت کے مالک ہیں اس کے دل کی گہرائیوں کی شہادت دیں اس لیے کہ رسولؐ کا کلام مطابق وحی ہے اور وہی ترجمانِ حقیقت ہوتی ہے۔ آئمہ معصومین بھی رسول اکرمؐ ہی کے حقائق کی ترجمانی کرتے ہیں ان کے یہاں نہ جذبات کی حکومت ہوتی ہے نہ خواہشات کی پیروی!

جب ہم ان دونوں طریقوں پر نظر کرتے ہیں تو ہمیں حضرت ابوطالبؑ کا ایمان روزِ روشن کی طرح واضح نظر آتا ہے۔ ایک طرف اپنے اقوال و افعال کا تسلسل اور دوسری طرف رسول کریمؐ اور آئمہ اطہار کی طرف سے مدح و ثنا کا ایک سیلابِ عظیم جس میں عملِ خالص، جہادِ متصل، دفاعِ مسلسل، عقیدۂ راسخہ اور ایمانِ کامل کی داستانیں مچلتی نظر آتی ہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس مقام پر حضرت ابوطالبؑ کے بعض ان اقوال و اشعار کا ترجمہ بھی جو اسلام و ایمان کا صحیح اعلان کر رہے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

(۱) یا ناس لیس له شریک ۔۔۔ هو الوهاب والمبدی المعید
ومن تحت السماء له بحق ۔۔۔ ومن فوق السماء له عبید

(تمام انسانوں کا مالک لاشریک سب کا ایجاد کرنیوالا اور سب کو پلٹانے والا خدا زیرِ آسمان تمام چیزیں اسکی ملکیت اور آسمان کے تمام بسنے والے اسکے بندے)

کیا ان دونوں اشعار میں کسی کو کفر و الحاد کا شائبہ نظر آسکتا ہے جن میں ایک طرف پروردگار عالم کو ملیک الناس کہا جا رہا ہے جو قرآن کریم کے سورہ "ناس" سے ملتی ہوئی تعبیر ہے۔ وحدانیت کا اعتراف ہے۔ لامحدود عطایا کا اقرار ہے اور آخر میں اسکی ایجاد کے ساتھ ساتھ روزِ معاد کے اعادہ کا تذکرہ ہے جو اسلام کا مفصل عقیدہ ہے۔ دوسری

---

(۱) ایمان ابیطالب صفحہ ۲۔ دیوان ابیطالب صفحہ ۱۱۔ الحجة صفحہ ۸۔ شیخ الابطح صفحہ ۵۵۔

طرف دوسرے شعر میں تمام روئے زمین کی ملکیت اور تمام اہل آسمان کی بندگی کا اعلان ہو رہا ہے جو توحید کا مکمل مفہوم ہے۔

پھر فرماتے ہیں:

یا شاهد الله علی فاشهد — انی علی دین النبی احمد
من ضل فی الدین فانا المهتدی[1]

(اے خدائی شاہد گواہ رہنا کہ میں محمدؐ کے دین پر ہوں۔ اگر دنیا گمراہ ہو جائے تو ہو جائے میں ہدایت یافتہ ہوں۔")

کیا دین نبی پر ثابت قدم رہنے کا اقرار اور اسی کے ساتھ دین سے منحرف ہونے والے کے گمراہ ہونے کا اعلان اقرار اسلام سے زیادہ نہیں ہے؟ کیا کوئی شخص اعتراف اسلام کرے تو اس کی جان، اسکا مال، اسکی آبرو محفوظ نہیں ہو جاتی؟ پھر جس انسان نے اتنا صریحی اعتراف و اعلان کیا ہو اس پر اتنے شدید حملے کیوں کیے جا رہے ہیں، کیا یہ گمراہی نہیں ہے، کیا یہ حقائق سے چشم پوشی نہیں ہے۔ کیا یہ بقول حضرت ابوطالبؑ دین نبی سے انحراف کا نتیجہ نہیں ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ ان افراد نے اپنے نفس پر قیاس کر کے حضرت کو کافر و گمراہ بنانے کی کوشش کی ہے۔

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

لقد اکرم الله النبی محمداً — فاکرم خلق الله فی الناس احمد

۱: شرح النہج ج ۳ ص ۳۱۵ الحجۃ ص ۱۸ شیخ الابطح ص ۵ (مبرد نے اپنی کتاب کامل ج ۲ ص ۱۹۱ پر ان اشعار کو حضرت علیؑ کی طرف منسوب کیا ہے اسلئے کہ آپ انھیں برابر پڑھا کرتے تھے۔ حالانکہ یہ اشتباہ ہے حضرت کا بار بار پڑھنا فقط شعر کی عظمت اور معنویت کی دلیل ہے اور بس۔

وشق لہ من اسمہ لیجلہ ❊ فذو العرش محمود وھذا محمد[1]

(اللہ نے اپنے نبی کو تمام عالم سے زیادہ اشرف قرار دیا ہے۔ اپنے نام سے ان کا نام نکالا ہے وہ محمود ہے اور یہ محمدؐ۔)

یہ شعر وہ ہیں جن میں وقتِ واحد میں توحید و رسالت دونوں کے جلوے نظر آ رہے ہیں۔ نبوت کے اقرار کے بارے میں آپ کے متعدد اشعار کتاب کے مختلف صفحات پر درج کیے جا چکے ہیں جن کی ایک مختصر فہرست پھر نقل کی جا رہی ہے۔

انت الرسول رسول اللہ نعلمہ ❊ علیک نزل من ذی العزۃ الکتب

(آپ اللہ کے رسول ہیں اور آپ ہی پر کتابیں نازل ہوئی ہیں)

الم تعلموا انا وجدنا محمدا ❊ نبیا کموسیٰ خط فی اول الکتب

(کیا تمھیں خبر نہیں ہے کہ محمدؐ بھی موسیٰ کی طرح نبی ہیں اور ان کا ذکر سابق کتب میں موجود ہے)

انت ابن آمنۃ النبی محمد

(آپ آمنہ کے فرزند نبی ہیں۔)

نبی اتاہ الوحی من عند ربہ

(محمدؐ وہ نبی ہیں جن پر وحی نازل ہوتی ہے)

انت النبی محمد

(آپ محمدؐ نبی ہیں۔)

الا ان احمد قد جاءھم ❊ بحق ولم یاتھم بالکذب

(آگاہ ہو جاؤ محمدؐ کا پیغام حق ہے باطل نہیں ہے)

۱۔ شرح النہج ج ۳ ص ۳۱۵، الحجۃ ص ۷۵، معجم القبور ج ۱ ص ۱۹۷، الغدیر ج ۷ ص ۳۳۵

دیوان ابی طالب ص ۱۲، اعیان الشیعہ ج ۳۹ ص ۱۴۷ ۔

ادیوھـنـا بکتـاب منزل عجیب علی نبی کموسیٰ اوکـذی النون

(محمدؐ کی کتاب بڑی عجیب ہے وہ اسی طرح نبی ہیں جسطرح موسیٰ یا ذی النون تھے)

لقد علموات ابننا لا مکذب لـدینا ولا نعیاء بقول الاباطل

(دُنیا جانتی ہے کہ ہمارا فرزند صادق ہے، ہم باطل کی پرواہی نہیں کرتے)

قابلِ مضحکہ لیکن بدبختی کا واضح ثبوت یہ ہے کہ علامہ قرانی نے اس کلام پہ تبصرہ کیا ہے کہ زبان سے اقرار اور دل سے اعتقاد تو ہے لیکن ابوطالبؑ مومن نہ تھے[1]

خدا جانے اس عز متمند انسان کی نظر میں ایمان کسے کہتے ہیں؟ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ دل کے جذبات تھے جو نوکِ قلم تک آ گئے ان کو واقعہ سے کوئی ربط نہیں ہے

یہ ایک مشت نمونہ ہے ورنہ اس کے مقابلے میں کلمات و بیانات کا ایک انبار ہے جسمیں رسالت کا اعتراف بلکہ دین کی ترویج کا مکمل سامان ہے حضرت ابوطالبؑ کا یہ اعتراف اور آپکی یہ پیروی ایک بڑے ایمانی جذبے کی غمازی کر رہی ہے۔

بھلا ایک ایسا انسان جو قبیلہ کا سردار، مکہ کا رئیس، قریش کا قائد ہو اسے کیا پڑی تھی کہ وہ ایسے یتیم کے سامنے سر نیاز خم کرتا جو کل تک اپنی ہی آغوش میں پل رہا تھا اور اپنی ہی اولاد کے حکم میں تھا جس میں خود ہی مربی کی اطاعت فرض ہوتی ہے۔

یہ صرف عقیدۂ راسخہ اور ایمانِ کامل کا جذبہ تھا جس نے ساری ریاست و سیادت کے جذبات کو دل سے نکال دیا۔ اور ابوطالبؑ کی زبان سے ان کے گود کے پالے ہوئے کو سردار کہلوا دیا اور پھر مدح و ثنا اور تعریف و توصیف کا دریا بہا دیا اگر یہ عقیدہ و ایمان نہ ہوتا تو ایسا خضوع و خشوع ایک غیر ممکن امر تھا اسے قرابت و رشتہ داری پر محمول نہیں کر سکتے۔

اور اگر ایسا تھا تو ابولہب کو کیا ہو گیا تھا؟ اس نے کیوں ساتھ نہیں دیا؟ کم از

---

(۱) السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۸۵ ۔

ازکم مخالفت تو نہ کی ہوتی ۔ یاد رکھیے یہ کچھ نہیں ہے دینی جذبات کے سامنے قرابت اور رشتہ داری کی کوئی وقعت نہیں ہے ۔ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں کہ عبداللہ بن عبداللہ بن ابی نے ابوت کے رشتہ کو قطع کر دیا اور اپنی دینی حمایت سے قتل پر آمادہ ہو گئے ابھی سن آئے ہیں کہ عدی بن حاتم نے پدری شفقت کو بالائے طاق رکھ دیا اور اپنے پارۂ جگر زید کو مارنے پر آمادہ ہو گئے، بلکہ جب وہ ہاتھ سے نکل گیا تو اسکی موت کی بددعا کرنے لگے ۔ یہ سب کیا تھا ؟ یہی نا کہ دینی جذبات دل کی گہرائیوں سے رشتہ داری کے احساسات کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک چکے تھے ۔ ظاہر ہے کہ جب عام انسان کا یہ عالم ہے تو رسول بطحا کا کیا عالم ہوگا ؟ ایک طرف اپنی قوم کی زعامت و سیادت ، اپنے دین کے احساسات و جذبات اور دوسری طرف قرابت اور رشتہ داری، پھر رشتہ دار بھی وہ جو اپنے مزعوم مذہب کو جڑ سے اکھاڑ دینے کی فکر میں ہے کیا ایسے حالات میں بھی رشتہ داری نباہی جا سکتی ہے ؟ ہرگز نہیں یہ بات کسی ایسے دل میں نہیں بیٹھ سکتی جس میں ذرہ برابر بھی شعور ہو !

کیا فقط رشتہ داری اور قرابت کی محبت تھی جو ابوطالب کو اس بات پر مجبور کر رہی تھی کہ وہ محمدؐ اور ان کے پیغام کی مدح و ثنا میں تعریفوں کا ایک پل باندھ دیں اور ساری قوم کو اپنے مزعوم دین کے خلاف ان کے دین کی طرف دعوت دیں اور وہ بھی اتنے صریح اور تیز و تند لہجے میں !

اعوذ برب البیت من کل طاعن	علینا بسوء او ملح بباطل
ومن فاجر یغتابنا بمعیبة	ومن ملحق فی الدین مالم نحاول
کذبتم وبیت اللہ نبزی محمدا	ولما نطاعن دونه ونناضل
ونسلمه حتی نصرع حوله	ونذهل عن ابنائنا والحلائل
وحتی تری ذا الردع یرکب ردعه	من الطعن فعل الانکب المتحامل
وینهض قوم فی الحدید الیکم	نهوض الروایا تحت ذات الصلاصل

وانا وبیت اللہ ان جد ما اری　　لتلتبن اسیافنا بالاماثل

بکل فتی مثل الشہاب سمیدع　　اخی ثقۃ عند الحفیظۃ باسل

وما ترک قوم لا ابا لک سیدا　　یحوط الذمار غیر نکس مواکل

وابیض یستسقی الغمام بوجہہ　　ثمال الیتامی عصمۃ للارامل

یلوذ بہ الہلاک من آل ہاشم　　فہم عندہ فی نعمۃ وفواضل

ومیزان صدق لا یخیس شعیرۃ　　ووزان صدق وزنہ غیر عائل

الم تعلموا ان ابننا لا مکذب　　لدینا ولا نعبا بقول الاباطل

لعمری: لقد کلفت وجدا باحمد　　واحببتہ حب الحبیب المواصل

وجدت بنفسی دونہ فحمیتہ　　ودافعت عنہ بالذری والکواہل

فلا زال للدنیا جمالا لاہلہا　　وشینا لمن عادی وزین المحافل

فمن مثلہ فی الناس ای مؤمل　　اذا قاسہ الحکام عند التفاضل

حلیم رشید عادل غیر طائش　　یوالی الٰہا لیس عنہ بغافل

وایدہ رب العباد بنصرہ　　واظہر دینا حقہ غیر باطل[1]

(اللہ ہر بد نظر اور باطل کوش سے نجات دے،

اللہ ہر فاسق و فاجر، غیبت شعار، بے ایمان سے بچائے،

قریش! تمھارا خیال غلط ہے کہ ہم محمدؐ کو چھوڑ دیں گے، ابھی نیزہ بازی ہوگی

مقابلے ہوں گے۔

لوگ قتل ہونگے، زن و بچہ کے خیالات ذہنوں سے محو ہونگے۔

ایسی نیزہ بازی ہوگی کہ کشتے ایک پر ایک گریں گے۔

ہماری قوم مسلح ہو کر اس طرح چلے گی جس طرح اونٹ پانی لیکر چلتے ہیں

---

[1] شرح النہج ج ۳ صفحہ ۳۱۵ ۔ دیوان ابیطالب ۱-۲ ۔ ایمان ابیطالب ۷-۸ ۔ الحجۃ ۸۱-۹۵ ۔ السیرۃ الشامیہ ۱۹۱

شیخ الابطح ۳۴ ۔ ہاشم و امیہ ۱۶۲ ۔ الغدیر ج ۷ صفحہ ۳۴۲ اعیان الشیعہ ج ۳۹ صفحہ ۱۲۹

جنگ کے وقت وہ میرا معاون ہے

خانۂ کعبہ کی قسم اگر ہم میدان میں ملے تو ہمارے دشمنوں کا خاتمہ ہی ہو جائیگا۔

ہمارے ساتھ شریعت محمدیہ لانے والے کے جوان ہیں۔

کوئی قوم اپنے سردار کو چھوڑ دے تو یہ اسکی وقت احمد مجتبیٰ کے سوا کیا ہے؟

ہمارا سردار یتیموں اور بیواؤں کا دوست ہے۔ ہم کے طفیل بارشِ رحمت ہوتی ہے

آلِ ہاشم اسکی پناہ میں رہتے ہیں اسکی لیے تو مطمئن ہیں اور محترم ہیں۔

ہمارا رئیس محمدؐ وہ میرے صداقت ہے جسمیں بال برابر فرق نہیں صداقت کو

لیے دل سے قول ہے۔

کیا تمھیں نہیں معلوم کہ یہ غلط گو یا باطل پرست نہیں ہے۔

دینِ حق کی قسم میں محمدؐ کا دل و جان سے دوست ہوں۔

میں نے اپنی جان پر کھیل کر اسکی حفاظت کی ہے اور طاقت کے ذریعے اس کو

بچایا ہے۔

یہ اہلِ دنیا کیلئے باعث جمال، محفلوں کی زینت اور دشمنوں کیلئے باعث تنگ دل

والا ہے۔

مقابلے کے وقت اس سے علاوہ اور کس سے فضیلت و برتری کی امید کیجا سکتی ہے

یہ حلیم، رشید، عادل، صحیح الفکر اور اللہ کا مسلسل محب ہے

اللہ نے اسکی نصرت و تائید کی ہے۔ اس نے اسکے دینِ حق کو غلبہ دیا ہے۔)

ناظرین ان اشعار پر ایک طائرانہ نظر ڈال لیں اس لیے کہ ایک اڑتی ہوئی نظر بھی ان اشعار کی معنویت کو آپ کے دلوں میں اتار دیگی۔ اور ان کی نرمی، شیرینی اور ملاحت آپ کے قلوب کو اپنی طرف جذب کر لے گی۔

یہ فقط شاعری نہیں ہے، دل کی وہ آواز ہے جس کے ساتھ اعضاء و جوارح کا عمل شریک کار رہا ہے، روح کی صدا ہے جس پر جہاد مسلسل نے لبیک کہی ہے۔ عقائد کا سیلاب ہے جسمیں جذبات و اعمال شریک رہے ہیں۔

قول ہے کہ ابوطالبؑ کا تذکرہ حمایت ونصرت نبی کریمؐ کے ساتھ ہونا چاہیے۔ برائیوں کے ساتھ ان کا تذکرہ نبی کریمؐ کے لیے باعث اذیت ہے اور آنحضرتؐ کو اذیت دینا کفر ہے اور کافر کی سزا قتل ہے[۱]۔

ابوطاہر کی نظر میں ابوطالبؑ سے بغض رکھنے والا کافر ہے[۲]۔

دحلان کی رائے ہے کہ اتنے دلائل وبراہین کے بعد نجات ابوطالب کا قائل ہونا ہی اپنی نجات کا باعث ہو سکتا ہے[۳]۔

سیوطی نے ایک کتاب "بغیۃ الطالب لایمان ابی طالبؑ" کے نام سے لکھی ہے جس کا عنوان ہی ان کے عقیدہ کی وضاحت کر رہا ہے۔

اس مقام پر تمام مؤلفین ومفکرین کے اقوال وافکار کا پیش کرنا مقصود نہیں ہے اس لیے کہ یہ امکان سے باہر ہے۔ مقصد صرف یہ تھا کہ بعض علماء کے اقوال سے بھی موضوع پر روشنی پڑ جاتے۔ اور بحمد اللہ یہ مقصد حل ہو گیا۔

ان تمام واضح دلائل وبراہین کے بعد حضرت ابوطالبؑ کے کفر کے قائل دو ہی قسم کے لوگ ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جماعت جس نے ضمیر فروشی اور دین فروشی کر کے معاویہ سے تجارت کیلئے روایتیں وضع کی ہوں اور اس طرح اپنے تعیش دنیوی اور عذاب آخرت کا بیک وقت انتظام کیا ہو!

دوسری وہ جماعت ہے جس نے بعد میں آکر اسی مسموم فضا میں آنکھ کھولی ہو اور اسے یہ حقیقت واضح طور پر نظر نہ آسکی ہو۔ ہم نے حقیقت کے چہرہ سے نقاب ہٹا دی ہے، باطل کا پردہ چاک کر دیا ہے لہٰذا اب کسی انسان کیلئے عند اللہ کوئی عذر باقی نہیں رہ گیا ہے۔

تعجب خیز امر یہ ہے کہ ان تمام واضح دلائل، محکم براہین اور مستحکم شواہد کے بعد ابوطالبؑ کے ایمان کا انکار کریں اور اس حدیث کے قائل ہو جائیں جسے مسلم نے نقل کیا ہے

۱، ۲، ۳: الغدیر ج ۷ ص ۳۰۲، ۳۰۴، ۳۸۴

"شرید کہتے ہیں کہ ایک دن میں رسول اکرمؐ کے ساتھ ہمسفر تھا۔ آپ نے فرمایا تمھیں امیہ بن ابی الصلت کے اشعار یاد ہیں، میں نے عرض کی جی ہاں۔ فرمایا سناؤ۔ میں نے ایک شعر سنا دیا تو فرمایا اور کچھ، پھر ایک سنا دیا۔ فرمایا اور؟ میں نے اسی طرح تقریباً سو شعر سنا دیے تو آپ نے فرمایا کہ یہ اپنے اشعار میں تو تقریباً مسلمان تھا!"[1]

دوسری روایت ہے کہ زید بن عمرو دینِ حق کی تلاش میں شام کے راستے مکہ جا رہا تھا، راستہ میں موت آگئی حضرت عائشہ رسولِ اکرمؐ کی نقل فرماتی ہیں کہ میں جنت میں گیا تو میں نے زید بن عمرو کے دو بڑے بڑے درخت دیکھے"[2]

تیسری روایت ہے کہ سعید بن زید بن عمرو بن نفیل اور عمر بن الخطاب نے رسولِ اکرمؐ سے زید کیلئے استغفار کرنیکی اجازت مانگی تو حضرتؐ نے اجازت دیتے ہوئے فرمایا کہ زید ایک مستقل امت کی طرح مبعوث ہوگا"[3]

ایک روایت میں قیس بن ساعدہ کے بارے میں بھی یہی الفاظ ملتے ہیں[4]

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تضاد کیسا؟ آخر رسول جیسے معدنِ جود و کرم انسان کو کیا ہو گیا ہے کہ غیروں پر تو یہ عنایتیں کہ کسی کو ایک امت بنائے دے رہے ہیں کسی کے لیے استغفار ہو رہا ہے اور جس شخص نے اپنی آغوش میں پرورش کی ہے اپنا خونِ پسینہ ایک کر کے پالا ہے اس پر کوئی کرم نہیں؟ اور حد یہ ہے کہ اس کے تمام احسانات کا بھی کوئی بدلہ نہیں ہے جبکہ قرآن نے ھل جزاء الاحسان الا الاحسان کی تعلیم دی ہے۔ استغفر اللہ!

ان تمام بیانات کے بعد اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ حضرت ابوطالبؑ کو غیر مسلم کہنا رسولِ اکرمؐ کو اذیت دینا ہے اور آپ کو اذیت دینا ایک گناہ کبیرہ اور معصیت عظیمہ

۱: صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۱ ۲: السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۹۶ ۳: علی ہامش السیرۃ ج ۱ ص ۱۳۶

۴: السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۷۳ - ۷۶ - ۹۵ - بحار ج ۶ ص ۵ ۵: السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۴۳ - ۷۶

مروج الذہب ج ۱ ص ۶۹ - ۷۰

ہے جیسا کہ قرآن کریم اعلان کر رہا ہے :

ا : والذین یوذون رسول اللہ لھم عذاب الیم ہ

(رسول کو اذیت دینے والوں کے لیے عذاب الیم ہے ۔)

ب : وما کان لکم ان توذوا رسول اللہ

(تمھیں رسولؐ کو اذیت دینے کا حق نہیں ہے)

ج : ان الذین یوذون اللہ و رسولہ لعنھم اللہ فی الدنیا والاخرۃ واعد لھم عذابا مھینا ہ

(خدا اور رسول کو اذیت دینے والوں کے لیے لعنت اور رسوا کن عذاب ہے)

یہی وجہ تھی کہ تلمسانی نے آپ کے کفر کے قائلین کو واجب القتل قرار دیا تھا اس لیے کہ یہ قول نبی کریمؐ کے لیے باعث اذیت ہے اور آپ کو اذیت دینے والا کافر اور مستحق قتل ہے

بھلا اس سے زیادہ اور کیا اذیت ہو سکتی ہے کہ آپؐ کے چچا ناصر، کفیل، مربی اور ایک مومن کامل و مجاہد مخلص کو کافر کہہ دیا جائے ؟ اگر یہ صحیح ہے کہ سبیعہ بنت ابی لہب نے حضرت سے شکایت کی کہ لوگ مجھے ۔ حمالۃ الحطب ؓ کی بیٹی کہتے ہیں تو آپ بگڑ کر مجمع میں آ گئے اور فرمانے لگے کہ آخر لوگ میرے قرابتداروں کے معاملے میں مجھے کیوں اذیت دیتے ہیں ۔ میری اذیت اللہ کی اذیت ہے [۱] حالانکہ کفر و اسلام کے درمیان کوئی قرابت باقی نہیں رہتی ۔ اگر یہ صحیح ہے کہ حضرت نے مُردوں کو بُرا بھلا کہنے سے منع کیا ہے صرف اس لیے کہ اس سے زندوں کو اذیت ہوتی ہے اور اسی بنا پر نبی کریمؐ کو اذیت دینے والے کو مستحق قتل قرار دیا گیا، اگر توبہ نہ کرے بلکہ مالکین کی رائے کی بنا پر تو اگرچہ توبہ بھی کر لے [۲]

اگر یہ سب صحیح ہے تو کیا ابوطالبؑ کو کافر کہنا آنحضرتؐ کے لیے باعث اذیت نہیں ہے ؟ کیا اس کے بعد انسان قتل، عذاب اور لعنت کا مستحق نہیں بن جاتا ؟ ۔

۱۔ السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۲۰ ، ۲، ۳، ۴ : ایضاً ۲

یہی وجہ ہے کہ جب رسولِ اکرمؐ کے والدین کے بارے میں، اسلام وکفر کی نزاع شروع ہوئی تو علامہ سیوطی نے ان الفاظ میں فیصلہ دیا:

"والدین کا مسئلہ اگرچہ اجماعی نہیں ہے بلکہ اختلافی ہے لیکن میری رائے یہ ہے کہ انھیں نجات یافتہ کہا جائے۔ اس لیے کہ اس کے خلاف کہنا نبی اکرمؐ کو تکلیف دینا ہے۔ دنیا کا دستور ہے کہ اگر کسی کے باپ کی تنقیص و توہین کی جائے تو اولاد کو اذیت ہوتی ہے۔[1]"

مجھے اس مقام پر یہ کہنا ہے کہ اولاً تو رسولِ اکرمؐ کے والدین کے بارے میں کفر کا قول مسلمانوں میں ایک اشتباہ کی بنا پر پیدا ہو گیا ہے۔ ان افترا پردازیوں کا مقصد تمامتر یہ تھا کہ ابوطالبؑ کو کافر کہہ کر حضرت علیؑ کی توہین کریں۔ اتفاق کی بات کہ یہ سلسلہ حضرت عبداللہ، آمنہ بلکہ حضرت مطلب تک پہنچ گیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس مسئلے کو اختلافی کہنا کسی طرح درست نہیں ہے اس لیے کہ آبائے نبی کے ایمان کی شہادت قرآن کریم کی آیتیں اور خود حضرت کی حدیثیں دے رہی ہیں اور ایسی حالت میں مخالفین کے قول کو اہمیت دے کر مسئلے کو اختلافی بنا دینا کسی طرح جائز نہیں ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ سیوطی نے آبائے رسول کے ذکرِ بد کو صرف اس لیے منع کیا ہے کہ اس سے رسول اکرمؐ کو اذیت ہوگی۔ لیکن میرا یہ عقیدہ یہ ہے کہ اس اذیت کا منشا صرف قرابت داری اور رشتہ داری نہیں ہے بلکہ سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اس طرح حق پر ایک حملہ اور ایمان پر ایک شدید وار ہو جاتا ہے جو کسی بھی انسان کیلئے برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

بہرحال اگر ماں باپ کو کافر کہہ دینا آنحضرتؐ کے لیے باعث اذیت ہو گا تو کیا یہ بات باعث تکلیف نہ ہوگی کہ رسول کی تربیت ایک کافر کے حوالے کر دی جائے۔

۱۔ السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۶۷

جبکہ رسول کی مسلسل دعا یہ تھی کہ خداوندا کسی فاسق و فاجر کا احسان نہ ہونے پائے اس کا مطلب تو ہو گا کہ دعائے رسول مستجاب نہ ہو سکی۔

اگر یہ صحیح ہے کہ باپ کو مشرک کہہ دینا بیٹے کی توہین کا باعث ہوتا ہے تو اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہو گا کہ ابوطالبؑ کے کفر و شرک کی داستان بھی اسی لیے وضع کی گئی ہے کہ حضرت علیؑ کے اس امتیاز کو مٹا دیا جائے کہ آپ کے آباؤ اجداد میں کسی نے بتوں کے سامنے پیشانی نہیں جھکائی۔ بلکہ ہمیشہ سے ایمان و عقیدہ کی آغوش میں پرورش پاتے رہے۔

اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ بعض راویوں نے بعض اصحاب کرام کے آباؤ اجداد کے اسلام کی روایتیں بھی وضع کر لی ہیں تاکہ حضرت علیؑ کی اس انفرادی صفت کا دو طرح سے مقابلہ کیا جا سکے۔ ایک طرف آپ کی صفت کا انکار کیا جائے اور دوسری طرف اس صفت میں آپ کا شریک بنا دیا جائے۔

حالانکہ ان راویوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ اگر یہ تمام آباؤ اجداد مسلمان ثابت بھی ہو جائیں تو ان کا اسلام کفر کے بعد کی منزل میں ہو گا۔ جبکہ حضرت ابوطالب نے کفر کا منہ ہی نہ دیکھا۔ یہ عقیدہ تزلزل و تذبذب سے دوچار ہی نہیں ہوا۔

بعینہٖ یہی فریب اس بحث میں دیا جاتا ہے جس میں حضرت علیؑ کے سابق الاسلام ہونے کی گفتگو اٹھائی جاتی ہے اور اس سے یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہ بچوں میں سب سے پہلے اسلام لائے تھے۔ حالانکہ ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ بحث سرے سے غلط ہے۔ دیگر مسلمانوں کے متعلق یہ بحث ہو سکتی ہے اس لیے کہ وہ پہلے کافر تھے لیکن حضرت علیؑ کے باب میں یہ بحث بے معنی ہے

اگر یہ صحیح ہے کہ باپ کی تنقیص سے بیٹے کی توہین ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابوطالب کی توہین صرف حضرت علیؑ کی توہین نہیں ہے بلکہ رسول اکرمؐ کی بھی توہین ہے اس لیے کہ یہ دونوں بنص آیہ مباہلہ متحد ہیں۔ ان دونوں کو علاوہ نبوت کے تمام خصوصیات و صفات میں مشترک ہونا چاہیے۔ لہٰذا رسول کیلئے

ابوطالب عبداللہ ہیں اور فاطمہ آمنہ، چاہے دونوں مومن ہوں یا کافر اس لیے کہ علیؑ نفسِ محمدؐ ہیں۔

اگر رسول اکرمؐ کو یہ بات تکلیف دیتی ہے کہ ابولہب کی بیٹی بنت حمالۃ الحطب کہا جائے حالانکہ اس کا باپ ابولہب اور اسکی ماں "حمالۃ الحطب" ہے تو کیا آنحضرتؐ کیلئے یہ بات تکلیف دہ نہ ہوگی کہ آپ کے مومن کامل اور مجاہد مخلص چچا کو کافر کہہ دیا جائے؟ حقیقت امر یہ ہے کہ اس ظلم و تعدی اور جسارت دبہت ان سے جس قدر بھی متاثر نہ ہوا جائے کم ہے۔ ابوطالب جیسا قریب انسان اس کی توہین کی جائے اور رسول کریمؐ کو اذیت نہ ہو۔ کون ابوطالبؑ؟ اپنا چچا، چلا بنے والا چچا اور پالنے والا چچا۔ کون ابوطالبؑ؟ اپنا جاں نثار۔ مجاہد، مومن اور بزرگ مخلص۔ اس کے علاوہ خود حضرت علیؑ کو اذیت دینا ہی آنحضرتؐ کی اذیت کے لیے کافی ہے۔ جبکہ دونوں کا نفس ایک اور دونوں کی روح ایک ہے۔ اگر شفاعت کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اتنی بڑی بڑی تعداد بھی اس میں داخل ہو سکتی ہے جس کا ذکر سابق کی روایات میں ہوا ہے تو کیا اس میں اتنی وسعت اور نہیں ہے کہ اس میں ابوطالبؑ بھی داخل ہو جائیں!؟

اگر رسولؐ سے زیادہ کوئی صلہ رحم کرنیوالا نہیں ہے جیسا کہ معاویہ کے خطیب انہیں نے قسم شرعی کے ساتھ بیان کیا تھا تو کیا صلۂ رحم کے خلاف نہیں ہے کہ تمام دنیا کی شفاعت کرلیں۔ اور اپنے حقیقی چچا اور اپنے نفس کے حقیقی باپ کی شفاعت نہ کرسکیں۔؟

سچ تو یہ ہے کہ ابوطالبؑ کو اس شفاعت کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ شفاعت پر اس کی نجات موقوف ہوتی ہے جس کے اعمال استحقاقِ جنت کے لیے کافی نہ ہوں جس کے ذاتی اعمال پر دین کی بنیاد، عقیدہ کا استحکام اور اسلام کی ترویج کا دارومدار ہوا سے شفاعت کی کیا ضرورت ہے؟ وہ تو اپنے ذاتی اعمال ہی سے عدالتِ الٰہیہ کے تقاضوں کے مطابق جنت کا مستحق بن سکتا ہے۔

اس کے بعد سوال یہ ہے کہ اگر ابوطالب ہی جنت میں نہ جائیں گے تو وہ خلق کس لیے ہوئی ہے؟ اگر جنت انھیں کو بطور جزا نہ ملے گی تو کسے ملے گی؟ اگر ابوطالبؑ جہنم میں چلے گئے تو پھر بچے گا کون؟ انبیاء و مرسلین یا شہداء و صدیقین؟۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ پھر کوئی نہ بچ سکے گا۔ اس لیے کہ ابوطالبؑ جہنم میں اسی وقت جائیں گے جب تمام اخلاقی اقدار ختم ہو جائیں، جب عدالتِ الٰہیہ کا سلسلہ منقطع ہو جائے۔ جب احکامِ الٰہیہ کی بنیادیں ظلم و جور پر قائم ہو جائیں۔ اور جب جزا اور عمل میں کوئی ارتباط باقی نہ رہے۔

والذین یوذون المومنات بغیر ما اکتسبوا فقد احتملوا بہتاناً واثماً مبیناً۔

(جو لوگ کہ اہلِ ایمان کو بہتان رکھ کر اذیت دیتے ہیں وہ کھلے ہوئے گناہ کے متحمل ہوتے ہیں)

ختم شد

(نامی پریس لاہور)

ابوطالب مومن قریش

(دوسرا ایڈیشن)

تحریر:

علامہ عبداللہ الخنیزی

ترجمہ:

علامہ سید ذیشان حیدر جوادی کلاروی

ناشر

مکتبۂ تعمیر ادب پیسہ اخبار لاہور